

قصائے پاک و ہند

تیرھویں صدی ہجری

جلد سوہ

محمد اسحاق بھٹّی

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

**پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ**



فقہائے پاک و ہند

تیرھویں صدی ہجری

جلد سوم



محمد اسحاق مٹھی



ادارۃ تصانیف اسلامیہ

۲۔ کلبہ روبرو، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

129571

۱۹۸۹ء

طبع اول :

۱۱۰۰

تعداد :

ناشر : سراج مینیر
ناظم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

مطبع : کمپائن پرنٹرز ، لاہور

۱۰۰/- روپے

قیمت :

فہرست مضامین

مقدمہ

۱۹

۲۳

۲۴

۲۵

۲۵

۲۹

۳۰

۳۱

۳۳

۳۵

۳۵

۳۸

سر سید احمد خان

تصنیفی خدمات

اشاعتِ تعلیم کے لیے ننگ و تاز

قومی غیرت و حمیت کی انتہا

آئینی اصلاحات کا سلسلہ

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

دارالعلوم دیوبند کا قیام

دارالعلوم کا دستور العمل

مظاہر علوم - سہارن پور

دارالعلوم تدوۃ العلماء لکھنؤ

چند الفاظ اس کتاب کے بارے میں

ع

۲۱

۲۲

۲۴

۲۴

۲۴

۲۶

۲۸

۱ - مولانا غلام امام حیدر آبادی

۲ - مولانا غلام حسین ایٹھوی

۳ - مولانا غلام حسین صدیقی قنوجی

۴ - مفتی غلام حضرت اعظمی لکھنوی

۵ - مولانا غلام رسول - قلعہ میہاں سنگھ

ولادت

عالم طفولیت

۴۹	تعلیم و تربیت
۵۲	قلعہ میرہاں سنگھ میں سکونت
۵۲	اخوند صاحب سوات سے ملاقات
۵۵	سید امیر صاحب کی خدمت میں
۵۶	خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات
۵۸	ایک مجذوب سے ملاقات
۵۹	دوبارہ عزم کوٹھا
۶۰	مولانا عبدالقدیر غزنوی سے ملاقات
۶۰	کوٹھا سے روانگی اور ایک مجذوب سے ملاقات
۶۲	لاہور میں قیام اور سلسلہ وعظ و ارشاد
۶۳	طلب حدیث کے لیے عزم دہلی
۶۴	۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی
۶۴	ایک انگریز عورت کی امداد
۶۶	وطن کو روانگی اور وارنٹ گرفتاری
۶۸	گرفتاری
۷۰	اللہ کی ضمانت پر رہائی
۷۰	دوبارہ نظر بندی اور وعظ کی بندش
۷۱	حج بیت اللہ اور سند علم حدیث
۷۲	سلسلہ تدریس اور چند شاگرد
۷۴	نقطہ نظر کی اصابت
۷۵	مکتوبات
۷۶	قبولیت دعا اور تقرب الہی
۸۷	کرامات کے ظہور کی وجہ

۸۸	ایک اور واقعہ
۸۹	صحابہ کرام کی خوشبو
۹۰	سخاوت اور مہمان نوازی
۹۲	اولاد کی تربیت
۹۳	چند خصوصیات
۹۵	فقہی مسلک
۹۵	وصیت
۹۸	تصنیفات
۹۹	شعر و شاعری
۱۰۳	وفات
۱۰۵	اولاد و احفاد
۱۰۵	۴ - خلیفہ غلام رسول لاہوری
۱۰۶	۷ - مفتی غلام سبحان بہاری
۱۰۷	۸ - قاضی غلام علی ہاشمی سورتی
۱۰۸	۹ - شیخ غلام علی مجددی دہلوی
۱۱۷	۱۰ - مفتی غلام غوث گوپاموی
۱۱۸	۱۱ - مولانا غلام فرید لاہوری
۱۱۹	۱۲ - مولانا غلام قادر گوپاموی
۱۲۰	۱۳ - خلیفہ غلام اللہ لاہوری
۱۲۱	۱۴ - مفتی غلام محمد لاہوری
۱۲۳	۱۵ - حافظ غلام محمد قادری لاہوری
۱۲۵	۱۶ - حافظ غلام محی الدین بیگومی
۱۲۹	۱۷ - مفتی غلام مصطفیٰ بردوانی

۱۲۹ - مولانا غلام ناصر رام پوری

۱۳۰ - قاضی غلام یحییٰ بہاری

۱۳۱ چند دیگر فقہائے کرام

ف

۱۳۳ - مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی

۱۳۴ - مولانا قیاض علی عظیم آبادی

۱۳۸ چند دیگر فقہائے کرام

ق

۱۴۰ - مولانا قطب الدین دہلوی

۱۴۲ - سید قطب المدنی بریلوی

۱۴۳ - مفتی قوام الدین کشمیری

ک

۱۴۵ - مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری

۱۴۸ - مولانا کرامت علی اسرائیلی دہلوی

۱۴۹ - مولانا کرم الہی لاہوری

۱۵۱ - مولانا کرم اللہ دہلوی

۱۵۲ - مولانا کریم اللہ فاروقی

ل

۱۵۳ - مولانا لطف علی راجگیری

۱۵۴ - مولانا لطف اللہ لکھنوی

م

۱۵۶ - سید مجاہد الدین حسیننی بالاپوری

۱۵۷ - مولانا محبوب علی سنہیلی

۱۵۹	۲۴ - شیخ محسن ترمذی
۱۶۰	۲۵ - قاضی محمد مغربی
۱۶۱	۳۶ - سید محمد سورتی
۱۶۲	۳۷ - مولانا محمد حیدر آبادی
۱۶۳	۳۸ - مولانا محمد تھانوی
۱۶۴	۳۹ - مولانا محمد شاہ جہان پوری
۱۶۵	۴۰ - سید محمد لکھنوی
۱۶۸	۴۱ - مفتی محمد بردوانی
۱۶۹	۴۲ - مولانا سید محمد غزنوی
۱۷۱	۴۳ - قاضی محمد خاں رام پوری
۱۷۲	۴۴ - مرزا محمد کشمیری
۱۷۴	۴۵ - مولانا محمد کشمیری
۱۷۵	۴۶ - مولانا محمد رفیق کشمیری
۱۷۶	۴۷ - سید محمد پھلواری
۱۷۷	۴۸ - مفتی محمدی عظیم آبادی
۱۷۸	۴۹ - مولانا محمد آفاق دہلوی
۱۷۹	۵۰ - شاہ محمد اسحاق دہلوی
۱۸۷	۵۱ - مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی
۱۸۸	تعلیم و تربیت
۱۸۹	سید احمد شہید کی بیعت
۱۹۲	سفر حج
۱۹۳	دعوتِ جہاد
۱۹۴	ہجرت

۱۹۵	جمادنی بسیل اللہ
۱۹۶	سیرت و کردار
۱۹۶	تصانیف
۲۰۰	مکتوبات
۲۰۱	شعر و شاعری
۲۰۱	شہادت
۲۰۲	بیٹا — شاہ محمد عمر
۲۰۵	۵۲ - مفتی محمد اصغر انصاری فرنگی محلی
۲۰۶	۵۳ - مفتی محمد افضل پھلواری
۲۰۶	۵۴ - مولانا محمد اکبر کشمیری
۲۰۷	۵۵ - مولانا محمد اکرم شاہ جہان پوری
۲۰۸	۵۶ - مفتی محمد برکت عظیم آبادی
۲۰۸	۵۷ - سید محمد تقی لکھنوی
۲۱۰	۵۸ - قاضی محمد جمیل برہان پوری
۲۱۱	۵۹ - سید محمد حسین حیدر آبادی
۲۱۲	۶۰ - شیخ محمد حسین انصاری سندھی
۲۱۳	۶۱ - مولانا محمد سالم دہلوی
۲۱۴	۶۲ - مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی
۲۱۵	۶۳ - مولانا محمد سلیم جون پوری
۲۱۷	۶۴ - سید محمد سیادت امرہ ہوی
۲۱۸	۶۵ - محمد شاکر سورتی
۲۱۸	۶۶ - مولانا محمد شکور ہاشمی ٹھیلی شہری
۲۲۰	۶۷ - سید محمد ظاہر حسنی بریلوی

- ۲۲۲ - علامہ محمد عابد سندھی
- ۲۲۷ - سید محمد عسکری امر وہوی
- ۲۲۸ - حافظ محمد عظیم پشاوروی
- ۲۲۹ - مولانا محمد علی بھیروی
- ۲۳۰ - مولانا محمد علی صدر پوری
- ۲۳۲ - مفتی محمد عوض بریلوی
- ۲۳۳ - مولانا محمد غفران رام پوری
- ۲۳۴ - مولانا محمد غوث مدراسی
- ۲۳۷ - مولانا محمد قاسم ناتوئی
- ۲۳۸ - ولادت اور ابتدائی حالات
- ۲۳۸ - حصول علم کا دور
- ۲۳۹ - مطبع احمدی سے تعلق ملازمت
- ۲۴۰ - دہلی میں سلسلہ تدریس
- ۲۴۰ - صحیح بخاری کا تحشیہ
- ۲۴۱ - ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی
- ۲۴۴ - روپوشی اور حج بیت اللہ
- ۲۴۵ - اعلان معافی
- ۲۴۶ - حج سے واپسی
- ۲۴۷ - حفظ قرآن مجید
- ۲۴۷ - مطبع مجتہبی میرٹھ کی ملازمت
- ۲۴۷ - دوسری مرتبہ حج کو روانگی
- ۲۴۸ - مطبع ہاشمی میرٹھ سے وابستگی
- ۲۴۸ - علی گڑھ میں قیام

- ۲۴۸ پھر مطبع مجتہائی میں
- ۲۴۹ حائل شریف کی اشاعت
- ۲۵۰ مطبع مصطفائی میں
- ۲۵۱ ماہانہ آمدنی
- ۲۵۲ دارالعلوم دیوبند کا قیام
- ۲۵۳ نئی جگہ کی خرید اور سنگ بنیاد
- ۲۵۳ تیسرا حج
- ۲۵۴ پادری تارا چند سے مناظرہ
- ۲۵۵ شاہ جہان پور کا میلہ خدا شناسی
- ۲۵۶ روواد رڑ کی
- ۲۵۶ میرٹھ کا واقعہ
- ۲۵۸ مہمان کے لیے حقہ کا انتظام
- ۲۵۹ انداز تبلیغ کی ایک اچھوتی مثال
- ۲۶۱ میلاد کا واقعہ
- ۲۶۳ بدعتی کی مہمان نوازی
- ۲۶۴ تصنیفات
- ۲۶۹ تلامذہ
- ۲۶۹ انتقال
- ۲۷۰ - - مفتی محمد قلی کنتوری
- ۲۷۱ - - مولانا محمد بسبب عثمانی
- ۲۷۲ - - سید محمد لطیف مچھلی شہری
- ۲۷۳ - - مولانا محمد بسبب فرنگی محلی
- ۲۷۵ - - مولانا محمد مرشد سرہندی

- ۲۷۶ - مولانا محمدستان کاکوروی
- ۲۷۶ - قاضی محمد معروف مدراسی
- ۲۷۷ - مولانا محمد معین انصاری لکھنوی
- ۲۷۹ - مولانا محمد نعیم کشمیری
- ۲۸۰ - محمد وجیہ کلکتوی
- ۲۸۱ - مولانا محمد یعقوب دہلوی
- ۲۸۲ - مفتی محمد یوسف فرنگی محلی
- ۲۸۴ - مولانا محمود سورتی
- ۲۸۵ - مولانا محمود جون پوری
- ۲۸۶ - مولانا محمود بخش صدیقی کاندھلوی
- ۲۸۷ - مولانا محی الدین عثمانی بدایونی
- ۲۸۸ - سید محی الدین دیلوری
- ۲۸۹ - شاہ مخصوص اللہ دہلوی
- ۲۹۰ - مولانا مراد اللہ لکھنوی
- ۲۹۱ - سید مرتضیٰ حسینی لکھنوی
- ۲۹۲ - سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی
- ۳۱۰ - قاضی مصطفیٰ فاروقی گوپالوی
- ۳۱۲ - مولانا مصطفیٰ رفیقی کشمیری
- ۳۱۳ - مولانا مظفر حسین کاندھلوی
- ۳۱۵ - مولانا منظر علی عظیم آبادی
- ۳۱۵ - سید معز الدین کرطوی
- ۳۱۶ - مولانا معشوق علی جون پوری
- ۳۱۸ - مولانا معین الدین انصاری سسوانی

- ۳۲۲ - ۱۰۵ - مولانا مملوک علی صدیقی نانوتوی
- ۳۲۲ نانوتہ میں آمد اور سکونت
- ۳۲۵ تعلیم
- ۳۲۵ سلسلہ درس و تدریس
- ۳۲۷ دہلی کالج میں تقرر
- ۳۲۸ تنخواہ میں اضافہ
- ۳۲۹ دہلی کالج میں مولانا کی تدریسی مساعی کے نتائج
- ۳۳۱ چند تلامذہ کرام
- ۳۳۲ حج بیت اللہ
- ۳۳۲ عوام اور حکومت کے نزدیک قدر و منزلت
- ۳۳۳ سیاسیات سے بے تعلقی
- ۳۳۵ اخلاق و کردار
- ۳۳۶ تراجم
- ۳۳۷ وفات
- ۳۳۸ مولانا محمد یعقوب نانوتوی
- ۳۳۹ تذکرہ نگاروں کا اظہار عقیدت
- ۳۴۳ - ۱۰۴ - ملامدی مازندران
- ۳۴۴ - ۱۰۷ - سید ممدی لکھنوی
- ن
- ۳۴۵ - ۱۰۸ - سید ناصر حسین جون پوری
- ۳۴۶ - ۱۰۹ - سید نثار علی ظفر آبادی
- ۳۴۷ - ۱۱۰ - قاضی نجم الدین علی خاں ثاقب کاکوروی
- ۳۴۸ نام و نسب

۳۴۹	ولادت اور تعلیم
۳۵۰	علم و فضل
۳۵۱	منصب قاضی القضاة
۳۵۳	گورنر جنرل کا تعزیتی خط
۳۵۴	تصانیف
۳۵۶	شاعری
۳۵۶	وفات
۳۵۷	اولاد
۳۵۸	ممتاز العلماء قاضی محمد سعید الدین خان بہادر
۳۵۸	مفتی حکیم الدین خان
۳۵۹	قاضی علیم الدین خان
۳۵۹	مفتی جلیل الدین خان بہادر سفیر شاہ اودھ
۳۶۱	۱۱۱ - مولانا نصر اللہ مارہروی
۳۶۲	۱۱۲ - مولانا نصر اللہ خوجوی
۳۶۳	۱۱۳ - سید نصیر الدین حسینی برہان پوری
۳۶۵	۱۱۴ - سید نصیر الدین دہلوی
۳۶۵	ابتدائی تحصیل علم سے بے اعتنائی
۳۶۶	حصول علم کا شوق
۳۶۶	مجاہدین کی تنظیم
۳۶۷	اختلاف سے نفرت
۳۶۷	امیر دوست محمد خان سے تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ
۳۶۹	قصد ہجرت
۳۶۹	والدہ سے اجازت

- ۳۷۰ لمبا سفر اور نہایت مختصر سامان
- ۳۷۰ تاریخ روانگی
- ۳۷۱ پیر کوٹ میں قیام
- ۳۷۲ حُرّوں کی تحریک
- ۳۷۳ پیر کوٹ کا کتب خانہ
- ۳۷۴ سلسلہ دعوت و تبلیغ
- ۳۷۶ مزار یوں کے علاقے میں
- ۳۸۰ بہرام خاں کی شخصیت
- ۳۸۱ سکھوں سے لڑائیاں
- ۳۸۲ سکھوں اور مزار یوں کی صلح
- ۳۸۲ نئی قیام گاہ
- ۳۸۵ قلات کے وزیر اعظم کا اصرار
- ۳۸۶ بلوچستان میں
- ۳۸۷ انگریزوں سے جہاد
- ۳۸۸ ستمناہ میں
- ۳۸۸ عبادات و اطوار
- ۳۸۹ وفات
- ۳۹۰ اہل و عیال
- ۳۹۱ - ۱۱۵ - مفتی نظام الدین سورتی
- ۳۹۲ - ۱۱۶ - مفتی نظر محمد سوسوانی
- ۳۹۳ - ۱۱۷ - مفتی نعمت اللہ لکھنوی
- ۳۹۴ - ۱۱۸ - مولانا تقی علی خاں بریلوی
- ۳۹۴ - ۱۱۹ - مفتی نور احمد سوسوانی
- ۳۹۷ - ۱۲۰ - مفتی نور اللہ لکھنوی

۳۹۸

۱۲۱ - مولانا نور محمد سوتی

9

۴۰۳

۱۲۲ - مفتی واجد علی بنارسی

۴۰۴

۱۲۳ - سید وحید الحق پھلواری

۴۰۵

۱۲۴ - مولانا ولایت علی عظیم آبادی

۴۰۶

سید احمد شہید سے پہلی ملاقات

۴۰۷

ایک عجیب و غریب واقعہ

۴۰۸

تبلیغ دین اور وعظ و ارشاد

۴۰۸

خدمات دینی کی وسعت

۴۰۹

تعلیم و تدریس

۴۱۰

وعظ کی اثر انگیزی

۴۱۰

کتب دینیہ کی اشاعت کا اہتمام

۴۱۱

حج بیت اللہ

۴۱۱

چھوٹے بھائی کا کردار

۴۱۲

سکھوں کی باہمی کش مکش

۴۱۲

سکھوں کے خلاف ہتنگامے

۴۱۲

مولانا ولایت علی کو دعوت

۴۱۵

بالاکوٹ پر قبضہ

۴۱۶

مسلمانوں کا نظم و نسق

۴۱۷

مرکز کے تعلقات

۴۱۸

مولانا ولایت علی کی آمد

۴۲۱

کامیابی کے بعد ناکامی

۴۲۱

صورت حال پر ایک نظر

۲۲۲	پہیلیگی
۲۲۳	درہ دُپ کی جنگ
۲۲۵	مولانا ولایت علی اور عنایت علی کے محلکے
۲۲۶	آزادی کے بعد مستقل ہجرت
۲۲۶	دہلی میں قیام اور بادشاہ سے ملاقات
۲۲۷	ستھانہ کوروانگی
۲۲۸	تصنیف و تالیف
۲۲۹	وفات
۲۳۰	کشف قبور کے ایک ماہر کا بیان
۲۳۰	۱۲۵ - مفتی ولی اللہ فرخ آبادی
۲۳۲	۱۲۶ - مولانا ولی اللہ فرنگی محلی
۲۳۳	۱۲۷ - مولانا ولی اللہ سورتی
۲۳۵	۱۲۸ - حافظ ولی اللہ لاہوری
	ی
۲۳۶	۱۲۹ - مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی
۲۳۵	۱۳۰ - مفتی یعقوب علی سندیلوی
۲۳۶	۱۳۱ - مولانا یعقوب دسنوی
۲۳۷	۱۳۲ - قاضی یوسف شاہ جہان پوری
۲۳۷	۱۳۳ - سید یوسف بیجاپوری
۲۳۹	مراجع و مصادر

مقدمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اپنے لائق احترام قارئین کی خدمت میں ”فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری“ کی تیسری جلد پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو اس سلسلے کی درحقیقت دسویں جلد ہے۔

”فقہائے ہند“ کی تصنیف کا کام آج سے چودہ برس پہلے ۱۹۷۳ء میں شروع کیا گیا تھا اور اب تک اس کی مندرجہ ذیل جلدیں معرض اشاعت میں آچکی ہیں۔

۱۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی جو فہرست مضامین سمیت ۳۲۸ صفحات پر مشتمل اور برصغیر پاک و ہند کے ۲۹۲۷ علماء و فقہاء کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس جلد میں پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے فقہائے نام دار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۲۔ دوسری جلد ۱۹۷۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ نویں صدی ہجری کے ۱۰۵ فقہاء اور ممتاز ابواب علم و عرفان کے سوانح و کوائف پر محیط ہے اور مع فہرست مضامین کے اس کے کل صفحات ۲۸۰ ہیں۔

۳۔ تیسری جلد میں دسویں صدی ہجری کے ۲۵۲ فقہائے عالی قدر کا تذکرہ ضبط کتابت میں لایا گیا ہے۔ یہ جلد ۱۷۶ صفحات کو گھیرے ہوئے ہے ۱۹۷۶ء کو معرض طباعت میں آئی۔

۴۔ چوتھی جلد (حصہ اول) ۱۹۷۷ء میں طبع ہوئی۔ یہ ۲۹۲ صفحات پر محتوی ہے۔ اس میں گیارھویں صدی ہجری کے ۱۲۶ فقہائے کرام کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ چوتھی جلد (حصہ دوم) ۱۹۷۸ء میں چھپی۔ یہ بھی گیارھویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہے۔

اس جلد کے کل صفحات ۲۳۶ ہیں اور ۱۷۶ فقہائے فدی الاحرام کا تذکرہ اس میں آچکا ہے۔
 ۶۔ جلد پنجم (حصہ اول) یہ ۱۹۷۹ء میں طباعت کی منزل سے گزری۔ اس کے صفحات ۳۶۸ ہیں اور اس میں بارہویں صدی ہجری کے ۱۶۲ فقہائے ہند کی علمی و تصنیفی سرگرمیاں بیان کی گئی ہیں۔

۷۔ جلد پنجم (حصہ دوم) یہ جلد ۱۹۸۱ء میں چھپی۔ اس کے کل صفحات ۲۲۸ ہیں اور اس میں بارہویں صدی ہجری کے ۱۰۱ اصحاب علم اور ماہرین فقہ کی تلک و تازہ علمی ضبط تحریر میں لائی گئی ہے۔
 ۸۔ فقہائے پاک و ہند تیرہویں صدی ہجری (جلد اول) اس میں نام کی کچھ تبدیلی کر دی گئی ہے۔ تاہم یہ اسی سلسلے کی کڑی ہے اور تیرہویں صدی ہجری کی جلد اول ہے۔ یہ جلد ۱۹۸۲ء میں طبع ہوئی اور اس کے کل صفحات ۳۵۶ ہیں۔ اس میں ایک نٹو فقہا کا تذکرہ تو اچھی خاصی تفصیل یا کسی قدر اختصار سے کیا گیا ہے، مگر جن بزرگوں کے حالات زیادہ نہیں مل سکے اور ان کی علمی و فقہی سرگرمیوں کا ذکر تاریخ و رجال کی کتابوں سے فراہم نہیں ہو سکا، ان کا ذکر متعلقہ حروف تہجی کے ذیل میں ”بعض دیگر فقہائے کرام“ کے عنوان سے ضبط کتابت میں لایا گیا ہے، ان کی تعداد ۵۵ تک پہنچتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ جلد ۱۵۵ فقہائے رفیع المرتبت کے حالات پر محیط ہے۔
 ترتیب کے لحاظ سے سلسلہ فقہائے ہند کی یہ آٹھویں جلد ہے۔

۹۔ فقہائے پاک و ہند تیرہویں صدی ہجری (جلد دوم) باعتبار ترتیب کے یہ سلسلہ فقہائے ہند کی نویں جلد ہے جو ۱۹۸۴ء میں منزل طباعت سے گزری اور اس کے کل صفحات ۲۸۰ ہیں۔ یہ جلد فقط حرف ع پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۶ فقہا کا تذکرہ تو خاصی تفصیل سے آگیا ہے، لیکن جن حضرات کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے، صرف یہ پتا چل سکا ہے کہ ان کے اسمائے گرامی فقہائے برصغیر کی وسعت پذیر فہرست میں شامل ہیں، ان کی تعداد ۳۶ ہے۔ اس حساب سے یہ جلد ۸۲ علما و فقہا کے حالات و کوائف کو اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔

۱۰۔ فقہائے پاک و ہند تیرہویں صدی ہجری (جلد سوم) یہ جلد جو دراصل اس سلسلے کی دسویں جلد ہے اور ۲۵۰ صفحات پر محتوی ہے۔ اس میں ۱۳۳ فقہائے کرام کے واقعات، حیات تو کافی مفصل صورت میں مذکور ہیں، البتہ ان کے علاوہ آٹھ بزرگ وہ ہیں جن کے بارے

میں اصحابِ تذکرہ و رجال نے صرف یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ اپنے دور کے ممتاز فقیہ تھے، مگر ان کی فقہی سرگرمیوں کا تفصیلی علم نہیں ہو سکا۔ ان کے اسمائے گرامی اس جلد میں چند سطروں کے تعارف کے ساتھ "دیگر فقہائے کرام" کے عنوان کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ یہ ہماری مجبوری ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس طرح یہ جلد ۱۴۱ فقہائے عظام کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔

پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے اختتام تک پھیلی ہوئی یہ دس جلدیں تین ہزار چھ سو پچاس صفحات کو محیط ہیں اور ان میں برصغیر کے پندرہ سو چورانوے فقہاء و علما کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں اور ان کی علمی و فقہی اور تدریسی و تصنیفی سرگرمیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ہر جلد کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں متعلقہ صدی کے حکمرانوں اور ملوک و سلاطین کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ حکمران اپنے دور کے اہل علم اور اصحابِ فقہ سے کس درجے تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کے نزدیک ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ نیز یہ کہ خود ان بوردیانشین فقہاء اور درویش مش علما کو ان حکمرانوں کی کتاب حیات کے کن کن اوراق سے بر بنائے للہیت اختلاف یا اتفاق تھا اور اس کے اظہار کے لیے وہ کیا لب و لہجہ اختیار کرتے تھے۔ یہ مقدمات متعلقہ عہد کے بہت سے پہلوؤں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

سلسلہ فقہائے ہند کی ان دس جلدوں میں جن علمائے عظام کی تک و تازگوناگوں کو حیطہ تسوید میں لایا گیا ہے، ان میں ہر مسلکِ فقہ کے لائق تکریم حضرات شامل ہیں۔ حنفی بھی اور شافعی بھی، مالکی بھی اور حنبلی بھی، غنیعہ بھی اور اہل حدیث بھی۔ احناف کی تعداد البتہ بہت زیادہ ہے۔ جن حضرات کی جن مساعی علمی تک رسائی ہو سکی ہے، اسے بلا کم و کاست حوالہ قرطاس کر دیا گیا ہے۔

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ محمد اللہ ہم نے بزرگانِ دین اور فقیہانِ بلند مرتبت کی خدماتِ عالیہ کا تذکرہ کرتے وقت ہر بزرگ کے احترام و اکرام کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا ہے اور واضح لفظوں میں بتایا ہے کہ کون بزرگ کس مسلک سے وابستہ تھے اور میدانِ علم و عمل میں انھوں نے کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

ہمارے نزدیک تمام مسالکِ فقہ کے اہل علم ہم سب کی مشترکہ میراث اور متاعِ بے بہا ہیں۔ ان سے استفادہ کرنا اور ان کی علمی و فکری مساعی کو نمایاں کرنا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔

یہاں یہ عرض کر دیں کہ فقہائے ہند کی ان دس جلدوں کی تحریر و تصنیف میں ہمارے چودہ سال صرف ہوئے۔ ان کی تصنیف کے علاوہ اس عرصے میں ہم نے اور بھی متعدد خدمات انجام دیں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ترجمان ماہانہ ”المعارف“ کی ادارت ہمارے سپرد ہے جو ایک مستقل کام ہے۔ ”المعارف“ کے لیے خالص علمی و تحقیقی مضامین فراہم کرتا، ان کا ایک ایک لفظ پڑھنا، اپنی پالیسی کے مطابق کتابت و طباعت کے لیے ان کا انتخاب کرنا، کتابت کے بعد ان کی پروف ریڈنگ کرنا اور ان کو خاص انداز سے ترتیب دینا نہایت ذمہ دارانہ کام ہے جو انتہائی محنت اور توجہ چاہتا ہے۔ اللہ کا بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ان تمام امور کی انجام دہی کے لیے اس بندہ عاجز کو ہمت و توفیق کی نعمت عظمیٰ سے حصہ وافر عطا فرمایا۔ آئندہ کے لیے بارگاہ ایزدی سے عاجزانہ دعا ہے کہ اللہم وفقنا لما تحب و ترضی۔

اس موقع پر ہم فخر و مباہات کے طور پر نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کناں ہیں کہ بتوفیق خداوندی ہمارا ذہن ہمیشہ جاہ و مصواب پر رہا ہے اور ہم نے اپنی دانست میں انتہائی احتیاط و توازن سے قلم کو حرکت دینے کی سعی کی ہے۔ تاہم اگر کہیں سہواً نوکِ خامہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گئی ہو تو ہم انتہائی عجز سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں معافی کے لیے اپنا دامن پھیلاتے ہیں اور جن حضرات کو ہماری کسی تحریر سے ذہنی اذیت پہنچی ہو، ان سے معذرت خواہ ہیں۔

یہاں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ ان دس جلدوں میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے نزدیک حرفِ آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے بہت سے فقہاء و علما کے حالات تک ہماری رسائی نہ ہو سکی ہو یا بعض بزرگوں کے بارے میں ہمیں کم معلومات میسر آئی ہوں اور تفصیل ہماری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔

یہ جو کچھ بھی ہے معزز قارئین کے سامنے ہے۔ ہمارے علم و مطالعہ کے مطابق اس موضوع کی یہ پہلی کوشش ہے۔ جن اصحاب کا دائرہ معلومات اس باب میں زیادہ وسیع ہے، وہ اگر ہماری رہنمائی کے لیے وقت نکالیں گے اور ہماری لغزشوں سے مطلع فرمائیں گے تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔ ان کے نام اور ان کے فراہم کردہ معلومات کے حوالے سے اپنی لغزشوں کا اعتراف کریں گے اور ان سے لیے اللہ کے حضور دعا گو ہوں گے۔

129571

”فقہائے پاک و ہند تیسویں صدی ہجری“ کی جلد اول کا مقدمہ آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کے سانحہ وفات پر ختم ہوا تھا۔ دوسری جلد کے مقدمے میں ۱۸۵۷ء سے بعد کے حالات، وہابی مقدمات، کالے پانی کی سزاؤں، ۸ فروری ۱۸۵۷ء کو کالا پانی میں والٹر سے ہندلارڈ ٹیمپو کے قتل اور وہابی قیدیوں پر اس کے رد عمل وغیرہ امور کی صراحت کی گئی تھی۔ اب اس کے بعد کی چند ان تحریکوں کا ذکر کیا جائے گا جو ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص مسلمانوں کے علمی و ذہنی اور فکری ارتقاء کے لیے شروع کی گئی تھیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اختصار کے ساتھ سر سید احمد خاں اور ان کی عملی مساعی کا جائزہ لیا جائے گا۔

سر سید احمد خاں

سر سید احمد خاں کی ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے دادا جواد الملک سید ہادی تھے جو مغل حکمران شاہ عالم کے عہد میں صوبہ شاہ جہاں آباد کے محکمہ احتساب اور قضا لشکر کے منصب رفیع پر فائز تھے۔ والد کا اسم گرامی میر محمد متقی تھا۔ میر محمد متقی آزاد منشا آدمی تھے اور معاملات دنیوی سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ میں اس دور کے معروف بزرگ شاہ غلام علی مجددی دہلوی کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ ان کی خدمت و صحبت میں رہنا اور ان سے استفادہ کرنا ان کے اصل مشاغل تھے۔

سر سید احمد خاں کے نانا کا نام نامی خواجہ فرید الدین احمد تھا جنہیں مغل حکومت کی طرف سے دبیر الدولہ، امین الملک، خان بہادر اور مصلح جنگ کے خطابات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ پھر اکبر شاہ ثانی کے وزیر مقرر ہو گئے تھے۔ بہت نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ علم و فہم اور سیاست و تدبیر میں مشہور تھے۔ مشکل اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ سر سید کی زندگی کا دور آغاز نھیال کے اسلوبِ زیست سے بھی متاثر ہوا اور دھیال کے طرزِ حیات سے بھی۔

حکومت و اقتدار کے اعتبار سے برصغیر کے مسلمانوں کا یہ دور زوال تھا، لیکن علم و عرفان اور معرفت و ادراک کے لحاظ سے دلی کا ستارہ عروج پر تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کے افاق پر اشاعتِ مذہب اور تبلیغِ علومِ اسلامی کے دو عظیم الشان مرکز جلوہ گر ہیں۔ ایک شاہ عبدالعزیز

کا مدرسہ جسے مذہبی و دینی علوم کا گہوارہ کستا چاہیے، اور دوسرا مرکز شاہ غلام علی مجددی کی خانقاہ تصوف و طریقت کا۔

سر سید کے نھیال شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے دامن عقیدت سے وابستہ تھے اور ان کے والد میر محمد تقی کا شاہ غلام علی سے باقاعدہ تعلق ارادت تھا۔ اس بنا پر سر سید نے فیض کے ان دونوں سرچشموں پر حاضری دی اور ان سے خوب سیر ہوئے۔

سر سید کا نام احمد ان کے والد کے مرشد عالی قدر شاہ غلام علی نے رکھا تھا اور ان کی تقریب بسم اللہ بھی انہی کے دستِ حق پرست سے ہوئی تھی۔ شاہ صاحب ممدوح سے سر سید کو بے حد عقیدت تھی۔ اپنے والد کے ساتھ بھی وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ تنہا بھی ان کے ہاں ان کی آمد و رفت اور ان سے فیض یابی کا سلسلہ جاری تھا۔

سر سید نے قدیم طریقِ تعلیم کے مطابق حصولِ علم کیا۔ طب بھی باقاعدہ پڑھی اور ریاضی میں بھی نامور ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد "صدرِ امین" کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کے امتحان میں شامل ہوئے اور اس میں کامیاب رہے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک دہلی کے منصف کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس اثنا میں مختلف اساتذہ سے مزید تحصیلِ علم کے مواقع میسر آئے۔ انھوں نے جولائی ۱۸۴۹ء تک پینتیس سال ملازمت کی اور اس اثنا میں دہلی، بجنور، مراد آباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں اقامت گزیر رہے۔

تصنیفی خدمات

پینتیس سالہ ملازمت کے دوران اور اس کے بعد سر سید نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں قولِ متین در ابطال حرکتِ زمین، تسہیل فی جرۃ الثقیل، انتخاب الاخوان یعنی قواعد دیوانی کاغذ، اسباب بغاوت ہند، آثار الصنادید، تبیین الکلام، رسالہ طعام اہل کتاب، خطبات احمدیہ، تفسیر قرآن نیز سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کے عقائد و افکار کی تائید میں کئی کتابیں لکھیں جن میں راہ سنت در رد بدعت اور کلمۃ الحق شامل ہیں۔

سر سید کی بعض تصانیف میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا اور اس کا اظہار متعدد اہل علم نے ان کی زندگی میں بھی پورے زور الفاظ میں کیا اور بعد میں بھی اب تک ہو رہا ہے۔

اشاعتِ تعلیم کے لیے تگ و تاز

تصنیف و تالیف کے علاوہ اشاعتِ تعلیم کے سلسلے میں سر سید نے جو تگ و تاز کی اس کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے سرکاری ملازمت کے دور میں ۱۸۵۹ء کو مراد آباد میں فارسی کا مدرسہ قائم کیا۔ ۱۸۶۲ء کو غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۶۴ء کو غازی پور ہی میں ایک مدرسہ جاری کیا، جس میں انگریزی، اردو، عربی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ بعد میں یہ مدرسہ وکٹوریہ ہائی سکول کے نام سے موسوم ہوا۔ علی گڑھ میں جس مدرسے کا آغاز کیا تھا، اس کا انتظام و انصرام مولوی سمیع اللہ خاں کے ہاتھ میں تھا۔ جولائی ۱۸۷۶ء کو جب سر سید پنشن پا کر علی گڑھ آگئے تو اس کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ مدرسہ ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا ۸۔ جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کی شکل اختیار کر گیا۔

قومی غیرت و حمیت کی انتہا

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سر سید انگریزی حکومت کے حامی نہ تھے، انگریزی تعلیم کے حامی تھے اور اس کے حصول کا فتویٰ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی دیا تھا۔ علمائے کرام نے سر سید کی جو مخالفت کی ہے اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اس کا تعلق سر سید کے اس نقطہ نظر سے ہے، جس کا اظہار انھوں نے جنات، ملائکہ اور معجزات وغیرہ سے متعلق کیا ہے۔ اس سے اختلاف اس وقت بھی صحیح تھا، اب بھی صحیح ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ سر سید کا مقابلہ عیسائیوں سے تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں انتہائی بغض و عناد رکھتے اور اس کا بڑا اظہار کرتے تھے۔ ممکن ہے ان کا نقطہ نظر پانچ چھ فی صد مسائل میں تاویل کر کے پچانوے فی صد اسلام کا تحفظ کرنا ہو، اور جن اہل علم کا سابقہ علمی میدان میں غیر مسلموں سے رہا ہے، ان میں سے بعض حضرات ایسا کرتے رہے ہیں۔ بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو، سر سید نے مذہبی مسائل کی توضیح و تبیین میں جہاں جہاں ٹھوکر کھائی ہے، اس میں ان کے موقف کو قرین صحت نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

قومی معاملات و مسائل کے بارے میں سر سید نہایت غیور اور انتہائی نازک مزاج تھے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ان کے سامنے پیا ہوا تھا، مسلمانوں کی حکومت کو ختم ہوتے ہوئے انھوں نے

اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسلامیان ہند کی غیرت و حمیت کو جو شدید اجتماعی صدمہ پہنچا تھا، اس کے وہ عینی شاہد تھے۔ اس صورت حال سے وہ بدرجہ ۲ غایت متاثر و متاثر اور غم گین تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے زوردار قلم نے معنوم و محزون لہجے میں اس وقت ”اسباب بغاوت ہند“ لکھی جب پورا ملک پھانسی گھر بنا ہوا تھا اور جگہ جگہ اس کے پھندے لٹک رہے تھے اور لوگوں کی گردنوں میں پیوست ہو رہے تھے۔ جب ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک شبلی کے الفاظ میں ”کورٹ مارشل کے ہیبت شعلے بلند تھے“

سر سید انگریز کے ہاتھوں باشندگان ملک کی سبکی برداشت نہ کر سکتے تھے اور صرف اس بنا پر اگر وہ کے دربار سے براہم ہو کر چلے گئے تھے کہ دربار میں ہندو ستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجے پر نہ تھیں۔

سر ولیم میور نے جو کسی زمانے میں یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر تھا، ”لائف آف محمد“ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں اسلام اور آنحضرت کے خلاف نہایت گستاخانہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ سر سید نے ”خطبات احمدیہ“ کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ وہ لائف آف محمد کو پڑھ کر کس درجے کییدہ خاطر ہوئے، اس کے مطالعے سے ان کے جذبات کو کتنی ازیت پہنچی اور ان کا احساس کتنا زخمی ہوا، اس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے نواب محسن الملک کے نام ۲۰ اگست ۱۸۶۹ء کو لندن سے لکھا۔ اس طویل خط کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے اور پھر اسلام سے متعلق ان کی محبت کی داد دیجیے۔ لکھتے ہیں:

ان دنوں میں ذرا دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت کے حال میں لکھی ہے، اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جاوے۔ اگر روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاوے گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔

مارا ہمیں تمغہ، شاہنشاہی سیس است ۱۵

نواب وقار الملک کا کسی زمانے میں ایک ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو کچھری کے اوقات میں نماز پڑھنے میں معترض ہوتا تھا۔ سرسید کو اس صورت حال کا پتا چلا تو انھیں ۹۔ جنوری ۱۸۷۵ء کو ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا!

نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامت، اعمال سے، جس طرح خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرتا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی، اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لہجہ جانا اور گڑ گڑانا کیسا؟ "حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں" کشادہ خیالات تھا۔ تڑاق سے استعفیٰ دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا ہے نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے سے مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔ ۱۶

قومی اور اجتماعی کاموں میں مال خرچ کرنا سرسید کے نزدیک ضروری تھا۔ اس سے پہلو تہی کرنے والوں کو نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک دوست کو اس ضمن میں لکھتے ہیں۔ اپنے ضروری کاموں کے لیے تنگی، اخراجات کا عذر، میں اپنے خیال کے مطابق مہل سمجھتا ہوں۔ پس تم پر کیسی ہی تنگی ہو اور آمدنی اخراجات کو کافی نہ ہو اور ہر مہینے قرض ہوتا جاوے، ایسے امور میں میں ان باتوں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتا۔ دنیا کا کارخانہ اسی طرح لاشتم پشتم چلا جاتا ہے۔ بجز ان لوگوں کے جو اپنی زندگی کا مقصود

۱۵ مکتوبات سرسید ص ۶۲۱

۱۶ مکتوبات سرسید ص: ۲۳۰

گنج قارون جمع کرنا سمجھتے ہیں اور جس قدر جمع ہو جاوے بس نہیں کرتے۔ اور زیادہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا مجھ کو اور تم کو ایسا نہ کرے۔ ۳۵

سر سید کے خطوط نہایت نہایت دلچسپ ہیں اور ان میں بڑی پتے کی باتیں لکھی گئی ہیں۔ ان سے ایک شخص نے بذریعہ خط استفسار کیا کہ اگر نماز میں قرآن مجید کے الفاظ کے بجائے صرف ان کا ترجمہ پڑھ لیا جائے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں؟ اس کے خط کا جواب مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا:

”مخدومی!

نماز میں قرآن مجید بلفظ نہ پڑھتے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔“ ۳۶

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا سر سید انگریزی اقتدار کے ہرگز حامی نہ تھے، انگریزی تعلیم کے حامی تھے۔ اس کی بنیادی وجہ اس تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو منازل ارتقا سے روشناس کرانا اور اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں ان کو راہِ تقدم پر گامزن کرنا تھا، اور اس دور میں یہ ضروری تھا۔ یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس زمانے میں وہابیوں کو انگریزی حکومت کا باغی سمجھا جاتا تھا اور وہابیت کو بغاوت کے مترادف قرار دیا جاتا تھا، لیکن سر سید اپنے آپ کو دھڑلے سے وہابی کہتے تھے۔

مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید بریلوی کی تحریک کے وہ موید تھے، جب کہ انگریزی حکومت اس تحریک کی سخت مخالف تھی اور اس کے پیروکاروں پر بغاوت کے مقدمے قائم کر کے انھیں کالا پانی اور پھانسی کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس سلسلے کے پانچ مشہور وہابی مقدمات کی تفصیل ”فقہائے پاک و ہند تیرہویں صدی ہجری“ کی جلد دوم کے مقدمے میں بیان کی جا چکی ہے۔ آثار الصنادید میں انھوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا اسماعیل شہید اور سید

۳۵ موج کوثر ص: ۱۱۰

۳۶ مکتوبات سر سید ص: ۶۶۹

احمد شہید کا تذکرہ محبت و عقیدت سے بھرپور الفاظ میں کیا ہے۔

ہندوستان میں کانگریس انگریزوں نے قائم کی تھی۔ اس کا مقصد اس ملک کے باشندوں کو جمہوریت کی ان اقدار سے متعارف کرانا تھا جو برطانیہ میں رواج پذیر تھیں اور اس کے ذریعے انھیں کچھ مراعات سے نوازا جاتا تھا۔ لیکن سر سید نے اس کے بعض پہلوؤں کی شدید مخالفت کی۔ اگر وہ انگریز کے حامی ہوتے تو اس عہد میں کانگریس کے خلاف قلم و زبان کو حرکت میں نہ لاتے۔ یاد رہے، سر سید کے زمانے میں کانگریس کا پروگرام برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کرنا اور اس مقصد کے لیے اس سے پنچہ آزما ہونا تھا۔ بلکہ انگریز کے بتائے ہوئے طریقے اور اس کی ہدایات کے مطابق مودبانہ الفاظ میں اس کی خدمت میں کچھ مطالبات پیش کرنا تھا۔ اور سر سید کو اس سے اتفاق نہ تھا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ "اسباب بغاوت ہند" ہندوستان کی سیاست پر پہلی کتاب تھی، جس کی تلخ توانی نے برطانوی حکومت کے حلقوں میں ایک تہلکہ بپا کر دیا تھا اور بڑے بڑے انگریز منصب دار اس کی اشاعت کے بعد اہل ہند کے سیاسی اور اجتماعی مسائل کو غور و فکر کا ہدف قرار دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے صرف دو سال بعد شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی عام بغاوت کا اصل ذمے دار انگریزی حکومت اور ہندوستانیوں کے بارے میں اس کے طرز عمل کو قرار دیا گیا ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ممکن ہے اس کتاب سے انگریزوں کی اثر پذیری کا نتیجہ ہو۔

سر سید احمد خاں نے اسی سال سے زائد عمر پا کر ۲۷۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ مرض الموت میں حالت ہذیان طاری ہونے سے پہلے قرآن مجید کی یہ آیات ان کی زبان پر جاری رہیں۔

حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ نِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ
إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

آئینی اصلاحات کا سلسلہ

ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل سب سے پہلے ۱۸۵۴ء میں بنائی گئی تھی، جب کہ اس ملک

پریسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی، لیکن اس کو نسل میں کوئی ہندوستانی ممبر نہ تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو اس کے اثرات انگلستان کی پارلیمنٹ تک پہنچے۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں آئینی اصلاحات کا پہلا قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل میں تین ہندوستانی ممبر بذریعہ تائز دیے گئے۔

اس کے بعد ملک کے بعض صوبوں میں چند نیم سیاسی جماعتیں معرض وجود میں آئیں۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں "انڈین ایسوسی ایشن" قائم ہوئی اور ۱۸۸۴ء میں مدراس میں "مہاجن سبھا" کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۸۷ء ہی میں "انڈین نیشنل یونین" قائم کی گئی۔ اسی سال ایک انگریز مسٹر ہیوم نے ہندوستان کے باشندوں میں سیاسی شعور کو تیز کرنے کی فہم کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن تھا۔ ہیوم اس کے پاس کچھ تجاویز لے کر گیا، جن کا مفاد یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں اصلاح رسوم اور اصلاح تمدن کی ایک انجمن کی طرح ڈالیں۔ لیکن لارڈ ڈفرن نے اس کی تجاویز سن کر کہا کہ اس ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو انگلستان کی طرح حکومت کے خلاف کام کرتی ہو۔ چوں کہ انگریزوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے اور ان کی حکومت کے بارے میں ہندوستانی کیا رائے رکھتے ہیں، اس لیے یہاں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو اس خلا کو پُر کرے۔ حاکم اور محکوم دونوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستان کے باشندے ہر سال اپنا ایک اجتماع کر کے حکومت کو یہ بتانے کا اہتمام کریں کہ اس کے نظام حکومت میں کہاں کہاں نقائص ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جاسکتا ہے اور ملک کی حالت کس صورت میں زیادہ سے زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔

اپنی بات ختم کر کے لارڈ ڈفرن نے ہیوم سے کہا کہ جب تک وہ اس ملک کا وائسرائے ہے، اس تجویز کا اظہار کسی سے نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب تک ڈفرن ہندوستان کا وائسرائے رہا، ہیوم نے اس کی یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ جب وہ اپنی مدت ختم کر کے ہندوستان سے چلا گیا تو ہیوم اس کے بعد انگلستان گیا اور اس مسئلے سے متعلق وہاں کے متعدد لیڈروں سے بات کی۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

انگلستان میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ہندوستان میں ایک جماعت قائم کی جائے۔ چنانچہ ہیوم نے ہندوستان واپس آ کر ملک کے مختلف لوگوں سے مشورہ کیا اور

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا سنگ بنیاد رکھی گئی۔ اس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ہوا۔ اس وقت حکومت سے کانگریس کا اس درجے قریبی تعلق تھا کہ ہبوم نے وائسرائے ہند سے مل کر یہ کوشش کی کہ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت ملک کے کسی صوبے کے انگریز گورنر کو کرنی چاہیے۔ لیکن وائسرائے نے اس تجویز کو اس لیے عمل میں نہ آنے دیا کہ گورنر کی موجودگی میں لوگ آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکیں گے۔

انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ لندن میں بھی قائم کی گئی تھی، جس کا صدر وہاں کا ایک انگریز سر ولیم ڈیرن تھا جو صوبہ بمبئی میں سول سروس کا ایک بڑا افسر رہ چکا تھا۔ اس واقعہ کے بعد انیس سال یہ شخص زندہ رہا اور عمر بھر کانگریس کی خدمت کو اس نے اپنا معمول بنائے رکھا۔ اس کو ملازمت کی ایک ہزار پونڈ سالانہ پنشن ملتی تھی۔ یہ تمام رقم وہ کانگریس کے کاموں میں خرچ کر دیتا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں ہوا تھا، جس کی صدارت اسی نے کی تھی اور اس کے لیے وہ انگلستان سے آیا تھا۔ کانگریس کا یہ دور تھا جس کی سرسید نے مخالفت کی تھی۔ بہت بعد میں آہستہ آہستہ کانگریس نے اپنی حیثیت بدل لی تھی اور انگریزی حکومت کے خلاف اس نے بہت بڑا محاذ قائم کر لیا تھا جس کا نتیجہ آزادی وطن نکلا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت نے بے حد اذیتوں میں مبتلا کیا۔ دہلی کی علمی رونق اجڑ گئی اور وہاں کے مدارس کو خرید و نقصان پہنچا۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر بعض سرکردہ حضرات نے دیوبند (ضلع سہارن پور) میں عربی علوم کا ایک دارالعلوم قائم کرنے کا عزم کیا۔ ۱۵۔ محرم ۱۲۸۳ھ (۳۰۔ مئی ۱۸۶۶ء) کو بروز پنجشنبہ چھتے کی پرانی مسجد کے صحن میں اتار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں بغیر کسی رسمی تقریب اور نمائش کے نہایت سادگی کے ساتھ دارالعلوم کا افتتاح ہوا۔ ملا محمود دیوبندی کو جو اس زمانے میں میرٹھ میں مدرس تھے اور بلند پایہ عالم تھے، مدرس مقرر کیا گیا۔ محمود حسن جو بعد میں شیخ الحدیث مولانا محمود حسن کے نام سے مشہور ہوئے، اس دارالعلوم کے اولین طالب علم تھے، جنہوں نے افتتاح کے موقع پر استاد کے سلسلے کتاب کھولی۔ یہ جن اتفاق ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا پہلا استاد بھی محمود تھا اور پہلا

شاگرد بھی محمود -!

دارالعلوم دیوبند کے افتتاح کے وقت اللہ پر توکل اور اس کے کرم کے سوا کوئی ظاہری سازو سامان نہ تھا۔ پُرِ خُلُوصِ دَاعِيَةٍ، خدمتِ دین کا جذبہ اور اللہ پر بھروسہ ہی یا نیاں دارالعلوم کی کل کائنات تھی۔ نہ وسیع و عریض جگہ تھی، نہ عمارت اور نہ اساتذہ اور طلباء کی کوئی بڑی جماعت۔ صرف ایک طالب علم اور ایک استاد۔ ایہ حالت تھی اس ادارے کی جو اپنی خدمات گوناگوں کی بنا پر آج پوری دنیا میں مشہور ہے۔

اکابر دارالعلوم کی جانب سے قیام دارالعلوم کے موقع پر جو اعلان شائع کیا گیا، وہ درج ذیل ہے اور جن حضرات کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا، ان کے اسمائے گرامی اعلان کے نیچے درج ہیں۔

”الحمد للہ دیوبند میں اکثر اہل ہمت نے جمع ہو کر کسی قدر چندہ جمع کیا اور ایک مدرسہ عربی پندرہ تاریخ محرم ۱۲۸۳ھ سے جاری ہوا، اور مولوی محمد محمود صاحب بالفعل بمشاہرہ پندرہ روپیہ ماہوار پر مقرر ہوئے۔ چون کہ لیاقت مولوی صاحب کی ہمت کچھ ہے اور تنخواہ بسبب قلت چندہ کے کم۔ ارادہ ہستمان مدرسہ کا ہے کہ بشرط وصول زر چندہ قابل اطمینان جس کی امید رکھی ہے، تنخواہ مولوی صاحب کی زیادہ کی جاوے اور ایک مدرس فارسی و ریاضی کا مقرر ہو۔ جملہ اہل ہمت و خیر خواہان ہند خصوصاً مسلمان سکنتے دیوبند و قرب و جوار دیوبند پر واضح ہو کہ جو لوگ اب تک شریک چندہ نہیں ہوئے، یہ دل شریک ہو کر امداد کافی دیویں، اور واضح ہو کہ سوائے چندہ فہرست ہذا کے جس کی میزان ۱۰۰ روپے آٹھ آنے ہے، دوسرا چندہ واسطے خوراک و مدد خرچ طلبائے بیرون جات کے جمع ہوا ہے اور سولہ طالب علموں کا صرف ہو گیا ہے اور انشاء اللہ روز بروز جمع ہوتا جاتا ہے۔ اس میں سے طلبائے بیرون جات کو کھانا پکایا اور مکان رہتے کو ملے گا۔ کتابوں کا بندوبست بھی متعاقب ہوگا۔ نام ہستمان کے درج ذیل ہیں۔ جن صاحبوں کو روپیہ چندہ بھیجنا منظور ہو تو بنام ان کے بذریعہ خط بمرنگ ارسال فرما دیویں۔ رسید ان کی بصیغہ پیڈ بھیجی جاوے گی۔ فقط

حاجی عابد حسین صاحب۔ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ مولوی ہمتاب علی صاحب۔
مولوی ذوالفقار علی صاحب۔ مولوی فضل الرحمن صاحب، منشی فضل حق صاحب۔ شیخ نہال احمد صاحب۔

العبد فضل حق مہراہ کار مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی - قصبہ دیوبند -

تقریر بتاریخ ۱۹ - محرم الحرام ۱۳۸۳ھ - روز دو شنبہ -

یہ حضرات مدرسہ دیوبند کی ابتدائی مجلس ضوری کے رکن بھی تھے اور اس کے اولین معمار بھی۔ ان میں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست تھے اور حاجی عابد حسین پہلے مہتمم۔

دارالعلوم کا دستور العمل

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دینی مدارس بالخصوص دارالعلوم دیوبند کے قیام و بقا کے لیے جو دستور العمل مرتب اور تجویز فرمایا، اس میں اسلامی دور حکومت کے سابقہ طریق کے برعکس عوامی چندے اور جمہوری طرز اختیار کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس دستور العمل کی آٹھ شقیں ہیں۔ مولانا نانوتوی نے بتایا ہے کہ دینی مدارس کے قیام کے وقت ان کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ یہ بنیادی اور ضروری اصول درج ذیل ہیں۔

۱۔ اصل اول یہ ہے کہ تمام مقدر کارکن مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کو کوشش کریں، اوروں سے کراٹیں۔ خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲۔ ابقائے طعام طلباء بلکہ افزائش طلباء میں جس طرح ہوسکے، خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ سعی

رہیں۔

۳۔ مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی صحیح نہ کی جائے۔ خدا نخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالف رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تمہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو۔ اور اس لیے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ تیت نیک اس کو سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بہ دل و جان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی واردو

صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا ہو تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے تو یہن نہ ہوں۔ خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو، پوری ہو جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی عبیل یقینی نہیں، جب تک ان شاء اللہ یہ مدرسہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القدر کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا ہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا القصد آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سرو سامانی ملحوظ رہے۔

۷۔ سرکار کی شرکت اور امر کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

مولانا نانوتوی کی اس تحریر کو ان کے اصول ہشت گانہ کیسے یا دارالعلوم دیوبند کا دستور العمل قرار دیجیے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نہایت عمدہ اور شان دار باتیں ہیں۔ اس میں مدارس دینیہ کے لیے سرکاری امداد کے بجائے عوامی چندے کو اہمیت دی گئی ہے تاکہ دین کے یہ گہوارے اور اسلامی علوم کے یہ مرکز سرکاری عمل دخل سے پاک رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ظاہری شان و شوکت اور آمدنی کے حتمی اور یقینی ذرائع اختیار کرنے سے جو جاگیروں کی آمدنی اور نوابوں اور سرمایہ داروں کی وساطت سے حاصل ہوں، احتراز کیا جائے۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن

جن کے اپنانے سے اللہ کا خوف ورجا ختم ہو جاتا ہے اور رجوع الی اللہ کا سررشتہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

مظاہر علوم - سہارن پور

رجب ۱۲۸۳ھ (نومبر ۱۸۶۶ء) کو مولانا سعادت علی فقیہہ اور بعض دیگر حضرات کی کوششوں سے سہارن پور میں دینی علوم کا ایک مدرسہ "مظاہر علوم" کے نام سے قائم ہوا۔ اس کے اہتمام و تدریس کی ذمے داریاں مولانا سعادت علی فقیہہ کے سپرد تھیں۔ مولانا مدوح نے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) کو وفات پائی۔ اس زمانے میں مولانا احمد علی سہارن پوری کلکتہ میں فروکش تھے۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) کو وہ کلکتہ سے سہارن پور آگئے اور مدرسہ مظاہر علوم کی تدریس و اہتمام کا سلسلہ بالاتفاق ان کے سپرد کر دیا گیا۔ مدرسہ مظاہر علوم (سہارن پور) میں منقولات اور معقولات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس میں جو حضرات فرائض تدریس سرانجام دینے پر مامور تھے، وہ تمام علوم مرّوجہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ اس مدرسے نے بڑی ترقی کی اور بے شمار علما و فضلا اس سے فارغ التحصیل ہوئے جنہوں نے تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کے میدان میں بہت نام پایا۔ یہ مدرسہ اب بھی جاری ہے اور اللہ کے فضل سے اس کی رفتار خدمت بہت تیز ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء - لکھنؤ

علی گڑھ، دیوبند اور سہارن پور وغیرہ کے مدارس کے اٹھائیس تیس سال بعد جب کہ ملک میں متقدم قومی تحریکیں جاری تھیں، ندوۃ العلماء کے قیام کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کا مقصد علما کی اصلاح تھا جو بہت بڑا کام تھا۔ اس تحریک کے اصل محرک ایک بزرگ مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن اس کی تکمیل مولانا شاہ محمد علی کانپوری کے ہاتھوں ہوئی جو مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے۔ ان کی محنت و سعی سے ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء کو لکھنؤ میں قائم ہوا۔ وہی اس کے ناظم اول مقرر ہوئے۔ اس کے بڑے بڑے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ نصاب تعلیم میں اصلاح، قدیم نصاب تعلیم اور علی گڑھ کے جدید طریق تعلیم کے درمیان

ہم آہنگی کی ایک قابل قبول صورت پیدا کرنا۔

۲۔ علما کے باہمی نزاع ختم کر کے انہیں ایک مرکز پر جمع کرنا۔

- ۳ - ملک کے سیاسی معاملات سے الگ رہ کر مسلمانوں میں حصول علم کا جذبہ پیدا کرنا ۔
 ۴ - ایک بڑے دارالعلوم کا قیام ، جس کے نصابِ تعلیم کے ذریعے آپس کے مسلکی اختلافات ختم ہو سکیں ۔
 ۵ - ایک عظیم الشان لائبریری کا قیام جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں موجود ہوں ۔
 ۶ - محکمہ افتا کا قیام ۔

اُس دور میں عام طور سے علما پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے مسلکی اختلافات کی بنا پر خود بھی باہم جھگڑتے رہتے ہیں اور لوگوں کو بھی آمادہٴ پیکار رکھتے ہیں، لہذا ضرورت تھی کہ علما کو مصالحت و مفاہمت پر آمادہ کر کے ان کی آپس کی لڑائی کا خاتمہ کیا جائے چنانچہ ندوۃ العلماء کی اصلاحی تحریک بہت حد تک کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور مشترکہ مقاصد کے لیے مختلف الخیال علمائے کرام ندوۃ العلماء کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے، جس سے آپس کے مذہبی نزاعات میں بہت حد تک کمی واقع ہوئی۔ مولانا شبلی اور صاحب تفسیر حقانی مولانا عبدالحق دہلوی نے اس کے اغراض و مقاصد مرتب کیے۔ سر سید، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور دیگر متعدد اکابر نے اس کے اغراض و مقاصد کو سراہا اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں علما کی اس کوشش کا خیر مقدم کیا۔

اس سلسلے میں ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا محمد علی کے ایک خط کے جواب میں سر سید نے ۲۱- دسمبر ۱۸۹۴ء کو ان کے نام جو مکتوب تحریر فرمایا وہ یہ ہے!

جناب مولانا محذوم مکرم من مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء۔!

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ آپ کا نوازش نامہ اور حصہ اول روٹداد ندوۃ العلماء پہنچا۔ ممنون عنایت ہوا۔ اس پر ریویو لکھتا اور فرانس ریویو نویسی کو پورا پورا ادا کرنا کسی قدر مشکل اور نامناسب ہے ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے، اس کو چلنے دینا چاہیے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ میں اس کی رسید اخبار میں چھاپوں گا اور نواب محسن الملک، مولوی سید ہمدی علی کانفرنس کے اجلاس میں ایک ریزولوشن پیش کریں گے اور جو آپ کا ارشاد ہے، اس پر ایہ میں اس کی تعمیل ہو جائے گی۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علما کے اتفاق ہو۔ الا کوشش ضرور ہو۔ السلام علیکم یہ

علمائے کرام کے اتحاد کے علاوہ ندوۃ العلماء کی دوسری بہت بڑی خدمت قدیم نصابِ تعلیم کی اصلاح ہے۔ اپنے دور کی ضرورت اور ماحول کے مطابق جلیل القدر اور ماہر فن علما کے مشورہ و تجویز سے ایک ایسا نصابِ تعلیم ترتیب دیا گیا جو قدیم و جدید کی دو انتہاؤں کے درمیان ”وسط“ کا درجہ رکھتا تھا۔ مئی ۱۸۹۸ء کو لکھنؤ میں اپنا ایک دارالعلوم قائم کر کے اس نصابِ تعلیم کے مطابق ابتدائی درجوں کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔

یہ نصابِ تعلیم اور طریقِ تعلیم نہایت کامیاب رہا اور ملک کے اہل علم نے اس کی تحسین کی۔ مسلمانوں میں مولانا احمد رضا خاں کے سوا شاید کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ انھوں نے اس کے خلاف پُر زور مضامین لکھے اور ندوہ کے مقابلے میں ایک جماعت ”جدوہ“ قائم کی۔ ہمارے خیال میں کسی علمی کوشش کی مخالفت اور اس پر تنقید اس بنا پر ضروری بھی ہے کہ اس سے بہت سی نئی باتیں سامنے آجاتی ہیں اور اپنے کام میں اصلاح کے مواقع اُبھرتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کے نصابِ تعلیم میں تفسیر قرآن، حدیث و فقہ، عربی ادب اور عربی میں تحریر و تقریر کو خاص طور پر شامل کیا گیا اور علما و طلبانے انتہائی شوق و توجہ سے اس نصاب کے مطابق اپنی تعلیم مکمل کی اور وہ ہر گوشہ علم اور شعبہ فن میں ممتاز ہوئے۔ ان میں سے حضرات مرحومین میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، ریاست علی ندوی، معین الدین، سید محمد جعفر شاہ پھلواری مدنی، ابو ظفر ندوی، مسعود علی ندوی اور مسعود عالم ندوی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

بزرگانِ موجودین میں سے مولانا محمد حنیف ندوی اور سید ابوالحسن علی ندوی کے نام لائق تذکرہ ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں کہ تصنیف و تالیف کے مختلف دائروں میں جن کی خدمات پر بجا طور سے فخر کیا جاسکتا ہے بالفاظِ دیگر کتنا چاہیے کہ ندوۃ العلماء کے محرک و بانی اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور جس جذبے کے تحت انھوں نے یہ صحت مندانہ قدم اٹھایا تھا اس میں انھیں کامرانی حاصل ہوئی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ علما کے دو دھڑوں میں جب اختلاف پیدا ہو جائے تو وہ ختم نہیں ہوتا، قائم رہتا ہے بلکہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس اختلاف کے حدود جس قدر وسیع ہوسے ہیں، اسلام اور مسلک کے نام پر ہوتے ہیں۔ گویا اسلام اور ان

۱۷ مولانا محمد حنیف ندوی ان سطور کی تحریر سے گیارہ دن بعد ۱۲۔ جولائی کو فوت ہوئے۔

کے مسلک کا بنیادی مقصد ان حضرات کو اختلاف کی راہ پر لگانا تھا۔ اب صلح کرنا اسلام اور مسلک کے خلاف ٹھہرا۔ (العیاذ باللہ) لیکن ندوۃ العلماء کے قیام کا بیڑا اٹھانے والے حضرات نے کسی ایسی ساعت سعید اور نیت خالص کے ساتھ علماء کے باہمی اتحاد کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ وہ اس میں سو فی صد کامیاب رہے اور اس کے بعد ندوہ میں جو نصاب ترتیب دیا گیا، وہ باقی مدارس برصغیر کے لیے ایک نمونہ اور مثال ثابت ہوا۔ پھر ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے حضرات نے جو علمی کام کیا، وہ سب مسلمانوں کا مشترکہ کام ہے، اس میں کہیں نزاع یا باہمی اختلاف کے جراثیم نہیں ہیں۔

بعض حضرات ندوہ اور فرزندانِ ندوہ پر سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہیں اور تنقید اگر صحت مندانہ ہو تو مفید بھی ہوتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی انہوں نے ندوہ کے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ اس کے بانیوں کے اخلاص اور مصنفین کی کوششوں کے کس قدر شان دار نتائج نکلے اور انہوں نے علم و عمل کے میدان میں کتنی ترقی کی۔

چند الفاظ اس کتاب کے بارے میں

”فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری“ کی یہ تیسری جلد ہے جو خواندگانِ ذی احترام کے زیر ملاحظہ ہے۔ لیکن ترتیب کے اعتبار سے یہ سلسلہ فقہائے ہند کی دسویں جلد ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کی جلد اول ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی اور صرف تہجی کی ترتیب سے حرف الف سے شروع ہو کر حرف ظ پر ختم ہوئی تھی۔ جلد دوم ۱۹۸۴ء میں طبع ہوئی تھی اور اس میں صرف انہی فقہائے اعلام کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے اسمائے گرامی حرف ع سے شروع ہوتے ہیں۔ اب جلد سوم پیش خدمت ہے۔ اس کا آغاز حرف غ سے اور اختتام حرف ی پر ہوا ہے۔ اس میں ۱۳۳ علماء و فقہاء کا تذکرہ تو خاصی تفصیل یا کسی قدر

اختصار سے کیا گیا ہے۔ البتہ آٹھ فقہائے کرامی قدر کے حالات نہیں مل سکے، صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ان کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے اصحابِ فقہ میں ہوتا تھا۔ ان کا تعارف متعلقہ حروف ہجائی میں "چند دیگر فقہائے کرام" کے عنوان سے چند سطروں میں کرادیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ جلد برصغیر کے اہل علم و فقہاء کے تذکرے پر محیط ہے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

۳۔ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ

یکم جولائی ۱۹۸۷ء

غ

۱۔ مولانا غلام امام حیدر آبادی

علمائے ہند میں جن حضرات نے تاریخ، شعر و شاعری، حساب و ریاضی اور علم فقہ میں شہرت حاصل کی، ان میں حیدر آباد (دکن) کے مولانا غلام امام کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا مختصر سانسب نام یہ ہے :-

غلام امام بن متور بن مکارم بن غلام محمد۔ ایہ اصلاً افغانی تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کسی بزرگ نے افغانستان سے نقل مکانی کر کے حیدر آباد (دکن) میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے مولانا غلام امام افغانی حیدر آبادی کہلاتے۔ ان کی ولادت ۱۲۲۳ھ کو حیدر آباد میں ہوئی اور وہیں نشوونما پائی۔ ابتدا میں گھڑ سواری اور فنِ حرب میں مہارت پیدا کی۔ پھر بعض امرائے مملکت سے رابطہ قائم کیا اور ماہر حرب ہونے کی بنا پر فوج میں حصول ملازمت کی کوشش کی۔ لیکن ان کی ذہانت و قابلیت کی وجہ سے حیدر آباد کے چند امرائے سلطنت نے ان کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کی ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۲۴۳ھ میں انہوں نے علم صرف کی ابتدائی کتاب "میزان الصرف" پڑھنا شروع کی اور حیدر آباد کے مقامی اساتذہ سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں ریاضی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی تمام درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ شعر و شاعری اور تاریخ میں بھی مہارت پیدا کی اور اس میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبق لے گئے۔ تاریخ میں ایک کتاب "رشید الدین خانی" کے نام سے تصنیف کی۔ اپنے اشعار کا ایک دیوان مرتب کیا، جس میں امرائے سلطنت کی مدح و

توصیف کی اور بہت سے الغامات حاصل کیے۔ بعد ازاں منطق و فلسفے کو موضوع بنایا اور اس ضمن کی تمام دسی کتابیں باقاعدہ مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ کتب تصوف کی تکمیل بھی ماہر علما سے کی۔ حیدرآباد کے نامور عالم شیخ غلام علی سے اخذِ طریقت کیا۔ ان تمام علوم و فنون میں درک حاصل کرنے کے بعد تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی۔ اس وقت وہ کبرسنی کو پہنچ چکے تھے۔ اب انھوں نے درس و اناوہ کی مسند بچھائی اور اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا غلام امام نہایت باہمت اور صاحبِ عزم عالم تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ رشید الدین خانی اور دیوان شعری کے علاوہ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

- ۱۔ خورشید جاہلی : تاریخ کی ایک مبسوط کتاب ہے جو ۱۲۸۳ھ میں لکھی۔
- ۲۔ محی الصلاة : یہ فقہ سے متعلق ہے اور حنفی نقطہ نظر کی کتاب ہے۔
- ۳۔ ترجمہ کیدانی : یہ بھی فقہ حنفی کے بارے میں ہے۔
- ۴۔ احسن الترتیب : حکمت و فلسفے کے متعلق ہے۔
- ۵۔ خورشید دانش : یہ بھی فلسفہ اور حکمت کے موضوع پر ہے۔
- ۶۔ مائتہ رسائل : اپنے دوستوں کے نام خطوط، جن کی تعداد ایک سو تک پہنچی ہے۔ یہ خطوط ادب و انشا سے تعلق رکھتے ہیں۔
- ۷۔ کشف الفرائض : معنوں کے حل کرنے کے بارے میں
- ۸۔ مطالع خورشید : علم منطق میں۔
- ۹۔ تیغ ہندی : لغت ہندی کی اصطلاحات سے متعلق۔
- ۱۰۔ خورشید حساب : فن ریاضی میں
- ۱۱۔ ایک رسالہ علم ہدیت کے موضوع پر
- ۱۲۔ ایک دیوان شعری۔

باشہ مولانا غلام امام افغانی حیدرآبادی دیوار ہند کے عظیم عالم تھے اور علوم کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ذہانت و فطانت میں اس نواح کا کوئی شخص ان کا ہم پایہ نہ تھا۔ خط نہایت عمدہ تھا۔ اپنے اوصاف و کمالات کی وجہ سے ہر حلقے میں عزت و احترام کے مستحق گردانے جاتے تھے۔ امرائے مملکت، عمال حکومت، اصحاب تدریس، از باب تصوف، علمائے وقت سب تکریم سے پیش آتے تھے۔ علم کے ساتھ اللہ نے ان کو عمل کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔

اس عالم اجل اور فاضلِ کامل نے باسٹھ سال کی عمر پا کر ۱۸ شوال ۱۲۸۵ھ کو حیدرآباد میں انتقال کیا۔

۲۔ مولانا غلام حسین امیٹھوی

مولانا غلام حسین امیٹھوی تیرھویں صدی ہجری کے جید ہندی علما میں سے تھے ان کے والد کا نام نامی عمر عظیم تھا۔ نہایت صالح اور صاحبِ تقویٰ عالم دین تھے۔ شیخ حسن غوری کی اولاد سے تھے اور حنفی مسلک تھے۔ یوپی کے ایک مقام دیوناٹہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما کی منزلیں طے کیں۔ اپنے عہد کے نامور عالم شیخ فقیر اللہ قادری سے کتابِ علم کیا۔ پھر دہلی گئے، اس زمانے میں دہلی میں شیخ برخوردار لاہوری کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے اور دہلی کے دیگر اساتذہ سے حصولِ علم کیا۔ علم سے فراغت کے بعد علاقہ اودھ میں وارد ہوئے اور یوپی کے شہر امیٹھی میں اقامت اختیار کی۔ اسی بنا پر امیٹھوی کہلائے۔ امیٹھی مشہور عالم و شیخ احمد عرف میاں جیون کا مسکن تھا، جنہوں نے ۹ ذیقعدہ ۱۱۳۰ھ کو دہلی میں وفات پائی اور بہترین تعلیمی و تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دیں۔

مولانا غلام حسین کچھ عرصہ یوپی کے ایک شہر مستقر ہیں بھی اقامت گزیں سے اور

وہاں کے لوگوں کو مستفید فرمایا۔

مولانا ممدوح حدیث، فقہ، تصوف اور دیگر علوم عقلیہ و نقلیہ میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ حقائق و معارف کے بیان و اظہار میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ مسائل فقہ کی وضاحت اس اسلوب سے کرتے کہ سامعین حیران رہ جاتے۔ تصوف و سلوک کی باتیں بھی موثر انداز میں لوگوں کے ذہن نشین کراتے۔ تفسیر و حدیث کی تبلیغ و ترویج میں بھی اس دور میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا۔

ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بلند پایہ شاعر تھے اور ان کا کلام نہایت عمدہ تھا۔ مسائل فقہ میں ایک منظوم کتاب لکھی جو ان کے دور میں بڑی مقبول ہوئی۔ اس عالم و فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۳۔ مولانا غلام حسین صدیقی قنوجی

ہندوستان کا ایک شہر قنوج ہے۔ یہ شہر کسی زمانے میں علما و فضلا کا مرکز تھا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جو اصحاب علم پیدا ہوئے ان میں مولانا غلام حسین صدیقی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: غلام حسین بن حسین بن عبد الباسط بن رستم بن علی بن علی اصغر صدیقی قنوجی۔ یہ تمام بزرگ علم و فضل میں یکتا اور مسائل فقہ میں مرجع خلائق تھے۔

مولانا غلام حسین کی ولادت ۱۲۲۱ھ کو ہوئی۔ تاریخی نام "غلام علیم" تھا بعض دوسری کتابیں مولانا محمد سعادت خان فرخ آبادی سے پڑھیں جو اپنے عہد اور علاقے کے جلیل القدر عالم تھے اور متوکل کے عرف سے معروف تھے۔ ۱۲۳۶ھ میں مفتی فرخ آبادی مولانا ولی اللہ بن احمد علی حسینی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے، ان سے علوم عقلیہ

کی بعض کتابوں کا درس لیا اور تفسیر و حدیث کی مروجہ کتابیں مکمل کیں۔ بعد ازاں ارض حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے اور ۱۲۵۵ھ میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اسی اثنا میں مکہ مکرمہ میں شیخ عبداللہ سراج، شیخ شمس الدین شطا اور سید عمر آفندی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے مستفید ہوئے۔ مدینہ منورہ میں اس زمانے میں مولانا محمد عابد سندھی کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے بھی خوب استفادہ کیا اور کتب صحاح اور سنن مشہورہ کی سندلی۔ قیام حجاز کے دور میں تصوف کی کتابیں بھی پڑھیں۔

وطن واپس آئے تو بڑودہ میں سکونت اختیار کی۔ ان کے جد امجد مولانا عبدالباہظ صدیقی توحی نے ایک کتاب ”منازل الاثناعشر“ تصنیف کی تھی، انھوں نے اس کی ذیل لکھی اور اس پر حاشیہ تحریر کیا۔ یہ کام نہایت محنت اور سرگرمی سے انجام دیا۔

مولانا غلام حسین قزوچی کا شمار مشہور فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا اور وہ اپنے عصر میں ارض ہند کے جید عالم، مشہور فقیہ، بہت بڑے صوفی اور ممتاز محقق تھے۔ مسائل فقہ میں انھیں جو عبور حاصل تھا، وہ کم ہی لوگوں کو حاصل ہوگا۔ تفسیر اور حدیث میں بھی ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ غرض علوم عقلی و نقلی میں ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔ فقہی معاملات میں ان کی تحقیق اور فتوے کو مستند سمجھا جاتا تھا۔

آخر عمر میں پھر سفر حجاز پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ واپسی پر جہاز بمبئی کے ساحل پر لگا تو نیچے اترے اور بیمار پڑ گئے، بمبئی ہی میں وفات پائی۔ حدائق الحنفیہ میں مرقوم ہے کہ ”حج کر کے بمبئی میں واپس آئے تو وہاں بیمار رہ کر حدود ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی“۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے سن وفات تحریر نہیں کیا۔

۳۱۱ الحدائق الحنفیہ ج ۳ ص ۲۶۵ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۳، ۱۵۴ —
حدائق الحنفیہ ص ۲۸۱، ۲۸۰ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۲، ۳۵۳۔

۴۔ مفتی غلام حضرت اعظمی لکھنوی

مفتی غلام حضرت اعظمی لکھنوی اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے۔ ان کے والد مکرم کا نام محمد غوث تھا۔ مفتی صاحب مدوح تیرھویں صدی ہجری کے بلدہ لکھنؤ میں ممتاز فقیہ اور بہت بڑے شیخ و عالم کی حیثیت سے معروف تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے جو اس دور میں مجمع علماء اور مرکز فقہا تھا۔ انھوں نے اپنے شہر لکھنؤ کے اساتذہ سے کسب علم کیا اور مرتبہ عالی کو پہنچے۔ علم سے فارغ ہوئے تو لکھنؤ کے منصب افتا پر فائز ہوئے اور نام حیات اس پر فائز رہے۔ افتا کی ذمہ داری اپنے اندر بہت سی نزاکتیں رکھتی ہے اور مفتی صاحب موصوف نے ان ذمہ داریوں کو پوری طرح نبایا۔ ان کے اخلاص اور فراوانی علم کے باعث لکھنؤ کے امرا و وزراء ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

مفتی غلام حضرت نے ۱۲۳۲ھ کو وفات پائی۔

۵۔ مولانا غلام رسول — قلعہ میہاں سنگھ

خطہ پنجاب میں بے شمار علماء و محدثین اور صوفیاء و فقہا پیدا ہوئے جن کی علمی مساعی اور فقہی کاوشوں سے لائق لوگوں نے استفادہ کیا۔ ان اعظم و جلال میں ایک بزرگ مولانا غلام رسول تھے جو ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبہ قلعہ میہاں سنگھ میں فرود گشت تھے۔ اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا خاندان کئی پشتوں سے علم و فضل اور نصرت و صالحیت میں مشہور تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: غلام رسول بن رحیم بخش بن نظام الدین

بن بہا الدین بن محمد اکرم بن حافظ عصمت اللہ بن عبداللہ بن سکندر بن نور محمد بن پیر محمد۔
یہ تمام بزرگ اپنے دور کے عالم، فاضل، صوفی اور دیندار لوگ تھے۔ وعظ و نصیحت اور
تحقیق مسائل میں اس نواح کے باشندے اپنی سے رجوع کرتے تھے اور اس اعتبار سے
ان کو مرجع خلافت کی حیثیت حاصل تھی۔

مولانا غلام رسول کے دادا مولوی نظام الدین جو تین و تقویٰ کی دولت مالا مال تھے
فارسی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے، وہ خادم تخلص کرتے تھے، نظامی گنجوی کے تبلیغ
میں انھوں نے فارسی مثنوی بھی لکھی تھی جو اس عہد میں بہت مقبول ہوئی تھی۔
ولادت

یہ خاندان ضلع گجرات کے موضع سکندر پور میں سکونت پذیر تھا۔ وہاں کی سکونت ترک
کر کے یہ لوگ ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کوٹ بھوانیداس میں آ بسے تھے۔ وہیں
۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) میں مولوی غلام رسول پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے سلسلے میں دو
واقعات قابل ذکر ہیں۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ مولوی غلام رسول کے دادا مولوی نظام الدین خادم کے ایک
دوست کا نام میاں محمد یوسف تھا جو ضلع گوجرانوالہ کے ایک مقام پیر کوٹ کے رہنے
والے تھے، بہت متقی اور پربہیزگار بزرگ تھے، نجاری کا کام کرتے تھے۔ کوٹ بھوانیداس
سے پیر کوٹ تقریباً چار میل کے فاصلے پر ہے، میاں محمد یوسف کا یہ معمول تھا کہ وہ
ایک دن چھوڑ کر ہر دوسرے دن مولوی نظام الدین سے ملنے کوٹ بھوانیداس آتے تھے۔
مولوی غلام رسول کے بڑے بھائی کا نام غلام محمد تھا جو طبابت کرتے تھے اور دینی علوم سے
بہرہ ور تھے۔ ان کی پیدائش کے بعد میاں محمد یوسف نے مولوی غلام رسول کے والد مولوی
رحیم بخش سے کہا:

”آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا، اس کا نام غلام رسول رکھنا۔ یہ عالم یا عمل،
صوفی یا کمال، متبع سنت نبوی، مقتدانے انام اور ہادی کتاب و سنت ہوگا۔ لوگ
اس کے علم و عرفان اور مواظظ و نصائح سے استفادہ کریں گے۔“

دوسرا واقعہ جو لائق تذکرہ ہے، یہ ہے کہ غلام رسول کی ولادت سے پہلے ان کی ماں نے خواب دیکھا کہ چودھویں رات کا چاند ان کی جھولی میں آگرا ہے اور دُور دُور تک اُس کی روشنی پھیل گئی ہے اور چاند مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ — معبروں سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی تو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک ایسا بیٹا عطا فرمائے گا جو صاحبِ ورع و تقویٰ ہوگا اور بہت سے لوگ اس سے مستفید ہوں گے۔

عالمِ طفولیت

غلام رسول ابھی عالمِ طفولیت ہی میں تھے کہ ان کے عمل و حرکت سے ایسے آثار نمایاں ہونے لگے جو زہد و اتقا کے سلسلے میں ان کے تاب ناک منتقل کی نشان دہی کرتے تھے۔ مثلاً وہ عام بچوں کی طرح کھیل کود کے عادی نہ تھے، اپنے ہم عمر بچوں کو شرارتوں سے روکتے اور گالی گلوچ سے منع کرتے تھے، مزاج میں نرمی اور انکسار کا غلبہ تھا، بڑوں کا احترام بجالانے اور آگے بڑھ کر ان کو سلام کرتے، والدہ نماز میں مشغول ہوتیں تو خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ جاتے، قرآن مجید پڑھا جاتا تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے۔ ان اوصاف کی وجہ سے وہ بچپن ہی "متقی" مشہور ہو گئے تھے۔ گاؤں کے مسلمان اور ہندو ان کی تعریف کرتے اور ان کے والد مولوی رحیم بخش سے کہا کرتے کہ آپ کا بیٹا بڑا سعادت مند ہے اور اس کی عادات و اطوار اولیاء اللہ سے ملتی ہیں۔ اس بچے سے لوگوں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ کوئی بیمار ہو جاتا تو اس سے پانی دم کراتے اور بیمار پر چھڑک دیتے، بعض لوگ مریضوں پر دم کرانے کے لیے اس کو اپنے گھر لے جاتے اور مریض اس کے دم سے واقعی اچھا بھلا ہو جاتا۔ کسی کی کوئی چیز گم ہو جاتی تو اس بچے سے دعا کرائی جاتی اور چیز کہیں نہ کہیں سے مل جاتی۔

۵۵ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۲ -

۵۶ ایضاً ص ۲۳، ۲۴

تعلیم و تربیت

پانچ برس کے ہوتے تو اس زمانے کے دستور کے مطابق قرآن مجید پڑھنے کے لیے ان کو مسجد میں لے جا کر معلم کے سپرد کیا گیا، لیکن والدین اور معلم کو نہایت پریشانی ہوئی کہ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت سے بھر عاری اور حفظ و ذکاوت کی نعمت سے ذہن بالکل خالی، بڑی مشکل سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا۔ والد انتہائی متفکر کہ جو لڑکا بچپن ہی میں نیک اور پرہیزگار مشہور ہے اور لوگ جسے متقی کہتے ہیں، وہ پڑھنے لکھنے کے اوصاف سے تہی دامن ہے۔ توقع کچھ اور تھی، ظہور میں کچھ اور ہی آرہا ہے۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ ایک دن خود غلام رسول نے خواب دیکھا کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حویلی میں اذان دے رہے ہیں اور اذان کی آواز سن کر لوگ ہجوم درہجوم ان کی طرف آرہے ہیں۔ صبح ہوئی تو خواب اپنے دادا حافظ نظام الدین خادم کو سنایا۔ انہوں نے تعبیر دی کہ بہت سے لوگ تیرے ہاتھ پر مسلمان ہوں گے۔ اس واقعہ سے چند روز بعد حافظ نظام الدین کو اسماعیل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ایام مرض میں غلام رسول نے ان کی بہت خدمت کی اور حافظ صاحب نے اپنے اس پوتے کو بہت دعائیں دیں۔

اسی اثنا میں ایک بزرگ حضرت کا کا شاہ (جو موضع گڈ کو ر ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے) کوٹ بھوانید اس میں حافظ نظام الدین سے ملاقات کے لیے تشریف لاتے، وہ حافظ صاحب سے قلبی تعلق رکھتے تھے۔ حافظ صاحب نے ان کو بتایا کہ غلام رسول نے میری بے انتہا خدمت کی ہے، میں نے اس کے لیے بارگاہِ خداوندی میں فیض رسانی کی دعا کی ہے، اب میرا وقتِ رحلت قریب ہے، میرے بعد اس کی روحانی تربیت اور ظاہری پرورش کا اہتمام آپ کے ذمے ہے، جب تک آپ زندہ ہیں اس کا خیال رکھیں، ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکا ضائع ہو جائے۔ شاہ صاحب نے اس ذمے داری کو نبھانے کا عہد کیا اور فی امان اللہ کہہ کر تشریف لے گئے۔ اس سے دوسرے دن حافظ نظام الدین وفات پا گئے۔

چند روز بعد حضرت کا کا شاہ پھر کوٹ بھوانیہ اس آئے اور غلام رسول سے ملے۔
 گلے لگایا اور کچھ پڑھنے کی تلقین فرمائی، حافظ صاحب کی قبر پر جانے کے لیے بھی کہا۔
 دوسرے دن پوچھا، جو کچھ میں نے بتایا تھا، وہ پڑھا۔ عرض کی، حضرت! میں تو وہ
 الفاظ بھول گیا ہوں، شاہ صاحب نے ہنس کر فرمایا: "حافظہ ندارد" پھر انہیں اپنے
 پاس بلا کر فرمایا "تم میرے دوست کے پوتے ہو اور تمہارے بارے میں انہوں نے مجھے
 خاص طور سے وصیت کی ہے۔" یہ کہہ کر غلام رسول کے سینے پر ہاتھ رکھا اور
 فرمایا: "برخوردار! کہو اللہم بَارِكْ فِي دَعْوِي وَعَمَلِي - رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا -"
 اس وقت غلام رسول کی عمر بارہ برس تھی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں کوٹ بھوانیہ اس میں متقدم اہل علم و ادب
 تصوف سکونت پذیر تھے اور مولوی نظام الدین کی وجہ سے بہت سے صلحا و افتیاء کی وہاں
 آمد و رفت تھی، اسی بنا پر مشہور تھلہ:

کوٹ بھوانیہ اس دا بغداداے پنجاب دا

بہر حال کچھ دن کا کا شاہ صاحب کوٹ بھوانیہ اس میں مقیم رہے، جانے لگے تو غلام رسول
 ورتک ان کے ساتھ گئے۔ رخصت ہوتے وقت فرمایا: "بیٹے! میں جب بھی تمہیں
 بلاؤں، مجھے ضرور ملنا، جن طرح بھی ہو سکے کتابیں پڑھ لو، زیادہ محنت کرنے اور
 پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود تمہاری حفاظت کرے گا، وہی تمہیں
 کتابیں اور ان کے مضامین حفظ کرائے گا۔ محنت و مشقت جس قدر ہو سکے یا خدا میں
 کرو۔" اس کے بعد دعا کی اور تشریف لے گئے۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں، جس دن شاہ صاحب نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر
 مجھے دعا کی تلقین کی تھی، اس دن کے بعد میری یہ کیفیت ہو گئی کہ اگر میں نے کسی کتاب کے

کے سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۵ تا ۲۷

۲۷ ایضاً، ص ۲۹ -

صرفہیات کا بھی مطالعہ کیا ہے تو کتاب کے الفاظ اگر تمام و کمال یاد نہیں رہے تو مطالب ضرور ذہن میں محفوظ ہو گئے۔

اب اللہ نے حصولِ علم کے لیے ان کا سینہ کھول دیا اور وہ باقاعدہ طلبِ علم کی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذکرِ الہی اور وظائف و اوراد کو بھی اپنا معمول ٹھہرایا۔ یعنی علمِ ظاہری اور علمِ باطنی دونوں کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور اللہ نے دونوں میں حصہ وافر عطا فرمایا۔ ذَلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُوْتِیْہِ مَن یَّشَاءُ۔

حضرت کا شاہ صاحب کے تشریف لے جانے سے چند روز بعد غلام رسول گاؤں سے چلے اور لاہور آ گئے۔ وہاں بازارِ حکیمان کی لال مسجد میں موضعِ بگہ کے مولانا غلام محی الدین بگوی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور باقاعدہ حصولِ علم کا آغاز کیا۔ دو مہینے بعد خواب میں حضرت کا شاہ کو دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں، ”تم مجھے ضرور ملو“ صبح اٹھے تو مولانا غلام محی الدین بگوی سے اجازت لی اور موضعِ گڈ گور پہنچے شاہ صاحب انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، کچھ نصیحتیں کیں، وظائف بتائے، اتباعِ سنت

۵۵ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۹

تہ ربگہ، ضلع سرگودھا میں بھیرہ کے قریب ایک مشہور جگہ ہے جسے کسی زمانے میں علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا غلام محی الدین بگوی کے رہنے والے تھے اور اپنے عہد کے نامور عالم اور فقیہ تھے۔ ۲ محرم ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) کو بگہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کرنے اور ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے بھائی مولانا احمد الدین بگوی کے ساتھ دہلی گئے۔ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے حدیث پڑھی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے سند حدیث حاصل کی اور شاہ غلام علی مجددی کے حلقہٴ بیعت میں داخل ہوئے۔ ۱۲۳۱ھ کو دکن واپس آئے۔ والد صاحب ر حافظ نور حیات) وفات پا چکے تھے، ان کی مسندِ درس کو رونق بخشی۔ فقیر عزیز الدین کی درخواست پر لاہور آئے اور میں برس تک بازارِ حکیمان کی لال مسجد میں درسِ حدیث دیتے رہے۔ بے شمار علما و طلباء نے ان سے استفادہ و استفاضہ کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن بگہ چلے گئے۔ ۲۰ شوال ۱۲۷۲ھ کو وفات پائی۔

پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی، صحابہ کرام کا عملی نمونہ بننے کا درس دیا اور حصولِ علم کی تاکید کی۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں شاہ صاحب کی ان باتوں سے میں نہایت متاثر ہوا، ان کی ہر بات دل میں اترتی اور ذہن میں پیوست ہوتی جاتی تھی۔ ان کے لٹنیں و عظمت اور اثر میں ڈوبے ہوئے اسلوبِ کلام کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مدارجِ محبت کا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس قرار پاگئی اور قلب کی گہرائیوں میں ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ اتباعِ رسول اور پیرویِ سنت کے لیے میری جان بھی چلی جائے اور میرے جسم کے پُترے اڑا دیے جائیں تو بھی مجھے کوئی پروا نہ ہوگی اور میں اس نعمتِ عظمیٰ کو کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ اس دن سے مجھے ایسے محسوس ہونے لگا کہ میں آنحضرت کی ذاتِ ستودہ صفات کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ اگر مجھ سے خلافِ سنت کوئی کام ہونے لگتا تو ایسے معلوم ہوتا کہ خود آنحضرتؐ اس سے منع فرماتے ہیں۔ میں ہر وقت نشہٴ محبتِ رسولؐ میں سرشار رہتا تھا۔

شاہ صاحب سے اجازت لے کر مولانا غلام رسولؐ واپس آنے لگے تو فرمایا: "غلام رسول! میری زندگی میں مجھ سے ملنے رہنا شاید تم میری باقیاتِ صالحات میں سے ہو اور ممکن ہے یہی بات میرے لیے ذریعہٴ نجات بن جائے۔ دیکھو! علم حاصل کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرنا۔"

اس واقعہ پر کچھ عرصہ گزرا تھا کہ مولانا غلام محی الدین لاہور سے اپنے وطن گجرات شریف لے گئے اور ان کی جگہ ایک اور عالم کو مدرس مقرر کر لیا گیا جو علم میں تو بلاشبہ کامل تھے، مگر عمل میں ان کا درجہ کم تھا۔ مولانا غلام رسول نے ان سے علمِ نحو کی کتابیں پڑھیں اور کافی پڑھیں۔ اسی اثنا میں ایک رات مولانا غلام رسول نے خواب دیکھا کہ حضرت کا کا شاہ صاحب نے ان سے ملاقات کے لیے فرمایا ہے۔ مولانا نے اُستاد سے

وہاں جانے کی اجازت طلب کی، لیکن اُستاد نے اجازت نہ دی۔ دوسری رات پھر وہی خواب دیکھا، اُستاد نے اب بھی اجازت دینے سے انکار کیا۔ تیسری رات خواب دیکھا کہ شاہ صاحب فرما رہے ہیں، ”یہ میری تم سے آخری ملاقات ہے۔ تم لاہور سے بگڑ چلے جاؤ اور مولوی غلام محی الدین سے استفادہ کرو، تمہارے موجودہ اُستاد دین دار نہیں ہیں۔“ اب مولانا غلام رسول نے کتابیں اٹھائیں اور اُستاد سے اجازت لیے بغیر لاہور سے روانہ ہوئے اور حضرت کا شاہ صاحب کے گاؤں گڈ گور پہنچے۔ لیکن ان کے ہاں پہنچنے سے قبل شاہ صاحب وفات پا چکے تھے، ان کی قبر پر گئے، نماز جنازہ پڑھی، پھر اپنے گاؤں واپس آگئے۔ بیٹے کو دیکھ کر ان کے والد رحیم بخش بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ”اچھا ہوا تم آگئے اور مجھ سے ملاقات ہو گئی۔“ دوسرے دن مولوی رحیم بخش نماز عصر ادا کر رہے تھے کہ چوتھی رکعت کے سجدے میں جان جان آفریں کو دے دی۔ سعادت مندی بیٹے نے پدر بزرگ وار کو غسل دیا اور کفن و دفن کا انتظام کیا۔ چند روز وہاں مقیم رہے، پھر بگڑ تشریف لے گئے۔ وہاں مولانا غلام محی الدین بگڑی کے برادر صغیر مولانا احمد الدین بگڑی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور پھر تمام درسی کتابوں کی تکمیل انہی سے کی۔

۱۲۱۷ھ میں موضع بگڑ (ضلع سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ علم بیان و معانی میں مطول اور فقہ میں شرح و تالیف تک کتابیں اپنے بڑے بھائی مولانا غلام محی الدین بگڑی سے پڑھیں اور بعد ازاں انہی کی سمیت میں مزید حصولِ علم کے لیے دہلی گئے اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے استفادہ کیا، چودہ سال وہاں قیام فرما رہے اور علوم قرآن، حدیث و فقہ اور دیگر علوم مردوجہ کی تکمیل فرمائی۔ شاہ محمد اسحاق صاحب سند و اجازہ کا خیر حاصل کیا اور واپس وطن آکر مسند تدریس آراستہ کی۔ بے شمار لوگ ان سے مستفید ہوئے اور اپنے علاقے میں تبلیغِ اسلام اور اشاعتِ علم کا موثر ترین ذریعہ بنے۔ حضرت ممدوح بہت متقی اور بلند اخلاق عالم دین تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور عربی کے اچھے شاعر تھے۔ پنجاب کے اس نامور عالم و فقیہ نے ۱۳ شوال ۱۲۸۶ کو وفات پائی (تفصیل دیکھیے فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری، جلد اول ص ۸۸ تا ۹۰)

قلعہ میہاں سنگھ میں سکونت

موضع بگہ کے مولانا احمد الدین بگوی سے تحصیل علم کے بعد مولانا غلام رسول والپس اپنے گاؤں کوٹ بھوانید اس آگئے۔ اس سے قبل سردار میہاں سنگھ رحب کے نام سے قلعہ میہاں سنگھ کا قصبہ موسوم ہے، مولانا غلام رسول کے والد مولوی رحیم بخش سے علم حاصل کرتا رہا تھا۔ وہ مولانا کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد کو قلعہ میہاں سنگھ لے آیا تھا اور ان کے علم و فضل اور تہذیب و تقویٰ سے بہت متاثر تھا۔ بڑے بھائی کے ساتھ مولانا غلام رسول بھی ہیں، آگئے اور پھر اسی قصبے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انہوں نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور خطابت و امامت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں۔ یہاں آنے کے بعد ان کے علم و عرفان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور لوگ وسیع تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے جو ان سے علم بھی حاصل کرتے تھے اور تصوف و سلوک کا درس بھی لیتے تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے دور کے جید عالم، صاحب اتقا، صوفی و سالک اور عارف باللہ تھے۔

اخوند صاحب سوات سے ملاقات

مولانا غلام رسول پر اب یہ کیفیت طاری تھی کہ ہر آن محبت الہی میں سرشار اور مے توحید میں سرمست رہتے۔ جس طرف کسی مے کدہ معرفت کا پتا چلتا، اسی طرف دوڑ پڑتے۔ اس راہ کی مشکلات کو عبور کرنے میں وہ انتہائی خوشی محسوس کرتے اور مجاہدہ و ریاضت کی کٹھن منزلوں سے گزرنا ان کے لیے باعث مسرت ہوتا۔ انہیں معلوم ہوا کہ سوات میں ایک بزرگ کامل اخوند صاحب فرکوش ہیں بہت سے جو بیان حق ان کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ مولانا غلام رسول وہاں پہنچے اور اخوند صاحب سے ملے۔ مولانا فرماتے ہیں اخوند صاحب عابد و زاہد اور متقی تو ہیں، لیکن سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ وہاں انہیں اطمینان قلب حاصل نہیں ہوا، صرف دو دن ان کے ہاں ٹھہرے اور واپس چلے گئے۔^{۳۱}

سید امیر صاحب کی خدمت میں

واپسی پر علاقہ ہزارہ کے ایک مقام تربلیہ میں آئے تو ان کی ملاقات وہاں کے ایک ارباب (یعنی رئیس یا نمبردار) سے ہوئی۔ ارباب صاحب نے ان کو اپنا مہمان ٹھہرایا، گفتگو شروع ہوئی تو انھوں نے مولانا غلام رسول سے اس تکلیف وہ اور طویل و عریض سفر کا سبب دریافت کیا۔ مولانا نے جب تفصیل بیان کی تو ارباب صاحب نے ان کو سید امیر صاحب ساکن کوٹھا کا پستادیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی سید امیر صاحب کے مرید اور عقیدت مند ہیں اور کہا کہ وہ عبادت و زہد میں یکتا ہیں، علم و فضل کے زلیوے سے بھی آراستہ ہیں اور عامل کتاب و سنت بھی ہیں۔ ارباب صاحب نے سید امیر صاحب کی بہت تعریف کی۔ حضرت امیر صاحب کے بارے میں ارباب صاحب کی باتوں سے وہ اس درجے متاثر ہوئے کہ بڑی مشکل سے وہاں ایک رات گزار ہی۔ فجر کی نماز پڑھی اور عازم کوٹھا ہو گئے۔ سید امیر صاحب سے ملاقات ہوئی تو خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سلسلہ بیعت سے متعلق پوچھا تو امیر صاحب نے بتایا میں بیعت شدہ سید صاحب بریلوی مرشد مولوی اسماعیل صاحب شہید کا ہوں۔^{۱۴}

سید امیر صاحب کو حضرت سید احمد بریلوی سے فیض حاصل تھا اور بلاشبہ وہ بہت متقی اور پرہیزگار عالم تھے۔^{۱۵}

۱۴ سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۳۹

۱۵ اخوند سید امیر صاحب نے "ملا صاحب کوٹھا" کے نام سے شہرت پائی۔ کوٹھا تحصیل صوابی ضلع مردان کا ایک مشہور مقام ہے۔ سید امیر صاحب یہیں کے رہنے والے تھے اور سید احمد صاحب بریلوی کے مخلص ارادت مند تھے۔ بیعت اقامت شریعت کے بعد سید احمد بریلوی نے انھیں کوٹھا کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ کو ان کے نام باقاعدہ قضا نامہ جاری ہوا۔ سید صاحب سے تعلق ارادت کی بنا پر ملا صاحب گونا گوں مصائب و آلام کا ہدف بنے۔ ایک موقع پر انھیں "وہ بیت" سے متہم کیا گیا اور ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی، لیکن وہ اپنے

مولانا غلام رسول کو سید امیر صاحب نے سینے سے لگایا اور فرمایا تم روحانی اعتبار سے تعجب انگیز استعداد کے حامل ہو۔ تیری خوشی کی بھی کوئی انتہا نہیں اور میری خوشی کا بھی کوئی حساب نہیں۔ مجھے آج تک تیرے جیسا مشاق سنت نہیں ملا۔ الحمد للہ کہ اس نے تمہیں بدعتیوں اور بے راہ زولوگوں سے بچالیا۔

مولانا چند روز سید امیر صاحب کی خدمت میں رہے اور پھر واپس قلعہ مہاں سنگھ آگئے۔ اب ان کی دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ یادِ الہی اور اتباعِ سنت ان کا اصل مشغلہ قرار پا گیا تھا، جو طالب علم ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے انہیں بھی جواب دے دیا۔ قلب پر خوفِ خدا نے غلبہ حاصل کر لیا تھا اور زبان اس کے ذکر سے تر رہتی تھی۔

خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات

اس زمانے میں خواجہ سلیمان تونسوی کے تصوف و ریاضت کا بہت شہرہ تھا بلانا غلام رسول کے دل میں ان سے ملاقات کی خواہش نے کروٹ لی اور عازم تونسہ ہوئے۔ تونسہ سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں پہنچے تو سورج غروب ہو گیا اور وہیں رہ پڑے۔ اس گاؤں کی مسجد کے امام صاحب نیکی و تدین کے اوصاف سے متصف تھے۔ اور حدیث و فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں درک رکھتے تھے۔ وہ نہایت تکریم سے پیش آئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) موقف و مسلک پر قائم رہے۔ اکابر ہند میں سے دو بزرگوں کو ملا صاحب کرٹھا سے خاص تعلق پیدا ہوا، ایک مولانا غلام رسول قلعہ مہاں سنگھ کو اور ایک مولانا سید عبداللہ غزنوی کو۔ ملا صاحب مدوح کے زریزہ اولاد تھی۔ حقیقی بھانجے صاحب نے اوہ عبداللطیف کو خانہ داماد بنا لیا تھا۔ وہ بھی اجل عالم تھے۔ عالم جوانی میں انہیں شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کے صاحب زادے (یعنی ملا صاحب کے نواسے) صاحب نے ادہ نواب مرشد القیوم خاں تھے، جو اس ملک کی سیاست میں خاصے نامور ہوئے اور تعلیمی خدمات کے اعتبار سے "صوبہ سرحد کے سرسید" کہلائے۔

۱۶۰ حیاتِ مولوی غلام رسول ص ۴۰۔

اور مولانا کو کھانا کھلایا۔ اثنائے گفتگو میں جب انھیں تپا چلا کہ مولانا علم و فضل کی دولت سے بہرہ ور ہیں تو ان سے بعض مشکل علی مسائل دریافت کیے، مولانا نے جو جواب دیا، اس سے وہ متاثر ہوئے اور تسکینِ خاطر ہوئی۔ پھر پوچھا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

فرمایا ”خواجه سلیمان کے پاس تو نسے جا رہا ہوں۔“

بولے ”وہاں تو بدعات کا زور ہے، آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں، بہتر یہی ہے

کہ آپ وہاں نہ جائیں۔“

لیکن مولانا نہیں مانے اور وہاں جانے پر مصر رہے۔ اب امام صاحب نے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور اللہ سے دعا مانگی کہ:

”اے اللہ! اگر میں اپنے عقیدے میں سچا ہوں اور وہ شخص ایسا ہی ہے جیسا کہ میں جانتا ہوں تو مولوی غلام رسول کو اس کی ملاقات کا موقع نہ دے۔“

مولانا غلام رسول جب تو نسے پہنچے تو خواجه سلیمان صاحب وہاں موجود نہ تھے اور وہاں سے بہت دُور کہیں دورے پر تشریف لے گئے تھے۔

مولانا پھر اسی گاؤں میں اسی امام صاحب کے پاس آگئے اور خواجه صاحب سے ملاقات نہ ہونے کی اطلاع دی۔ امام صاحب یہ سن کر خوش ہوئے۔

اس سے کئی مہینے بعد پھر تو نسے گئے اور خواجه صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولانا نے ان کو فارسی نظم میں ایک طویل خط لکھ کر پیش کیا۔ یہ خط نہایت عمدہ ہے، اس میں بہترین الفاظ اور لہجہ اسلوبِ کلام میں نصیحتیں کی گئی ہیں اور دنیا کی ناپائیداری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔

مولانا فرماتے ہیں، یہ خط پڑھ کر خواجه سلیمان صاحب خوش ہوئے۔ ”لیکن میری اور ان کی نسبت نہ ملی، کیونکہ خواجه صاحب کی حالت موافق سنت نہ تھی،“ مولانا

ان کے بعض وظائف سے بھی اتفاق نہ کرتے تھے اور تصورِ شیخ کو بھی صحیح نہ سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں۔ ”میں ایسی باتوں کا سخت مخالف تھا۔“

مولانا غلام رسول خواجہ صاحب کے بارے میں یہ بھی فرماتے ہیں۔

”مجھ پر آپ نے بڑی مہربانی کی، اپنے مجربہ تعویذ اور وظائف سکھائے اور پلا سبیت ہونے کے مجھے اپنا خلیفہ ہونے کا لقب عطا فرمایا۔ چند روز مجھے وہاں ٹھہرایا۔ مجھ پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب تم کو مرید ہونے کی ضرورت نہیں تم خود لوگوں کو اپنا مرید بنایا کرو۔ بعد رخصت میں گھر آیا۔“

ایک مجذوب سے ملاقات

تونسہ سے مولانا غلام رسول قلعہ مہیان سنگھ آئے اور وہاں سے فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداسپور، مشرقی پنجاب) گئے۔ ان کی شادی فتح گڑھ چوڑیاں میں ہوئی تھی یہاں کے لوگوں نے انھیں بتایا کہ علاقہ تخت ہزارہ میں ایک گاؤں کا نام ”بچے“ ہے۔ وہاں ایک بزرگ رہتے ہیں جو حافظ قرآن اور باکمال ولی ہیں۔ فتح گڑھ چوڑیاں کے سب لوگ ان حافظ صاحب کے مرید تھے۔ مولانا غلام رسول وہاں سے موضع بچے پہنچے۔ یہ سفر انھوں نے پیدل طے کیا اور حافظ صاحب سے ملاقات کی۔ کئی دن حافظ صاحب کے ہاں مقیم رہے۔ حافظ صاحب نے ان سے فرمایا:

”میرے پاس براہ راست آپ کا کوئی حصہ نہیں۔ مگر ایک مجذوب کے طفیل میرے فیض کا کچھ حصہ آپ کو ملے گا۔“

حافظ صاحب نے اس مجذوب کے نام ایک خط لکھ کر مولانا کو دیا اور فرمایا:

”اس کا نام نامدا رقوم کا ماتھ ہے اور موضع گڑھی اعواناں میں ملک رحمت خاں کے گھر میں رہتا ہے۔ بڑا بھلا کہے گا، آپ بڑا نہ مانیں، میرا یہ خط ان کو دے دیں اور میری طرف سے اسلام علیکم کہہ دینا۔“

مولانا غلام رسول حافظ صاحب سے اجازت لے کر موضع اعواناں گئے۔ ان کے ساتھ ایک کشمیری طالب علم تھا جو ان سے علم معانی و بیان کی کتاب ”مطول“ پڑھتا تھا۔

۱۷۰۰ یہ تمام تفصیلات سوانح حیات مولوی غلام رسول میں درج ہیں۔ (دیکھئے صفحہ ۲۰ تا ۲۲)

اس گاؤں میں جا کر مجذوب کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ گاؤں سے باہر گئے ہیں اور جنگل میں بجا رگدھوں کو چرا ہے ہیں۔

مولانا اپنے کشمیری شاگرد کے ساتھ جنگل میں پہنچے اور مجذوب کے قریب گئے تو وہ مولانا سے مخاطب ہوا۔ یہ تیرا ساتھی شخص نسب کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے، اس کو میرے پاس بلاؤ، دُور چھوڑ کر میرے پاس آجاؤ۔ اس طالب علم کے بارے میں مجذوب نے کئی قسم کی باتیں کیں۔ مولانا طالب علم کو چھوڑ کر مجذوب کے پاس پہنچے تو حافظ صاحب کا خط پیش کیا اور ان کا سلام پہنچایا۔ اس نے اپنی گورڈی پہچانی، مولانا کو احترام کے ساتھ اس پر بٹھایا اور بہت عزت سے پیش آیا۔

مولانا کہتے ہیں اُس دن سے میرا شوق ریاضت و مجاہدہ روز بروز ترقی کرتا گیا، میری شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی اور کثرت سے لوگ میرے پاس آنے لگے۔ لیکن مجھے حضرت سید امیر صاحب کو بٹھا والے کا شوق ملاقات آرام نہیں لینے دیتا تھا۔ ان کی صحبت نہایت دلکش و دلآویز تھی اور اس کا کچھ اور ہی رنگ تھا۔

دوبارہ عزم کو ٹھٹھا

گڑھی اعواناں کے مجذوب سے ملاقات کے بعد مولانا اپنے گاؤں قلعہ مہیاں شگہ آئے اور اہل خانہ سے سید امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا عزم ظاہر کیا اور تیاری شروع کر دی۔ ان کے اعزہ و اقارب ان کے اس کثرت سے مختلف مقامات

۱۷۵۸ء اس مجذوب کی یہ عادت تھی کہ لوگ اپنے گدھوں سے سخت محنت کا کام لے کر بے کار اور کمزور کر کے چھوڑ دیتے تو یہ اس قسم کے تمام گدھوں کو اکٹھا کر کے جنگل میں لے جاتے اور محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے ان کو چرایا کرتے۔ جب یہ گدھے تندرست اور کام کے لائق ہو جاتے تو مالک ان کو اپنے گھروں میں لے جاتے اور دوسرے بے کار و لاغر گدھوں کو چھوڑ جاتے۔ پھر یہ مجذوب ان گدھوں کو چرانا شروع کر دیتے۔ دن بھر وہ یہی کام کرتے رہتے۔

(سوانح حیات مولوی غلام رسول ص ۲۵)

میں جانے پر تعجب و حیرت کا اظہار کرتے اور کہتے کہ ”یہ مجنون ہو گیا ہے یا اس کے پاؤں کو چکر آ گیا ہے یا آسیب زدہ ہے۔ یہ شخص کب حیات کی تلاش میں ہے“ مولانا فرماتے ہیں، اس قسم کے طعن و ملامت سے میرے شوق میں مزید اضافہ ہوتا اور میری آتش اشتیاق اور بھڑکتی مہر حال وہ اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے اور سید امیر صاحب کی خدمت میں دوبارہ کوٹھا پہنچے۔

مولانا عبداللہ غزنوی سے ملاقات

کوٹھا گئے ابھی دو ہی دن ہوئے تھے کہ حسن اتفاق سے مولانا عبداللہ غزنوی بھی وہاں پہنچ گئے اور مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی، جس نے آگے چل کر مضبوط روحانی تعلقات و روابط کی شکل اختیار کر لی۔ ان دونوں بزرگوں کے درمیان اس قدر محبت کا رشتہ استوار ہو گیا تھا کہ حضرت سید امیر صاحب اسے دیکھ کر انتہائی خوش ہوتے اور فرماتے کہ تم دونوں کے درمیان مجھے عجیب طرح کا نور اخوت گردش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور تمہیں دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں کی محبت میں ترقی دے۔

مولانا غلام رسول کا کوٹھے کا یہ دوسرا چکر تھا۔ وہ اس سے قبل جب پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے تو حضرت سید امیر صاحب کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی پہلی دفعہ تشریف لائے تھے، وہ بھی سید صاحب سے بیعت ہوئے اور ان کی بیعت کا مقصد محض سید امیر صاحب کے سلسلہ بیعت میں داخل ہونا تھا، ورنہ ان کو بیعت کی ضرورت نہ تھی۔

کوٹھا سے روانگی اور ایک مجزوبے ملاقات

مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی چند روز کوٹھا میں مقیم رہے۔ اس اثنا

۱۹ سوانح مولوی غلام رسول ص ۴۸ — مولانا عبداللہ غزنوی کے حالات کے لیے دیکھیے فقہائے

پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری “ جلد دوم ص ۱۳۷ تا ۲۱۹ -

میں دونوں کے درمیان گہرے قلبی اور روحانی روابط پیدا ہو چکے تھے۔ دونوں کو ٹھاسے قلعہ میہاں سنگھ کو روانہ ہوئے۔ جب گجرات کے قریب پہنچے تو مولانا عبداللہ غزنوی ایک مقام پر رُکے اور فرمایا مجھے یہاں ایک ایسے مجذوب کی خوشبو آرہی ہے جو ملاقات کے قابل ہے۔

یہاں یہ واقعہ لائقِ تذکرہ ہے کہ کوٹھاسے روانگی کے بعد دورانِ سفر میں دونوں بزرگوں نے کتبِ حدیث پڑھنے کا ارادہ کر لیا تھا اور یہ بات بھی دونوں میں طے پا چکی تھی کہ دہلی جا کر حدیث کی تعلیم حاصل کی جائے گی۔ اسی خیال کو دل میں لیے ہوئے مجذوب کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مجذوب کا نام جنگو شاہ تھا۔ اس سے یہ حضرات پوچھنا چاہتے تھے کہ حدیث کہاں جا کر پڑھی جائے۔

جب یہ مجذوب کی طرف روانہ ہوئے تو اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا دیکھو ”دو ایسے شخص آرہے ہیں جو عمل و اخلاق کے اعتبار سے محمدی نمونہ ہیں، ان کے آنے سے پہلے جلدی سے مجھے کپڑا پہنا دو اور ان کے لیے فرش بچھا دو“ جب یہ اس مجذوب کے قریب آئے تو اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور احترام سے اپنے پاس بٹھایا۔ پھر دہلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”جنت اس طرف ہے“ اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ حیران تھے کہ یہ مجذوب کبھی کسی سے مخاطب نہیں ہوا، مگر آج ان بزرگوں سے باتیں کر رہا ہے۔ مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول مجذوب کی مجلس سے اٹھ کر واپس آنے لگے تو اس نے کہا ”باس دیکھ کر یہ بھول جانا، وہ شخص مسکین صورت ہے اور اس کا نام سید نذیر حسین ہے، اس سے پڑھنا۔“

وہاں سے چل کر یہ بزرگ قلعہ میہاں سنگھ پہنچے۔ مولانا عبداللہ غزنوی نے فرمایا: مجھے اللہ کی طرف سے القا ہوا ہے کہ میں چند مہینوں کے بعد حدیث پڑھنے دہلی جاؤں۔

مولانا غلام رسول کو سید امیر صاحب نے فی الحال لاہور جا کر قیام پذیر ہونے اور وہاں وعظ و ارشاد کا سلسلہ جاری کرنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ دونوں قلعہ میاں سنگھ سے لاہور آگئے، چند روز وہاں قیام کیا، پھر امرتسر چلے گئے اور وہاں باغ والی مسجد میں حافظ محمود صاحب کے ہاں مقیم ہوئے۔ حافظ صاحب نے مولانا عبداللہ غزنوی کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔

لاہور میں قیام اور سلسلہ وعظ و ارشاد

مولانا غلام رسول کچھ دن امرتسر رہے اور پھر لاہور آگئے۔ لاہور میں انہوں نے مسجد چینیاں والی میں قیام کیا اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ ان کا وعظ نہایت عمدہ اور موثر ہوتا تھا۔ ہر بات سامعین کے دلوں میں اترتی جاتی تھی۔ وعظ میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی شرکت کرتے اور ان کے ارشادات سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ بہت سے غیر مسلم وعظ کے دوران ہی میں اسلام قبول کر لیتے اور آگے چل کر تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنتے۔ اس طرح بے شمار لوگ ان کے وعظ سے مسلمان ہوئے، اور بہت سے افراد کی زندگیاں اسلام کے قالب میں ڈھلیں۔

مولانا غلام رسول میں یہ خوبی تھی کہ اگر کسی جگہ کے لوگ ان کے وعظ سے متاثر نہ ہوتے یا دوران وعظ مخالفت پر اتر آتے تو بالکل نہ گھبراتے، نہ بددل ہوتے بلکہ اپنا سلسلہ ارشاد جاری رکھتے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وعظ اور تبلیغ کا کام اپنی بات پورے اخلاص اور کوشش سے لوگوں کے کانوں تک پہنچانا ہے، کسی کو ماننے پر مجبور کرنا اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ بعض لوگ انبیاء علیہم السلام کی بات نہیں مانتے تھے، حالانکہ وہ مبعوث من اللہ تھے۔ ہم لوگوں کی بات اگر کوئی نہیں مانتا تو افسوس و ملال کی ضرورت نہیں۔

ان کے وعظ میں عوام و خواص اور علماء و طلباء کثیر تعداد میں شریک ہوتے اور ان کے ارشادات عالیہ سے فیض حاصل کرتے۔ بعض لوگ اعتراض و بحث کی غرض سے آتے اور اثر پذیر ہو کر واپس جاتے۔ ان کا انداز کلام نہایت شیریں اور پیارا

تھا۔ وعظ میں قرآن کی آیات تلاوت کرتے، احادیث رسول پڑھتے، ائمہ کے اقوال بیان کرتے اور اشعار سناتے، جس سے سامعین محفوظ بھی ہوتے اور متاثر بھی۔ جو بات ان کی زبان سے نکلتی، وہ ان کے دل کی آواز تھی۔ وہ جب وعظ میں دوزخ، جنت اور قیامت کا ذکر کرتے تو سامعین پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی کہ گویا وہ ان تمام مقامات کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ اس سے ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے اور ان کی اثر پذیری کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔

طلبِ حدیث کے لیے عزمِ دہلی

کچھ عرصہ مولانا غلام رسول نے لاہور میں قیام کیا اور وعظ و نصیحت کو اپنا مشغلہ قرار دے رکھا۔ ان کے مواعظ و نصائح سے نہایت اچھے اثرات مرتب ہوئے اور بے شمار لوگوں نے مسابلی دین سیکھے اور اسلام قبول کیا۔ پھر لاہور سے امرتسر گئے اور باغ والی مسجد میں حافظ محمود صاحب کے پاس ٹھہرے۔ امرتسر میں بھی وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا عبداللہ غزنوی کے ساتھ تحصیل علم حدیث کے لیے عازمِ دہلی ہوئے۔ امرتسر سے دہلی تک کا سفر بذریعہ یکہ آٹھ دن میں طے کیا۔ ان دنوں حضرت سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی وہاں درس حدیث دیتے تھے، مولانا غلام رسول بھی ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور کتب حدیث پڑھنا شروع کیے۔ مولانا عبداللہ غزنوی بھی ان کے شریکِ درس تھے۔ حضرت میاں صاحب سے مولانا غلام رسول نے سند حدیث حاصل کی۔

مولانا غلام رسول کے وعظ کی شہرت دہلی تک جا پہنچی تھی۔ جب وہاں کے لوگوں کو ان کی دہلی میں آمد کی اطلاع ہوئی تو وعظ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ایک دن لال قلعے سے ایک مغل شہزادہ بھی حضرت میاں نذیر حسین کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی صاحب کو وعظ کے لیے قلعے میں بھیجا جائے، چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی اور لال قلعے میں مولانا نے وعظ کیا، جس میں خود سید نذیر حسین

نے بھی شرکت فرمائی۔ اور بھی بہت سے حضرات مولانا کا وعظ سننے کے لیے قلعہ میں گئے۔
وعظ نہایت موثر اور دلنشین تھا۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی

مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی ابھی دہلی میں حضرت میاں صاحب کے
حلقہ مدرسہ میں تھے کہ ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ (۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) کو جنگ آزادی
شروع ہو گئی، فتح کے بعد جسے انگریزوں نے "غزڑ" کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا
آغاز میرٹھ سے ہوا، پھر یہ جنگ دہلی پہنچی اور اس کے بعد بہت جلد ہی پورے
ہندوستان میں پھیل گئی۔ دہلی شہر اس زمانے میں انتہائی بد امنی کی لپیٹ میں تھا اور
چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں جس مسجد میں مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول
علم حدیث حاصل کرنے کے لیے اقامت گزریں تھے، وہاں مسلسل بندوق کی گولیاں آ کر
گرتیں اور مہیب آوازیں آتی تھیں، اس پر مولانا عبداللہ غزنوی جو مولانا غلام رسول
کو عبداللہ کہہ کر پکارتے تھے، ان سے حیرانی سے پوچھتے: "عبداللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟"
یہ نہایت اضطراب اور گھبراہٹ کا زمانہ تھا، ہر شخص اپنی جان کی فکر میں تھا، کسی
دوسرے کی خبر نہ تھی۔ مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ غزنوی اس وحشت ناک
دور میں بھی نہایت اطمینان اور سکون کے عالم میں تھے اور حصول علم حدیث ہی ان کا
اصل مشغلہ تھا۔ کسی اور طرف قطعاً ان کی توجہ نہ تھی۔

ایک انگریز عورت کی امداد

ایک دن مولانا عبداللہ غزنوی نے مولانا غلام رسول سے کہا: میں نے خواب دیکھا
ہے کہ تم پر بلائے آسمانی نازل ہو رہی ہے، لہذا یہاں رہنے کی نسبت تمہارا اپنے
گھر چلے جانا زیادہ بہتر ہے۔ جب سے میں نے یہ خواب دیکھا ہے، تمہاری طرف
سے بہت مضطرب ہوں۔

مولانا غلام رسول فرماتے ہیں کہ مولانا عبداللہ غزنوی مجھے بار بار گھر جانے کے لیے
کہتے اور اس پر اصرار کرتے تھے۔ میں انہیں جواب میں کہتا کہ اگر آپ مجھے واقعی مبتلائے مصیبت

ہونے والا دیکھتے ہیں تو مجھ سے ایسی باتیں کریں، جن سے مجھے تسکین قلب اور اطمینان حاصل ہو، نہ کہ مزید گھبراہٹ میں ڈالنے کی کوشش فرمائیں۔ لیکن مولانا عبداللہ برابر اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ بالآخر ان کے بے حد اصرار پر وہ دہلی سے وطن جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

مولانا عبداللہ غزنوی ان کو رخصت کرنے کے لیے میاں سید نذیر حسین کے مد سے لاہوری دروازے کے باہر شاہدہ تک ان کے ساتھ گئے۔ وہاں کھڑے دونوں بزرگ الوداعی باتیں کر رہے تھے کہ سامنے ایک انگریز عورت پر نظر پڑی جو سخت زخمی حالت میں تھی اور پیاس سے بک رہی تھی، مگر کوئی اُسے پانی نہ پلاتا تھا۔ انسانی سہمدی کے پیش نظر یہ دونوں بزرگ اس عورت کے پاس آئے اور کہیں سے پانی لا کر اُسے پلایا۔ اس وقت مولانا غلام رسول نے ایک عجیب فقرہ کہا جو بعد میں پیش آنے والے حالات کی روشنی میں الہامی ثابت ہوا۔ انہوں نے فرمایا :

”خبر نہیں، کب تک یہ ہندوستان غلامی میں رہے، کیوں کہ لوگ بچوں اور عورتوں پر ظلم کرنے لگ گئے ہیں جو اسلامی قانون کے خلاف ہے۔“

اس سے ٹھیک نوے سال بعد (۱۹۳۷ء تک) یہ بڑے صغیر انگریزوں کا غلام رہا۔ اس کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے نام سے دو مملکتیں معرض قیام میں آئیں۔ ۱۸۵۷ء کا دور کچھ ایسا ہنگامہ خیز تھا کہ کسی انگریز سے اظہارِ سہمدی کرنا اپنے آپ کو مصیبت کے منہ میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اگرچہ وہ انگریز بوڑھا ہو، مظلوم ہو، بیچارہ ہو، مرد ہو، عورت ہو، بچہ ہو، کوئی ہو، اُس کی امداد کرنا نہایت مشکل تھا۔ حالانکہ اسلام کی رو سے ایسے لوگوں کی امداد کرنا اور ان کو ظلم و زیادتی سے بچانا ضروری ہے۔ مولانا غلام رسول اور مولانا عبداللہ نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس انگریز عورت کی مدد کی۔ اس کو کسی صورت میں مردانہ لباس پہنایا اور

۲۲۷ سوانح حیات مولوی غلام رسول، ص ۵۹ :

مسجد کے حجرے میں آئے۔ رات کو کچھ لوگوں کو شبہ ہوا تو وہ مسجد میں تلاشی کے لیے آئے انہوں نے ان لوگوں کو بتایا کہ کوئی مسافر مر رہا ہے جو حجرے میں لیٹا ہوا ہے۔ اس پر وہ لوگ واپس چلے گئے۔

مولانا غلام رسول نے اب وطن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس عورت کے علاج اور خدمت میں مصروف ہو گئے۔ چند روز میں وہ صحت یاب ہو گئی تو پتا چلا کہ وہ ایک انگریز کرنل کی بیوی ہے۔ اسے کسی طرح اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔ اب عورت نے مولانا غلام رسول کو اپنی طرف سے خط لکھ کر دینا چاہا کہ اگر کسی وقت ضرورت پڑے تو اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے لیکن مولانا نے خط لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ہم نے یہ کام صرف رضائے الہی اور انسانی ہمدردی کے لیے کیا ہے، اللہ ہی اس کا صلہ دے گا۔ اس عورت نے یہ بھی کہا کہ ممکن ہے ہندوستانیوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو جائے، اس صورت میں یہ خط آپ کے کام آئے گا اور اگر انگریزی حکومت سے کسی نے آپ کی شکایت کی تو یہی متعلقہ لوگوں کو یہ خط دکھایا جاسکتا ہے لیکن مولانا نہیں مانے، فرمایا ہم درویش آدمی ہیں، کوئی ہماری شکایت کیوں کرے گا اور ہمیں تکلیف پہنچا کر اسے کیا لے گا۔

وطن کو روانگی اور وارنٹ گرفتاری

اس انگریز عورت کی صحت یابی کے بعد اسے گھر پہنچایا اور پھر اس سے کئی دن بعد وطن کو روانہ ہوئے۔ اس اثنا میں کسی نے حکومت سے شکایت کر دی کہ ”انگریزوں کے خلاف جو کچھ ہوا ہے اس میں مولوی غلام رسول قلعہ مہاں سنگھ والے کا بھی ہاتھ ہے اور یہ اس زمانے میں دہلی میں مقیم تھے اور انگریزی حکومت کے خلاف سازش میں شریک تھے۔“ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں نے بغاوت کو کچل دیا تھا اور ہندوستانیوں کو وسیع پیمانے پر گرفتار کر کے انہیں سنگین سزائیں دی جا رہی تھیں۔ جگہ جگہ لاشیاں نصب تھیں اور جس پر کوئی ذرا سا شبہ ہوتا اسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ مولویوں سے حکومت بالخصوص بدظن تھی اور جن مولویوں پر وہابی

کے لفظ کا اطلاق ہوتا تھا، انہیں بہت زیادہ ہدفِ ستہ ٹھہرایا جاتا تھا، اتفاق سے مولانا غلام رسول اسی زمرے میں شامل تھے اور انہیں وہابی کہا جاتا تھا۔ انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے بے شمار ہندوستانی اور بہت سے علمائے کرام گرفتار کیے جا چکے تھے۔ مولانا غلام رسول کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے۔ وہ دہلی سے چلے اور ادھر ادھر کے چکر کاٹتے ہوئے امرتسر پہنچے۔ دو دن حافظ محمود کے پاس باغ والی مسجد میں رہے۔ وہیں انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی گرفتاری کے لیے حکومت نے اشتہار جاری کر دیا ہے یعنی پولیس کی اصطلاح میں انہیں "اشتہاری مجرم قرار دے دیا گیا ہے۔ امرتسر میں دو دن قیام کے بعد اپنے سسرال فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداسپور) گئے۔ ان کے سسر مولوی عبدالحق زندہ تھے اور مولانا کی گرفتاری سے متعلق اشتہار کا واقعہ ان کے علم میں آچکا تھا۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ حکومت کے جاسوس اور ملازم ان کے رشتے داروں اور واقفوں کے گھروں میں جا جا کر ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امرتسر کا ڈپٹی کمشنر انگریز تھا جو اس قدر بدحواس ہو گیا تھا کہ جس شخص کے بارے میں فساد میں طوٹ ہونے کی ذرا سی بھنگ اس کے کان میں پڑتی اُسے بلا تحقیق گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیتا تھا۔ مولوی عبدالحق اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے اور تمام دن دروازے پر بیٹھے رہتے تاکہ کسی کو تپانہ چل جائے کہ مولانا غلام رسول ان کے گھر میں موجود ہیں۔

فتح گڑھ چوڑیاں کا ایک مشہور رئیس دیوان ترنجن داس تھا۔ وہاں کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے، سرکار دربار میں بھی اچھی حیثیت رکھتا تھا اور حسنِ اتفاق سے مولوی عبدالحق کا شاگرد تھا اور ان کو انتہائی لائقِ احترام گردانتا تھا۔ ایک دن کچھ سرکاری لوگ دیوان ترنجن داس کے پاس پہنچے، اس کو مولانا غلام رسول کے وارنٹ گرفتاری دکھائے اور ان کی گرفتاری کے لیے اس سے طالبِ امداد ہونے۔ دیوان حسبِ نے خفیہ طور پر اس کی اطلاع مولوی عبدالحق کو دی اور پیغام بھجوایا کہ اگر مولانا غلام رسول یہیں ہیں تو ان کو علی الصبح ان کے وطن (قلند مہیاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ) روانہ کر دیں، ان کا

اپنے غلاتے میں چلے جانا ہی مناسب ہے۔ ایک تو اس لیے کہ وہاں کے لوگ ان کے حالات و معاملات سے ہماری نسبت زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور خطرے کی صورت میں وہ ان کی اچھے طریقے سے مدد کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے وہاں کوئی ایسا حاکم ہو جو محض شیعہ کی بنا پر پکڑنا مناسب نہ سمجھتا ہو، لوگوں کی شہادتیں اور بیان لینا بھی ضروری قرار دیتا ہو اور اسی کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا عادی ہو۔

دیوان نرنجن داس کی یہ بات بالکل صحیح اور ہمدردانہ تھی، چنانچہ مولانا فتح گڑھ چوڑیاں سے چلے اور اپنے وطن قلعہ مہیاں سنگھ پہنچ گئے۔

گرفتاری

یہاں ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد سکونت پذیر تھے۔ انھوں نے مولانا کو باہر نہ نکلنے اور گھر ہی میں چھپے رہنے کا مشورہ دیا۔ مولانا نے فرمایا چھپ چھپا کر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ میں اللہ کی رضا اور قضا پر راضی ہوں۔ حاکم وقت آخر میرا بیان بھی تو لے گا اور معاملے کی تحقیق بھی کرے گا۔ توں ہی کسی کی شکایت پر تو پھانسی نہیں دے دے گا۔ آپ مجھے باہر نکلنے سے منع نہ کریں۔^{۲۳}

مولانا کا یہ جواب سن کر حکیم صاحب مسجد میں چلے گئے۔ دیکھا تو مسجد میں ایک نووارد مسافر بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب نے اسے اجنبی سمجھ کر کھانے کے متعلق پوچھا، اس نے انکار کیا اور کھانا نہیں کھایا۔ اس کی شکل و شبابت سے حکیم صاحب کو شبہ ہوا کہ یہ کوئی انگریز ہے جو بھیس بدل کر اور دیسی لباس پہن کر یہاں آیا ہے۔ وہ اسی وقت گھر گئے اور مولانا کو اس نووارد کے بارے میں بتایا۔ وہ نمازِ ظہر کا وقت تھا۔ مولانا نماز کے لیے مسجد میں آئے تو وہ شخص ان کو دیکھتے ہی باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد پولیس کپتان اور اس کے ساتھ بہت سے پولیس والے مسجد میں آگئے، وہ نووارد مسافر بھی ان کے ساتھ تھا۔ آتے ہی مولانا کو گرفتار کر لیا اور انھیں پکڑ کر لاہور کو روانہ ہو گئے۔

اس پر گاؤں میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور لوگوں نے پولیس والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور اندیشہ تھا کہ پولیس تمام گاؤں کے لوگوں پر سختی کا برتاؤ کھے گی۔ مولانا نے جو پولیس کی حراست میں تھے بلند آواز سے لوگوں سے کہا کہ وہ پولیس کی کارروائی میں مزاحم نہ ہوں، اس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں، سب لوگ آرام سے اپنے گھروں کو چلے جائیں، اگر مزاحمت کی گئی تو آپ لوگوں کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا اور خود میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی اگر امن وامان قائم رہا تو میں انشاء اللہ جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ مولانا کی یہ باتیں سن کر لوگ پیچھے ہٹ گئے اور پولیس مولانا کو پکڑ کر لاہور کو روانہ ہو گئی۔ اس وقت تین آدمی ان کے ساتھ تھے۔ بڑے مہیائی حکیم غلام محمد، پھوپھی زاد بھائی مولوی بدرالدین اور گوجرانوالہ کے مولوی علاء الدین جوان کے شاگرد تھے۔

یہاں سنگھ کی بہو کا نام ”سکھدیٹی“ تھا۔ خود سکھدیٹی اور اس کے خاندان کے لوگ مولانا کی بے حد تکریم کرتے تھے۔ یہ مولانا کی گرفتاری سے بہت پریشان ہوئی۔ اس زمانے میں امین آباد ضلع گوجرانوالہ کا دیوان جو الاسہا مہاراجہ جموں کشمیر کا وزیر تھا۔ وہ اتفاقاً چند روز پیشتر جموں سے امین آباد آیا تھا اور پولیس اور فوج کے کچھ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ سکھدیٹی نے اس کو مولانا کی گرفتاری کی اطلاع دی اور ان کی رہائی کے لیے کوشش کرنے کو کہا۔ وہ بھی مولانا کا بہت احترام کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے کوشش کر کے مولانا کو اور اس پولیس کو جس نے انہیں گرفتار کیا تھا۔ اپنے ہاں امین آباد بلا لیا اور پولیس سے کہا کہ مولانا کا تعلق چوں کہ گوجرانوالہ سے ہے اور اسی علاقے میں انہیں گرفتار کیا گیا ہے لہذا ان پر گوجرانوالہ ہی میں مقدمہ چلایا جائے، لاہور یا کسی دوسری جگہ نہیں لے جایا جائے۔ اب پولیس والے مولانا کو دیوان جو الاسہا کے پاس چھوڑ گئے اور دیوان صاحب مولانا کو گوجرانوالہ لے گئے۔ دیوان صاحب کا مقصد یہ تھا کہ گوجرانوالہ کے لوگ مولانا کو جانتے اور قابل احترام گردانتے ہیں، اس لیے ضلعی حکام ان سے کسی قسم کی سختی کا برتاؤ نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ گوجرانوالہ کی ضلعی انتظامیہ نے مولانا کو لاہور پہنچا دیا اور

کہا کہ ریس فنانشل کمشنر منگمری کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہی اس کی سماعت کریں گے۔
اللہ کی ضمانت پر رہائی

لاہور میں ان کو فنانشل کمشنر منگمری کی عدالت میں پیش کیا گیا، وہ انہیں دیکھ کر نہایت متاثر ہوا اور کرسی پر بٹھایا۔ بیان لینے کے بعد حسب قاعدہ انہیں حوالہ میں بھیج دیا گیا۔ لاہور ان کے لیے کوئی اجنبی شہر نہ تھا۔ یہاں کے بے شمار لوگ ان کے حلقہ عقیدت میں شامل تھے انہیں گرفتاری کا پتا چلا تو فنانشل کمشنر صاحب کے دفتر کے سامنے آ بیٹھے فنانشل کمشنر کو مختلف ذرائع سے مولانا کی شخصیت کا علم ہوا تو انہیں دوبارہ عدالت میں طلب کیا اور کہا۔

”آپ کا کوئی ضمانت ہے تاکہ آپ کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔“

فرمایا ”ہاں۔“

پوچھا ”کون؟“

آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر جواب دیا ”میرا ضمانت اللہ تعالیٰ ہے۔“
اس پرسل خواں اور دیگر اہل کار جو وہاں موجود تھے، مسکرائے، لیکن فنانشل کمشنر کے دل پر اس کا بے حد اثر ہوا، اور کہا۔

”اچھا تو ہم آپ کو اسبی کی ضمانت پر رہا کرتے ہیں۔“ اس کے بعد انہیں رہا کر دیا۔
دوبارہ نظر بندی اور وعظ کی بندش

۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ نہایت نازک اور پر آشوب تھا۔ انگریزی حکومت اس قدر حساس ہو گئی تھی کہ ذرا سی شکایت اور شبہ پر بڑے سے بڑے آدمی کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیتی تھی۔ علمائے کرام کو بالخصوص نشانہ ستم بنایا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ ملک میں بغاوت پھیلانے کا ذمے دار یہی گروہ ہے۔ مولانا غلام رسول کے بارے میں بھی بعض لوگوں نے حکومت کے کان بھرنے شروع کر دیے اور کہا گیا کہ یہ شخص وہابی ہے اور انگریزی حکومت کا مخالف ہے۔ اس وقت وہابی اور باغی کے ایک ہی معنی لیے جاتے تھے۔ چنانچہ مولانا کو ان کے گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا۔ کافی عرصہ نظر بند رہے۔

کہیں جانے کی اجازت تھی نہ وعظ و نصیحت کی۔
اس کے بعد حالات معمول پر آئے تو نظر بندی بھی ختم کر دی گئی اور وعظ و نصیحت
کی اجازت بھی دے دی گئی۔

حج بیت اللہ اور سند علم حدیث
جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، مولانا عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول علم حدیث پڑھنے کے
لیے میاں سید نذیر حسین کی خدمت میں دہلی گئے تو ان کے قیام دہلی ہی کے زمانے
میں رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ (مئی ۱۸۵۷ء) میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت
ہو گئی تھی جس میں ہندوستان کی تمام قوموں نے حصہ لیا تھا۔ مولانا غلام رسول کو حضرت
میاں صاحب نے جو سند عطا کی اس میں مرقوم ہے کہ انہوں نے ۱۲۷۳ھ میں ان سے
کچھ حصہ صحیح بخاری کا اور صحیح مسلم کا مقدمہ پڑھا۔ لکھا ہے کہ مولوی عبداللہ المعروف
غلام رسول نہایت ذہین و طباع بے حد نیک اور بلند اخلاق و عالی کردار شخص ہیں۔
میاں صاحب نے ان کو صحاح ستہ اور تمام کتب حدیث پڑھانے کی اجازت دی
اور تلقین فرمائی۔ یہ سہ ماہ ربیع الثانی ۱۲۷۹ھ کو تحریر فرمائی گئی، یعنی سالِ تعلیم
سے چھ سال بعد اس کا اجرا ہوا۔

اس سے تقریباً دس سال بعد ۱۲۸۸ھ کو مولانا غلام رسول حج بیت اللہ کے لیے
روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ میں مولانا عبدالغنی مجددی کا سلسلہ درس
جاری تھا جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں اقامت گزریں ہو گئے
تھے۔ حضرت میاں نذیر حسین کی طرح مولانا عبدالغنی مجددی بھی حضرت مولانا شہ
محمد اسحاق دہلوی کے شاگرد تھے اور ہندوستان اور دیار عرب کے بے شمار علماء
طلباء نے ان سے استفادہ کیا اور علم حدیث پڑھا تھا۔ مولانا غلام رسول نے بھی
مدینہ منورہ جا کر ان سے تفسیر حدیث اور دیگر علوم متداولہ کی سند حاصل کی۔^{۷۵}

^{۷۵} میاں سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبدالغنی مجددی کی یہ دونوں اسناد (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

حج بیت اللہ کو روانگی کے وقت مولانا غلام رسول کی عمر ۵۶ برس کی تھی۔ پانچ افراد اور تھے جو ان کے ہم رکاب تھے۔ اور یہ کل چھ افراد کا قافلہ تھا جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔

۱۔ خود مولانا غلام رسول۔

۲۔ ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد۔

۳۔ بڑی صاحب زادی۔

۴۔ مولانا کے داماد مولوی محمد عثمان۔

۵۔ ایک طالب علم محمد قاسم۔

۶۔ چودھری حاکم سکند لہیوالہ و ڈرائیج ضلع گوجرانوالہ۔

چودھری حاکم جہاز ہی میں بیمار پڑ گئے تھے، دس دن بیمار سے اور جہاز ہی میں وفات پا گئے۔ ان کے ایام بیماری میں مولانا غلام رسول نے ان کی بہت خدمت کی۔ وفات کے وقت انہوں نے اپنا تمام سامان مولانا کے سپرد کر دیا تھا اور اختیار دے دیا تھا کہ جسے چاہیں اللہ کی راہ میں دے دیں۔ لیکن مولانا ان کا سامان واپس لائے اور ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیا۔

اپنے وطن سے چل کر مولانا اور ان کے ساتھی پہلے مکہ معظمہ گئے اور سعادت حج حاصل کی، بعد کو عازم مدینہ منورہ ہوئے۔ وعظ و نصیحت کا سلسلہ جہاز میں بھی جاری رہا اور حرمین شریفین میں بھی۔ بلکہ حرمین شریفین میں اس میں اور تیزی آئی تھی۔ سلسلہ تدریس اور چند شاگرد

مولانا غلام رسول تفسیر حدیث، فقہ اور منطق و فلسفہ وغیرہ تمام علوم مرتوجہ میں کامل دست گاہ رکھتے تھے اور قلعہ میہاں سنگھ میں ان کا باقاعدہ سلسلہ تدریس جاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) جو انہوں نے مولانا غلام رسول کو دیں، سوانح حیات مولانا غلام رسول کے صفحہ ۳۵، ۳۶، اور ۳۷ پر درج ہیں۔

تھا۔ جس سے لے کر تیس ایسے طالب علم ہمیشہ ان کے درس میں موجود رہتے جن کا تعلق گاؤں سے باہر کے علاقوں اور دور کے قصبات و دیہات سے تھا۔ ان طلباء کی کفالت خود مولانا ہی کرتے اور ان کے خورد و نوش کے تمام انتظامات انہی کے ہتھے رہتے۔ مقامی لوگ اور قرب و جوار کے بھی بہت سے حضرات ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں نے اپنے علاقوں میں بہت کام کیا۔ ہمیشہ خدمتِ علم میں مصروف رہے اور اپنے دور کی اہم شخصیتوں میں ان کا شمار ہوا۔ مولانا کے سوانح نگار نے ان کے متعدد تلامذہ اور فیض یافتگان میں سے مختلف علاقوں کے بائیس افراد کی ایک فہرست درج کی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کے نام انہیں یاد رہ گئے ہیں اور جو علم و عمل میں خاص شہرت کے حامل ہیں۔

- (۱) مولانا علاء الدین گوجرانوالہ (۲) مولوی محمد عظیم اللہ موضع برہن ضلع میرپور (۳) مولوی محمد عثمان سکۃ فتح گڑھ چوڑیاں ضلع گورداسپور (۴) مولوی محمد موضع بکن ضلع گوجرانوالہ (۵) مولوی قطب الدین ضلع فیروزپور (۶) مولوی محمد علی میر و اعظ سکۃ بوہڑ ، ضلع گوجرانوالہ (۷) مولوی محمود شاہ و اعظ سکۃ ٹوہنڈہ ضلع بہارہ (۸) مولوی بدر الدین سیالکوٹ (۹) مولوی بدر الدین ساکن گلوالہ ضلع گوجرانوالہ (۱۰) مولوی احمد علی کوٹ بھوانیداس ضلع گوجرانوالہ (۱۱) مولوی شمس الدین جموں کشمیر (۱۲) حافظ کرم الدین جموں کشمیر (۱۳) حافظ ولی اللہ لاہور (۱۴) مولوی عبدالعزیز ناظم انجمن اہل حدیث لاہور و بانی انجمن حمایت اسلام لاہور (۱۵) حافظ گوہر دین سکۃ نوکھر ضلع گوجرانوالہ (۱۶) حافظ غلام محمد سداکبہ ضلع شاہ پور (۱۷) مولوی بربان الدین جہلم (۱۸) مولوی محمد لغمان جہلم (۱۹) مولوی نذر احمد سکۃ کمانی ضلع جہلم (۲۰) مولوی نذر احمد چنیوٹ (۲۱) مولوی غلام حسین سکۃ ساہو والا چیمہ ضلع سیالکوٹ (۲۲) مولوی عمر الدین گوجرہ ضلع لائل پور۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بزرگ تھے جو مولانا غلام رسول سے مستفید ہوئے اور جنہوں نے اپنے عہد اور علاقے میں دینی و علمی خدمات انجام دیں اور عمل و کردار کی وہ روشنی پھیلائی جو عالی قدر اساتذہ کے فیضِ صحبت سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔

نقطہ نظر کی اصابت

اختلافی اور نزاعی مسائل کے اظہار و تبیین میں مولانا کا نقطہ نظر انتہائی اصابت فکر کا عکاس اور ذہنی سلجھاؤ کا عراز تھا۔ بعض لوگ دورانِ درس یا اتھنائے وعظ میں ان سے اس انداز سے اختلافی مسائل پوچھتے کہ جس سے ان کا مقصد دو فرقوں میں باہم تصادم پیدا کرنا اور ایک دوسرے سے الجھانا ہونا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قابلیت اور صحتِ دماغی سے نوازا تھا کہ مسائل کو ایسا جواب دیتے جس سے وہ قطعاً خاموش ہو جاتا اور اپنے مقصدِ فساد و شر میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ ایک مرتبہ وعظ کہہ رہے تھے کہ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ مقلد اور غیر مقلد کے بارے میں فرمایا ہے کہ دونوں میں حق پر کون ہے؟

مولانا نے اس کا نہایت عمدہ جواب دیا۔ فرمایا: یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے اس کی مثال ایک ایسے تالاب کی ہے، جس سے پانی کی چار نالیاں نکلتی ہیں، جو شخص جس نالی سے بھی پانی پیئے گا وہ تالاب ہی کا پانی ہوگا اور جو شخص براہِ راست تالاب سے پیئے گا وہ بھی وہی پانی ہوگا۔ یہی حال مقلد اور غیر مقلد کا ہے کسی نے بعض مسائل میں براہِ راست حدیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عمل کر لیا اور کسی نے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی وساطت سے عمل کر لیا، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ دل کی تہہ میں یہ حقیقت راسخ رہنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کے مقابلے میں کسی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ائمہ مجتہدین کا بھی یہ فرمان ہے کہ آنحضرت کے ارشاد و عمل سے ان کا قول یا فعل متصادم ہو تو اس کو بالکل زمانا جائے۔ مولانا نے فرمایا، فقہی مسائل بیان کرتے وقت لوگوں میں تفریق پیدا کرنی اور ناحق کسی کی تکفیر کرنی بہت بڑی معصیت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ جب حضرت موسیٰ تورات لینے کے لیے اللہ کے حکم سے کوہ طور پر گئے تو بعد میں بنی اسرائیل نے سامری کی مٹھارت میں اکڑ بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت موسیٰ واپس آئے تو صورت حال دیکھ کر

صحابی پر خفگی کا اظہار کیا۔ حضرت ہارون نے جواب دیا کہ میں نے اس لیے خاموشی اختیار کی کہ:

اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ قَرَّتْ بَیْنِ بَنِيْ اِسْرَائِیْلَ رَطْبٌ (۹۲)

مجھے اندیشہ ہوا کہ تم یہ کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ڈال دی۔

یعنی پیغمبر بھی معصیت تفرقہ کے ارتکاب سے ڈرتے تھے۔

مولانا وعظ میں منفی انداز اختیار کر کے کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے، مثبت انداز میں وعظ فرماتے۔ نہ خواہ مخواہ کسی کی تکفیر فرماتے اور نہ ایسی بات زبان سے نکالتے جو مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کا باعث بنتی ہو۔ وہ صاف سہرے انداز میں مسائل بیان کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہزاروں لوگ ان کی تقریر سننے کے لیے آتے اور گناہوں سے تائب ہوتے۔ غیر مذہب کے لوگ بھی کثیر تعداد میں ان کی باتوں سے متاثر ہوتے اور کفر کو ترک کر کے اسلام قبول کرتے۔

مکتوبات

مولانا غلام رسول کے مکتوبات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس زمانے کے دستور اور رواج کے مطابق یہ تمام مکتوبات فارسی زبان میں ہیں۔ مولانا فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ چنانچہ بعض مکتوب فارسی نظم میں ہیں۔ بعض مکتوب مولانا عبداللہ غزنوی کے نام ہیں، بعض اپنے شاگردوں مثلاً مولانا علاء الدین گوجرانوالہ اور حکیم نبی بخش وغیرہ کے نام ہیں۔ بعض اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے گئے ہیں، اور بعض ارادت مند حضرات کے نام مرقوم ہیں۔ ایک خط ایک ہندو کو لکھا گیا ہے جس کا نام رام دتہ ٹانڈو تھا اور حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) کا رہنے والا تھا۔ یہ خط بھی فارسی میں ہے اور اس کے ایک مذہبی استفسار کے جواب میں ہے۔ یہ ایک تفصیلی خط ہے۔ اس خط سے پتا چلتا ہے کہ مولانا ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اور ان کے مذہبی افکار و تصورات سے بھی باخبر تھے۔

یہ مکتوبات مختلف مسائل اور نصاب پر مشتمل ہیں۔ بعض میں فقہی مسائل بیان کیے گئے

ہیں، بعض میں تصوف و سلوک کے نکات حل کیے گئے ہیں اور بعض میں اختلافی معاملات کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

قبولیت و دعا اور تقرب الہی

مولانا غلام رسول بے شمار خصوصیات کے حامل اور بہت بڑے عالم و فقیہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بلاشبہ اللہ کے مقرب اور ولی تھے۔ ان کی زبان میں بے پناہ اثر تھا اور اللہ ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا تھا۔ اس سلسلے میں ان سطور کے راقم نے بہت سی باتیں متعدد وثقہ لوگوں سے سنی ہیں اور ان کے سوانح نگار مولوی عبدالقادر نے بھی راجوان کے بڑے صاحب زانے تھے، تہنتر واقعات درج کیے ہیں جو نہایت عجیب و غریب ہیں۔ قبولیت دعا اور تقرب الہی سے متعلق چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

۱۔ موضع ستراہ سندھواں ضلع سیالکوٹ کے ایک شخص کا نام عمرا تھا جو گھار ببادری سے تعلق رکھتا تھا اور کثیر العیال تھا لیکن آمدنی بہت کم تھی جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر تنگ دستی اور غربت کا شکار رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ وہاں مولانا غلام رسول تشریف لے گئے۔ عمر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکی معاش کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: **يَا سَاحِي يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ** کثرت سے بلا تعداد پڑھا کرو، وضو ہو یا نہ ہو اس کی کوئی شرط نہیں، لیکن اس کے معنوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے (یعنی اے اللہ! جو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے، میں تیری رحمت سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں) اگر ایسا کرو گے تو اللہ فضل کرے گا۔

اس نے اس پر عمل کیا اور ٹھوڑے ہی عرصے میں مال دار ہو گیا۔ موضع ستراہ میں اچھی ٹھہری زمین بھی خرید لی۔^{۲۶}

^{۲۶} اس دعا کے بارے میں راقم الحروف بھی اپنا ایک ذاتی واقعہ اور تجربہ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

۲۔ سلیمان ایک بنگالی طالب علم تھا جو تمام عمر مولانا کی خدمت میں رہا، ان کی وفات کے بعد بیت اللہ شریف چلا گیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ مولانا کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد ایک شخص شیخ غلام حسین بھیروی کے دو ہزار روپے کے مقروض تھے۔ وہ قرض جلدی ادا نہ کر کے تو شیخ غلام حسین نے دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کر لی، اور حکیم غلام محمد کو عدالت نے جیل بھجوا دیا۔ مولانا غلام رسول اس وقت گاؤں میں موجود نہ تھے۔ اسی روز عصر کے قریب تشریف لائے اور سنت نبویؐ کے مطابق پہلے مسجد میں آئے۔ حکیم صاحب کے بارے میں پوچھا کہ کہاں ہیں سلیمان بنگالی نے تمام واقعہ بیان کیا۔ مولانا کو اس سے نہایت ذہنی کوفت ہوئی۔ نماز عصر سے فارغ ہوئے تو سلیمان سے کہا ”پانی کا ایک لٹا بھر لو اور میرے ساتھ آؤ“ گاؤں سے کچھ دُور جا کر اپنے گرد ایک حصار کھینچی، اسی میں وضو کیا، قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئے اور کچھ پڑھنے لگے۔ سلیمان بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مغرب کی طرف سے سفید لباس میں ملبوس ایک شخص آیا اور اس نے مولانا کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ آپ نے فرمایا ”مجھے دو ہزار کی ضرورت ہے“ اس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) بیان کرنا چاہتا ہے۔ میں ہفت روزہ الاعتصام کا ایڈیٹر تھا، جنوری ۱۹۵۸ء میں نے اپنا ایک سہ روزہ اخبار ”منہاج“ جاری کر لیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ملک میں ایوب خان نے مارشل لا جاری کر دیا اور نیوز پرنٹ کنٹرول میں آ گیا۔ ”منہاج“ چوں کہ نیا نیا جاری ہوا تھا اس لیے اُسے کنٹرول ریٹ میں اخباری کاغذ نہیں مل سکتا تھا، اخباری کاغذ پرانے اخباروں کو ملتا تھا۔ میں نے یہ اخبار تنگ آ کر اپریل ۱۹۵۹ء میں بند کر دیا۔ حساب کیا تو میں تین ہزار روپے کا مقروض تھا، الاعتصام“ سے مجھے اس زمانے میں دو سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور یہ قرض جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی، ادا کرنا نہایت مشکل تھا۔ میں نے مولانا محمد علی لکھنوی مرحوم کو جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے، خط لکھا اور دعا کے لیے درخواست کی انھوں نے فوراً جواب دیا اور یہی طریقہ اسی طرح بتایا جیسا کہ اوپر مذکور ہے۔ میں نے اس پر عمل کیا اور چند ماہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ میں قرض سے سبکدوش ہو گیا اور تمام مالی تکلیفیں ختم ہو گئیں۔

کہا "ہزار روپیہ دینے والے نے کہا ہے کہ باقی روپے (قرض خواہ) چھوڑ دے گا۔ آپ اسی وقت وہاں سے اٹھے اور شیخ غلام حسین کو تلاش کر کے ہزار روپیہ دیا اور فرمایا: "باقی روپے میں جلد سی ادا کروں گا۔" شیخ غلام حسین نے ایک ہزار روپیہ وصول کیا اور باقی ہزار چھوڑ دیا۔ مولانا گئے اور حکیم صاحب کو جیل سے رہا کر کے گھر لے آئے۔

۳۔ علاقہ شاہ پور کے موضع سدرہ میں ایک بزرگ حافظ غلام محمد سکونت پذیر تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے گاؤں سدرہ کے قریب ایک گاؤں کوٹلی ہے۔ کوٹلی کا ایک زمیندار لاولد تھا۔ وہ اپنی بیوی اور اپنی حافظ غلام محمد کے ساتھ مولانا غلام رسول کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اللہ سے دعا کریں وہ مجھے اولاد عطا فرمائے۔ مولانا نے اسی مجلس میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، دعا کے بعد فرمایا: "شاید اللہ تعالیٰ تمہیں لڑکی عطا کرے گا۔" چنانچہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے لڑکی عطا فرمائی۔

۴۔ مولانا غلام رسول کے سوانح نگار مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں کہ قلعہ میہاں سنگھ میں ایک حافظ قرآن لڑکوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے۔ ان کے چہرے پر چنبل ہو گیا۔ بہت علاج کرایا لیکن صحت یاب نہ ہوئے۔ ایک دن انہوں نے مولانا سے عرض کیا تو آپ نے دیکھ کر دریافت فرمایا "کوئی علاج نہیں کرایا؟" کہا "بہت علاج کرائے، سال بھر سے علاج کر رہا ہوں مگر بجائے فائدے کے مرض بڑھ گیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے، اب خدائی علاج چاہتا ہوں۔" آپ نے اسی وقت دم کیا اور فرمایا "متواتر تین دن دم کراؤ" حافظ صاحب نے مولانا کے فرمان کے مطابق تین دم کرایا اور بالکل صحت یاب ہو گئے۔

۵۔ قلعہ میہاں سنگھ کے حاجی کرم الہی کا بیان ہے کہ ان کی شادی کے موقع پر ان کی والدہ کا زلیخا ہو گیا، جہاں رکھا تھا، بار بار وہاں دیکھا، اور جگہوں میں بھی دیکھا مگر نہ ملا۔ حاجی صاحب مدوح کی والدہ مولانا کی خدمت میں حاضر

ہوئیں اور زیور کی گم شدگی کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا ”جہاں رکھا تھا وہیں پڑا ہے“ چنانچہ جا کر دیکھا تو وہیں پڑا تھا۔

۶۔ ضلع سیالکوٹ کے موضع ستراہ سندھواں کے چودھری محمود خان بیان کرتے ہیں کہ ابتدا میں اس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ مولانا ایک مرتبہ وہاں تشریف لے گئے تو اس نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی مالی کمزوری کا ذکر کیا۔ فرمایا اللہ الصمد ہر روز بلا تعداد پڑھا کر اور نماز تہجد بھی باقاعدہ پڑھا کر۔ چودھری محمود خان کا بیان ہے کہ اس نے اس پر عمل کیا اور چند ہی روز میں مال دار ہو گیا۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اتنی دولت کہاں سے آئی۔ مولانا نے تہجد پڑھنے کا حکم دیا تھا نماز تہجد بھی بالالتزام پڑھنے لگا۔ چودھری محمود خان کا کہنا ہے کہ اگر کسی دن عداً سو بھی جاؤں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تہجد کے لیے مجھے خود جگا رہے ہیں۔

۷۔ قلعہ مہیاں سنگھ کا ایک درزی امام الدین کہتا ہے کہ وہ بالکل گند ذہن اور آن پڑھ تھا۔ اُس کا بڑا بھائی عبداللہ ایک دن اُسے مولانا کے پاس لے گیا اور اس کا حال بیان کیا۔ آپ نے فرمایا ”لوٹے میں تھوڑا سا پانی لاؤ۔ پانی لایا گیا تو آپ نے اس پر دم کیا اور فرمایا ”لو امام الدین اس کو پی جاؤ، تم تھوڑا بہت حساب کتاب سیکھ جاؤ گے۔“ امام الدین کہتا ہے کہ اللہ کے فضل اور مولانا کی دعا سے اسی دن سے مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ حساب کتاب بھی کر لیتا ہوں اور معمولی خط و کتابت بھی کر سکتا ہوں۔

۸۔ ایک شخص ملا کریم داد جو لہٹان میں دکان دار تھا کہتا ہے کہ میرا والد مولانا کی خدمت میں گیا اور عرض کیا کہ ہم مختلف مقامات پر مال تجارت لینے جاتے ہیں تو راستے میں چوری وغیرہ ہو جاتی ہے، کوئی وظیفہ بنا دیجیے تاکہ ہمارا مال محفوظ رہے۔ فرمایا ”تم جہاں راست کو ٹھہرو، اپنے ماں کے گرد ایک سو مرتبہ ”یا محیط“ پڑھ لیا کرو۔“ وہ کہتا ہے کہ ہم یہ عمل کرتے رہے اور ہمیشہ سلامتی کے ساتھ مال لے کر گھر پہنچے۔

رہے، ہمارا کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا، جب کہ ہمارے ساتھیوں کا کئی دفعہ نقصان ہوا۔

۹۔ موضع کوٹلی منگھ بھڑاں (ضلع گوجرانوالہ) کے ایک زمیندار ”بلذا“ کا بیان ہے کہ اس کا بھائی علی گزیر ایک مدت تک بخار میں مبتلا رہا۔ اطباء نے تشخیص کی کہ اسے دق اور سہل کی بیماری ہوگئی ہے۔ طبی علاج سے ناامید ہو کر وارث اس کو مولانا کے پاس لے گئے اور عرض کیا کہ طبیب اس کو مدقوق اور مسلول قرار دیتے ہیں، فرمایا ”طبیبوں نے تشخیص میں غلطی کی ہے، اسے معمولی سا بخار ہے۔“ اس کے بعد پانی دم کر کے اسے پلایا اور اسی روز بخار اتر گیا اور مریض اچھا بھلا ہو گیا۔

۱۰۔ بعض مندویا سکھ اپنے بچوں کو سودا وغیرہ لینے کے لیے اگر کسی ایسی دکان پر بھیجتے جو مولانا کی مسجد کی طرف ہوتی تو انھیں تاکید کرتے کہ مسجد کے قریب سے ”واگرو“ واگرو یا رام رام کرتے جانا اور جلدی سے نکل جانا۔ ایک دن ایک مندولڑکی والدین کی ہدایت کے مطابق بھاگتی ہوئی جا رہی تھی اور رام رام کا لفظ اس کی زبان پر تھا۔ مولانا کے پاس سے گزری تو فرمایا ”یا اللہ یا اللہ کہو، یہ کیسا پیارا لفظ ہے“ چنانچہ ”یا اللہ یا اللہ“ کے الفاظ اس کی زبان سے جاری ہو گئے اور یہی الفاظ ادا کرتی ہوئی گھر پہنچی۔ والدین بے حد پریشان ہوئے اور اسے بار بار کہا کہ ”رام رام“ کہو، مگر لڑکی مسلسل ”یا اللہ یا اللہ“ کہتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی گھر والوں سے کہتی تھی کہ تم بھی ”یا اللہ یا اللہ“ کہو، یہ بڑا پیارا لفظ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے اور سب کی زبان سے ”یا اللہ یا اللہ“ کے الفاظ ادا ہونے لگے۔

۱۱۔ گجرات کا ایک موچی لاہور میں اپنا کوئی کام کاج کرتا تھا۔ اتفاقاً مولانا لاہور تشریف لاتے اور وعظ فرمایا۔ وعظ میں آپ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں حضرت یحییٰ کی پیدائش کا قصہ بیان کیا۔ اس وقت گجرات کا موچی بھی موجود تھا، وہ دوران وعظ ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور کہا ”حضرت! اب بھی ایسا

ہوسکتا ہے؟“ فرمایا ”ہاں اب بھی اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے۔“ موحی نے کہا ”تو میرا حال بعینہ حضرت زکریا علیہ السلام کا سا ہے۔ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوں۔ آپ میرے لیے دُعا فرمائیں، شاید آپ کی دعا کی برکت سے میرے گھر لڑکا پیدا ہو جائے۔“ آپ نے دُعا فرمائی اور لوگوں نے آمین آمین کہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو لڑکا عطا فرمایا۔ اس نے مولانا کو اطلاع دی تو آپ نے اس کا نام ”اللہ دتا“ رکھا۔ وہ لڑکا حافظِ قرآن ہوا۔

۱۲۔ ایک دن مولانا لاہور میں کہیں وعظ فرما رہے تھے۔ دو گورے عیسائی، سکھ اور چند ہندو بھی وعظ میں موجود تھے۔ وعظ میں سورہ مریم کی چند آیات تلاوت کیں اور ہرقل کے دربار میں قریش مکہ کی سفارت کا ذکر کیا۔ حضرت جعفر طیار سے ہرقل نے جس انداز سے بات کی اور کلمہ شہادت سُننا، وہ بتایا تو ساتھ ہی اس طرح زور دار اور پُرکشش آواز میں کلمہ شہادت پڑھا کہ سُننے والوں میں ایک تہلکہ بپا ہو گیا اور ہندو، مسلمان، گورے عیسائی اور سکھ شدتِ تاثیر سے تڑپنے لگے۔ اُس وعظ میں جتنے بھی غیر مسلم موجود تھے، سب مسلمان ہو گئے۔

۱۳۔ لاہور ہی کا واقعہ ہے کہ آپ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر وضو کرنے کی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سکھ عورت ”واگرو واگرو“ کہتی ہوئی وہاں سے گزری۔ آپ نے فرمایا ”وحدہ وحدہ“ کہو۔ اس عورت کی زبان پر ”وحدہ وحدہ“ جاری ہو گیا۔ گھر والوں نے اُسے بہت سمجھایا اور مار پیٹ بھی کی، مگر وہ باز نہ آئی اور مسلمان ہو گئی۔

۱۴۔ ایک مرتبہ مولانا ضلع گجرات میں سفر کر رہے تھے کہ ایک سکھ نے آپ سے پوچھا ”موضع ڈنگہ کا راستہ کون سا ہے؟“ فرمایا ”بھائی مجھے ڈنگوں کا راستہ تو یاد نہیں، البتہ سیدھوں کا یاد ہے۔“ اس نے کہا ”سیدھوں ہی کا تبادو“ فرمایا سیدھوں کا راستہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے۔“ ادھر مولانا کی زبان سے یہ نکلا اور ادھر سکھ کی زبان پر یہی کلمہ جاری ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔

۱۵۔ موضع دلاور چیمبر ضلع گوجرانوالہ کے ایک بڑے زمیندار اور دولت مند سکھ کا

نوجوان بیٹا مولانا کا وعظ سن کر مسلمان ہو گیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس سکھ نے دلاورچیمہ اور علی پور میں اعلان کر دیا کہ کوئی پنڈت یا گرنتمتی قلعہ مہیاں سنگھ والے مولوی صاحب سے بحث کر کے ان کو شکست دے دے اور میرے بیٹے کو دوبارہ سکھ مذہب قبول کرنے پر آمادہ کر لے تو میں اس کو کسی ایکڑ زمین اور پانچ سو روپے نقد انعام دوں گا۔ علی پور کے ایک پنڈت نے یہ اعلان سنا تو لالچ میں آکر مولانا سے بحث کے لیے تیار ہو گیا۔ سکھ زمیندار نے پانچ سو روپے نقد جمع کر دیے۔ اس کے لیے دستاویز لکھ دی اور پنڈت کو ساتھ لے کر قلعہ مہیاں سنگھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بہت سے اور لوگ بھی جن میں غیر مسلم بھی تھے اور مسلمان بھی بحث سننے اور نتیجہ معلوم کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ چل پڑے۔ یہ لوگ قلعہ مہیاں سنگھ پہنچے تو مولانا غلام رسول اپنے بالاقانہ پر تشریف فرما تھے اور ایک طالب علم کو شیخ سعدی کی مشہور کتاب بوستان کا وہ سبق پڑھا رہے تھے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پنڈت نے آتے ہی مولانا سے ایک سوال کیا۔ آپ نے فرمایا، تشریف رکھیے، آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ طالب علم کے سبق سے فارغ ہو جاؤں تو آپ سے بات ہوگی، جو حجبی چاہے سوال کریں، میں انشاء اللہ مہایت خوشی سے جواب دوں گا۔ یہ الفاظ کہہ کر اس شعر کی طرف متوجہ ہوئے۔

دیں جس جرم مرد راعی نرفت

گم آں شد کہ دنباں داعی نرفت

کہتے ہیں یہ شعر پڑھتے ہی مولانا کا اسلوب بیان بدل گیا اور مجلس کا انداز کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گیا۔ تقریر میں اللہ نے ایسی تاثیر بھری کہ سامعین یوں محسوس کر رہے تھے کہ درود لوار سے کلمہ شہادت کی آوازیں آرہی ہیں۔ پنڈت جی اور ان کے ساتھی بے جان تصویر بنے ہوئے مولانا کا منہ تک رہے تھے اور سب کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ ناگہاں پنڈت نے شور مچا تا شروع کر دیا، ”مجھے لے چلو، مجھے لے چلو“

کچھ لوگوں نے پنڈت کو دونوں بازوؤں سے بکڑ کر کھڑا کیا اور بڑی مشکل سے بالائے سر سے نیچے اتارا۔ پنڈت پر بد ہوشی سی طاری تھی۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو اس سکھ زمیندار نے جو اسے لے کر گیا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اس سے دریافت کیا، تم بڑی شان اور ادعا سے وہاں گئے تھے، لیکن جانتے ہی خاموش ہو گئے اور کوئی بات کہے بغیر لوٹ آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ پنڈت نے جواب دیا: میں اسلام کے خلاف اکیس اعتراض سوچ کر گیا تھا جو میرے نزدیک بڑے مضبوط تھے، لیکن مولوی صاحب کے سامنے جاتے ہی تمام باتیں ذہن سے نکل گئیں۔ ان کی تقریر میں کچھ ایسا جا دو بھرا ہوا تھا کہ خود میرے دل میں ایک کھرام سا بپا ہو گیا، ان کے مذہب کی سچائی میرے دل میں پیوست ہونے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ میرا مذہب صحیح نہیں ہے۔ مولوی صاحب کی طرف سے ایک روشنی سی میری طرف بڑھ رہی تھی اور میرے مذہب کے آثار مٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اگر چند ثانیے مزید ان کے سامنے بیٹھا رہتا تو میں کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔

اس کے بعد بہت سے لوگوں نے پنڈت جی کو مولانا کی خدمت میں لے جانے اور ان سے بحث و مناظرہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں ہرگز مولوی غلام رسول سے بحث و مناظرہ نہیں کروں گا۔ ۱۶۔ یہی عبداللہ نوسلم جس کے سکھ والد کے کہنے پر پنڈت مذکور مولانا سے بحث کرنے گئے تھے، بیان کرتے ہیں کہ مولانا کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے ایک مسلمان خاندان میں شادی کر لی تھی۔ قبول اسلام سے پہلے بھی وہ شادی شدہ تھے۔ ایک دن وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے پوچھا: کہو میاں عبداللہ مع اہل و عیال کے خوش ہو؟ عرض کیا: "حضرت امیری پہلی بیوی بہت سلیقہ شکار اور نالبدار تھی، مجھے وہ بہت یاد آتی ہے آپ نے دعا فرمائی وہ بھی اسلام قبول کر لے اور میرے پاس آجائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو

بہت ہی اچھا ہے ورنہ دن تو گزر ہی رہے ہیں۔“
 فرمایا ”میاں عبداللہ! جس ذاتِ اقدس نے تم کو ہدایت دی ہے وہ اس کو بھی
 ہدایت دینے پر قادر ہے۔ گھبراؤ نہیں، ان شاء اللہ جلد ہی تمہاری مراد پوری ہوگی۔
 اب تم گھر جاؤ۔“

عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مولانا کے حسبِ فرمان گھر چلے آئے، ابھی ایک ہی دن
 گزرا تھا کہ ان کی پہلی بیوی نے ایک شخص کے ہاتھ ان کو خط لکھ کر بھیجا کہ فلاں دن اور فلاں
 وقت آگے لے جاؤ۔ وہ گئے اور اُسے ساتھ لے کر مولانا کی خدمت میں قلعہ
 یہاں سنگھ حاضر ہوئے اور وہ مسلمان ہو گئی۔

۱۴۔ موضع ستراہ سدھواں (ضلع سیال کوٹ) کے چودھری محمود خاں کہتے ہیں کہ
 ان کے گاؤں کے برہمن نے ان سے کہا کہ سنا ہے جو غیر مسلم مولوی صاحب
 کا درشن کرنے آتا ہے وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا ”بات تو
 ایسی ہی ہے۔“ برہمن نے کہا ”کسی دن ہم کو بھی ان کا درشن کرانا۔“ چند روز
 بعد مولانا تشریف لے آئے اور چودھری محمود خاں نے ان سے برہمن کی بات
 بیان کی۔ فرمایا اگر کوئی وقت آیا تو میں کہوں گا، تم انھیں بلا لانا۔ جمعے کا
 دن تھا، مولانا وعظ فرما رہے تھے کہ محمود خاں کو حکم دیا ”برہمن کو بلا لاؤ،
 کوئی اور غیر مسلم آنا چاہے تو وہ بھی آجائے۔“ حسبِ ارشاد محمود خاں
 گئے، برہمن سے کہا اور اس کو لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں آیا۔ دو اور غیر مسلم ان
 کے ساتھ آگئے۔ جوں ہی وہ مولانا کے سامنے آئے، حالانکہ انھوں نے وعظ کا
 کوئی لفظ نہیں سنا تھا، ان کو دُور سے دیکھتے ہی کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔
 محمود خاں کہتے ہیں کہ ایندھن کاٹنے کے لیے وہ ایک کلہاڑی برہمنوں سے
 مانگ کر لاتے تھے۔ انھوں نے وہ کلہاڑی واپس کرنے کی بہت کوشش کی،
 لیکن برہمنوں نے نہیں لی اور کہا کہ اس کلہاڑی سے جو ٹکڑیاں کاٹ کر کھیت لائی گئی
 ہیں، ان سے مولوی صاحب کے لیے کھانا پکایا گیا ہے۔ ممکن ہے اس کو دیکھ کر

اور ہاتھ لگا کر ہی ہم مسلمان ہو جائیں۔

۱۸۔ گوجرانوالہ کے دو میاں بیوی اپنی چودہ سالہ لڑکی کو لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کی لڑکی کے سر پر کوئی بال نہیں ہے اور یہ بالکل گنجنی ہے اس کی شادی ہونے والی ہے، آپ دعا فرمائیں کہ اس کے سر پر بال اُگ آئیں۔

مولانا نے لڑکی سے فرمایا ”بیٹی نماز پڑھا کرو، ان شاء اللہ تم جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔“ لڑکی نے نماز پڑھنا شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں سر پر بال اُگ آئے اور گنجان ختم ہو گیا۔ دو سال بعد وہ لڑکی اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ مولانا کی خدمت میں نذرانہ لے کر حاضر ہوئی، اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔ مولانا نے ان سے پوچھا، ”تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟“ لڑکی کی والدہ نے تمام واقعہ بیان کیا۔ آپ نے پوچھا ”نماز پڑھتی ہو یا نہیں؟“ لڑکی نے جواب دیا ”پہلے تو نماز پڑھا کرتی تھی مگر اب چند روز سے چھوٹ گئی ہے۔“ یہ سنتے ہی آپ نے نذرانہ واپس کر دیا اور فرمایا ”تمہارے جیسے لوگوں سے جو خدا سے وعدہ کر کے توڑ دیتے ہیں، مجھے کوئی سرکار نہیں“ ہر چند اس نے کہا، لیکن آپ نے نذرانہ قبول نہ کیا اور دونوں ماں بیٹی واپس گوجرانوالہ چلی گئیں۔ رات کو وہ لڑکی سوئی، صبح اٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرا تو ایک بال بھی نہ تھا۔

۱۹۔ موضع کھبکی (ضلع گوجرانوالہ) کے حکیم نبی بخش کا بیان ہے کہ انھیں ایک گاؤں میں ایک ایسے مریض کے علاج کی غرض سے جانا پڑا، جو مالینجولیا میں مبتلا تھا اور جسے طبیب لا علاج قرار دے چکے تھے۔ حکیم صاحب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا۔ مولانا نے فرمایا ”علاج کرو، اللہ شافی مطلق ہے، شفا دے گا۔“ حکیم صاحب نے اس کا علاج شروع کیا اور قدرتِ الہی سے ایک ہی دن کے علاج سے ادھی بیماری ختم ہو گئی، دوسرے روز مریض بالکل تندرست ہو گیا۔ حکیم صاحب بامذاق آدمی تھے اور مولانا ان کی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ وہ مولانا کے پاس آئے، مریض کی صحت یابی کی اطلاع دی اور عرض کیا، وہ مریض تو

صحت یاب ہو گیا، اگر کوئی ایسا ہی مریض اور آگیا تو پھر کیا ہوگا؟ فرمایا "اللہ تعالیٰ تمہارے علاج سے ہمیشہ ایسے مریضوں کو صحت عطا فرمائے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد سے مالینجولیا کے جتنے بھی مریض ان کے پاس آئے اللہ نے انہیں صحت عطا فرمائی۔

۲۰۔ لاہور کے میاں محمد صاحب کہتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں وہ گھوڑوں کا بیوپار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے گھوڑے خرید کر اپنے ملازموں کو سری نگر گھوڑے فروخت کرنے کے لیے بھیجا۔ تین مہینے گزر گئے، لیکن گھوڑے فروخت نہ ہوئے میاں محمد صاحب نہایت پریشان تھے، کیوں کہ سری نگر میں ملازموں کا خرچ بھی پڑ رہا تھا اور گھوڑوں کا بھی۔ اتفاقاً مولانا غلام رسول لاہور تشریف لائے اور مسجد چینیاں والی میں وعظ کیا۔ سامعین میں میاں محمد بھی موجود تھے۔ وعظ کے بعد وہ مولانا سے ملے اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ فرمایا "ان شاء اللہ تیرے روز تمہارے گھوڑے حاکم کشمیر خرید لے گا اور تمہیں تین ہزار روپے منافع ہوگا۔ میاں محمد کہتے ہیں کہ وہ تاریخ انہوں نے لکھ لی۔ جب ملازم واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا کے فرمان کے تین روز بعد گھوڑے فروخت ہوئے اور حساب کیا گیا تو ٹھیک تین ہزار روپے منافع ہوا۔"

۲۱۔ گورداسپور (مشرقی پنجاب) کے ایک ہندو مہنت کا نام کاہن داس تھا۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ ایک مرتبہ "موضع کالاوالی" آیا جو قلعہ میہاں سنگھ کے قریب ایک گاؤں ہے۔ مہنت نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں سے قلعہ میہاں سنگھ کتنے فاصلے پر ہے؟ بتایا گیا تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ مہنت کاہن داس نے کہا، سنا ہے وہاں مولوی غلام رسول رہتے ہیں جو بہت عالم اور صوفی ہیں، میرے دل میں اسلام کے بارے میں کچھ سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ میں ان سے یہ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے بتایا کہ ان کے پاس کئی پنڈت اور غیر مسلم بحث و مباحثہ کے لیے گئے اور مسلمان ہو گئے، آپ وہاں نہ جائیں۔ لیکن

مہنت صاحب نہیں مانے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ جاتے ہی سوال کیا "اسلام کیا چیز ہے؟" فرمایا "پہلی چیز ہے کلمہ پڑھنا۔" پھر کلمہ پڑھ کر سنایا۔ کلمہ سنتے ہی مہنت کاہن و اس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد دو سال وہ مولانا کی خدمت میں قلعہ مہیاں سنگھ فروکش رہے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جو مولانا غلام رسول کی طرف منسوب ہیں۔

ہم لوگوں پر بادیت نے قبضہ کر لیا ہے اور روحانیت تقریباً ختم ہو گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثریت کے ذہن اس قسم کے واقعات کی صحت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ مولانا محمد روح ۱۲۹۱ھ میں فوت ہوئے۔ ان سطور کی تحریر تک ان کی وفات پر صرف ۱۱۵ سال گزرے ہیں اور اب سے تیس بیستیس برس پہلے ایسے کئی حضرات موجود تھے جنہوں نے مولانا کو دیکھا اور ان کی صحبت و فراقت کا شرف حاصل کیا تھا، خود ان سطور کے راقم کو ایسے بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان سے مولانا کے بارے میں اس قسم کی باتیں سنی ہیں۔

کرامات کے ظہور کی وجہ

مولانا غلام رسول سے بکثرت کرامات کیوں ظاہر ہوئیں اور ان کی دُعا اور بارخداوندی میں اتنی جلدی کیوں شرف قبولیت حاصل کرتی تھی؟ اس کے بارے میں ان کے ایک شاگرد اور مرید مولوی قطب الدین بیان کرتے ہیں کہ ایک روز وہ مولانا کی خدمت میں حاضر تھے۔ عرض کیا "حضرت! آپ سے اس درجہ بکثرت کرامات ظاہر ہونے کا سبب کیا ہے؟ پہلے بھی بہت سے بزرگ ہو گزرے ہیں، اب بھی کئی متدین اور متقی لوگ موجود ہیں، بلاشبہ ان سے بھی کرامات کا ظہور ہوتا رہا ہے، لیکن اتنی کثرت سے نہیں جتنا کہ آپ سے۔"

مولانا نے جواب دیا: "جب سے مجھے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اس وقت سے کرامات ظہور میں آرہی ہیں۔"

مولوی قطب الدین کہتے ہیں کہ اب میں نے اس خواب کی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ کئی دن ٹالتے رہے، لیکن جب میرا اصرار بہت بڑھ گیا تو فرمایا: ایک مبارک رات کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اس حالت کو نہ تو میں خواب سے تعبیر کر سکتا ہوں اور نہ اُسے عالم بیدار ہی کہہ سکتا ہوں۔ مجھے حضور علیہ السلام نے صابن عنایت کر کے فرمایا: ”اس سے اپنے کپڑے دھولاؤ“ میں نے حسبِ حکم کپڑے دھوئے اور پھر حاضر ہوا۔ اب حضورؐ نے مجھے مسجد کے منبر پر کھڑا کر کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید دیا اور دوسرے میں صحیح بخاری دی۔ فرمایا: ”یہ لوگوں کو سناؤ، تم میرے وارث ہو“۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایسی رات پھر تمام عمر نصیب نہیں ہوتی۔ اس رات جو فیوض و برکات حاصل ہوئے، وہ کبھی حاصل نہ ہوتے۔

اس قسم کے اصحابِ تقویٰ اور عابد و زاہد لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے! اللہ نے ان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا اور اپنے فضل و کرم خاص کا مستحق گردانا تھا۔

ایک اور واقعہ

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد انگریزی حکومت کے نزدیک مولانا غلام رسول کا شمار انگریزوں کے باغیوں میں ہونے لگا تھا۔ اس لیے انگریزی حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا تھا اور پھر وعظ پر پابندی عاید کر دی تھی۔ انگریزی حکام گاؤں میں آکر یا تھانے اور کچھری بنا کر انھیں اور ان کے خاندان کے بعض افراد کو پریشان کرتے تھے۔ بالخصوص ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد سے زیادہ پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ اس ضمن میں مولانا غلام رسول کے سواخ نگار اور ان کے فرزند ارجمند مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے تایا حکیم غلام محمد نے بتایا کہ ایک روز انھوں نے مولوی غلام رسول سے کہا، ہم حکام کی باز پرس سے تنگ آگئے ہیں۔ بہتر ہے کہ یہاں کی بود و باش ترک کر کے کسی ریاست میں جا قیام کریں۔ مولوی صاحب نے فرمایا بھائی صاحب آپ کا فرمان بجا ہے، لیکن میں مجبور ہوں، کیونکہ ایک دن میں مسجد میں سویا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آکر جگایا اور کہا ”تم میرے ساتھ چلو، تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا رہے ہیں۔ میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ جب گاؤں

سے باہر نکلا تو دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکی رکھی ہوئی ہے۔ میں نے حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: ”غلام رسول، ہم تمہاری مسجد میں جانا چاہتے ہیں“ آپ نے میرا ہاتھ پکڑے رکھا اور پاکی والوں نے پاکی اٹھالی، مسجد میں تشریف لے جا کر اسی پکڑے ہوئے ہاتھ سے مجھے مینر پر بٹھایا اور فرمایا ”و عفظ کہا کرو، تم سے لوگوں کو ہدایت ہوگی، تمہاری یہی جائے بود و باش ہے“

یہ خواب سناتے کے بعد فرمایا: ”بھائی صاحب اب فرمائیے میں تو مامور ہوں، کیسے اس جگہ کو چھوڑ سکتا ہوں؟“

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تمام عمر وہ اسی گاؤں (قلعہ میہاں سنگھ) میں رہے اور خلق کثیر نے یہاں آکر ان سے استفادہ و استفادہ کیا۔

صحابہ کرام کی خوشبو

مولانا کے ایک شاگرد اور مرید مولوی علاء الدین کا بیان ہے کہ ایک دن وہ مولانا کے ساتھ موضع ہیرا والا جا رہے تھے۔ مولانا گھوڑی پر سوار تھے۔ راستے میں سطح زمین سے قدمے اُونچا ایک مقام آیا تو آپ گھوڑی سے اتر پڑے اور فرمایا: ”علاء الدین یہاں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی خوشبو آرہی ہے، تم گھوڑی پکڑ لو۔“ انہوں نے حسب ارشاد گھوڑی کی لگام پکڑی۔ آپ نے وضو کیا اور جوتے اتار کر ادھر ادھر گھومنے لگے، جیسے کوئی خاص جگہ تلاش کر رہے ہوں، بالآخر ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ دوپہر کا وقت اور گرمیوں کا موسم تھا۔ آپ جذب کے عالم میں تھے، کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ دستار مبارک سر سے گر گئی تھی اور انہیں اپنے آپ کا کچھ پتا نہ تھا۔ مولوی علاء الدین تعجب و تحیر کے عالم میں کھڑے ان کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ مولانا ظہر کے اول وقت وہاں سے اُٹھے اور نماز ادا کی۔ پھر فرمایا:

”میرادل چاہتا ہے کہ میری قبر یہاں ہو“

یہاں یہ یاد رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعداد بعض تاریخی روایات کے مطابق ایک لاکھ پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ وہ صرف جزیرۃ العرب ہی میں اقامت گزین نہ رہے تھے، جنگ و جہاد، کاروبار اور تبلیغ دین و اشاعت اسلام کے سلسلے میں مختلف ملکوں اور علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ کتب تاریخ سے ثابت ہے کہ ہندوستان کے بعض شہروں اور علاقوں میں بھی پچیس صحابہ تشریف لائے۔ ان کی آمد و رفت کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد (۱۵ ہجری) سے لے کر یزید بن معاویہ کے زمانے تک جاری رہا۔ ان کے نام بھی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ موجودہ بلوچستان کے متعدد علاقوں اور صوبہ مہاراشٹر کے شہر بنوں میں بھی (جسے عربوں نے ”بنہ“ کہا ہے) بغرض جہاد صحابہ کرام کا ورد مسعود ہوا۔ عین ممکن ہے اس سے آگے بڑھ کر موجودہ پنجاب کے بعض علاقوں میں بھی آئے ہوں اور مولانا غلام رسول کو جس مقام سے صحابہ کی خوشبو آئی، وہاں کوئی صحابی مدفون ہو۔ ہمارے لیے اگرچہ اس معاملے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کہ اولیاء و ائمتیہ کا معاملہ عام لوگوں سے بہت مختلف ہوتا ہے اور ان کے قلب و روح کی قوتِ حاسمہ اس درجے تیز ہوتی ہے کہ اس کی مدد سے وہ ایسے آثاؤں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جہاں ہم ظاہر بیوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

سناوت اور مہمان نوازی

مولانا غلام رسول بہت سخی اور مہمان نواز تھے۔ اہل و عیال کے علاوہ رشتے داروں اور اعزہ و اقارب پر بھی دل کھول کر خرچ کرتے تھے، ان کے شادی بیاہ کی فیس داریا بھی انہی نے سنبھال رکھی تھیں۔ ان کی تعلیم و تعلم کے معاملات بھی انہی کے سپرد تھے۔ ان کے مدرسے میں جو طلباء حصول علم کے لیے آتے اور جو لوگ فیض حاصل کرنے

کی غرض سے وہاں مقیم رہتے ان کے خورد و نوش کا انتظام بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔۔۔۔۔
 مہانوں کی تعداد سپردِ کار کے قریب روزانہ ہوتی تھی، بعض دفعہ یہ تعداد چالیس تک بھی پہنچ جاتی
 تھی۔ گھر کی عورتیں یا چچی پستی رہتیں یا کھانا پکانے میں مصروف رہتی تھیں۔ ایسا بھی ہونا
 کہ مہان رو حانی فیض بھی حاصل کرتے، کھانا بھی کھاتے، کئی کئی دن وہاں مقیم بھی رہتے
 اور پھر جاتے وقت سفر خرچ کا مطالبہ بھی کرتے۔ بعض بھنگی پستی بھی ان کی سخاوت سے
 فائدہ اٹھاتے اور اپنی اس ضرورت کے لیے ان سے پیسے لے جاتے۔

اس مردِ دلوروش کا دستِ سخا اس قدر وسیع تھا کہ کسی شخص کا دامن طلبِ خالی نہ رہتا۔
 ایک مرتبہ ایک پستی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں پوست
 پینے کا عادی ہوں اور بہت زیادہ پیتا ہوں، آج بالکل خالی ہاتھ ہوں، پوست لینے
 کے لیے کوئی پیسہ میرے پاس نہیں ہے، سخت طلب لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے کچھ
 پیسے دیجئے تاکہ پوست پی سکوں۔ آپ نے اس کو ایک روپیہ دیا۔ دوسرے دن وہ
 پھر آیا، وہی ضرورت بیان کی اور ایک روپیہ لے گیا۔ اس طرح متواتر سات دن
 آتا اور ایک ایک روپیہ روزانہ لے جاتا رہا۔ اس اثنا میں جو لوگ آپ کی خدمت میں
 حاضر ہوتے، وہ آپ کو کہتے رہتے کہ یہ شخص خود پوست پینے کا اعتراف کرتا ہے اور
 اسی کے لیے آپ سے پیسے لیتا ہے، آپ اس غلط کام کے لیے کیوں روزانہ ایک
 روپیہ دیتے ہیں۔ ایک روپیے کی اس زمانے میں بہت قیمت تھی، لیکن مولانا نے
 کوئی پروا نہ کی اور اس کا مطالبہ پورا کرتے رہے۔ آٹھویں دن وہ آیا اور روپیہ طلب
 کیا تو اسے اپنے پاس بٹھا لیا، نہایت شفقت سے اس کے کا ندھے پر ہاتھ رکھا
 اور پوست اور دوسری نشہ آور چیزوں کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ وہ شخص اتنا متاثر
 ہوا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت پوست نوشی سے توبہ کر لی۔ اب
 پوست کے بجائے مولانا نے اسے اپنی جیب سے دودھ پلانا اور حلوہ کھلانا شروع کر
 دیا۔ چھ مہینے وہ ان کی خدمت میں رہا، ذکرِ الہی اور یادِ خدا اس کا ہر وقت کا معمول
 بن گیا تھا۔

مولانا عبداللہ غزنوی سے مولانا غلام رسول بیعت بھی تھے اور دونوں کا آپس میں گہرا
دوستانہ بھی تھا۔ مولانا عبداللہ غزنوی نے چونکہ اتباع کتاب و سنت کی پاداش میں
اپنا ملک چھوڑا تھا اور ہندوستان آکر وہ خالصتاً دینی خدمات انجام دے رہے تھے،
اس لیے مولانا غلام رسول ان سے بے پناہ تعلق خاطر رکھتے تھے اور ان کی مالی امداد
کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔

اولاد کی تربیت

مولانا غلام رسول کے فرزند گرامی مولوی عبدالقادر مرحوم بیان کرتے ہیں کہ مولانا
اپنی اولاد کی تربیت کا خاص طور سے اہتمام فرماتے تھے، ان کو دینی مسائل سکھاتے اور
پانچ وقت کی نمازیں باجماعت ادا کرنے کا حکم دیتے۔ سحری کے وقت تہجد کے لیے
جگاتے اور مسجد میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں:

”میری عمر اس وقت محض نو سال کی تھی۔ ایک دن والدہ صاحبہ نے کہا کہ ابھی یہ
نابالغ ہے۔ شرع نے اس کو مکلف نہیں کیا تو اس کو تہجد کے لیے جگانے اور مہانوں
کی خدمت کے لیے تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا ہے۔
آنحضرت نے فرمایا ہے: ائنا الا عمال بالنیات۔ میں اس کو اس نیت سے تکلیف
دیتا ہوں کہ اس کو نیک کاموں کی عادت ہو جائے۔ دوسرا مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
عنقریب یہ کسی دن یتیم ہو جائیں گے، جو کچھ میں اس سے اب کرتا ہوں، یہ اس کو یاد
رہے گا اور بڑا ہو کر ان عادات کا پابند ہو جائے گا۔ اس کے دل میں تخم حمیت اور
مروت بونہا ہوں۔ ان شاء اللہ کسی روز یہ تخم پھل پھول جائے گا، میرا خدا میری محنت
کو ضائع نہ کرے گا۔ نابالغوں کا سینہ مثل آئینہ ہوتا ہے، جس طرف ان کو لگایا جائے
وہ رشتہ ان کے سینوں میں نقش ہو جاتا ہے۔“

اولاد کی دینی اور مذہبی تربیت نہایت ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے گھر کے سربراہ کو ”راعی“ یعنی نگہبان قرار دیا ہے۔ اس حیثیت سے والد کا فرض
ہے کہ اولاد کی ہر اعتبار سے نگرانی اور نگہداشت کرے اس ضمن میں مولانا غلام رسول

کا نقطہ نظر جو یہاں بیان کیا گیا ہے، عین حقیقت پر مبنی ہے۔ انھوں نے عمدہ طریقے سے اولاد کی تربیت کی اور بچپن ہی میں انھیں نیکی کی راہ پر لگا دیا اور اس کی جو وجہ بیان فرمائی وہ بالکل صحیح ہے۔

چند خصوصیات

گزشتہ صفحات میں مولانا غلام رسول کے تقویٰ و طہارت اور خصائل حمیدہ کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ان کی بے شمار خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہر وقت با وضو رہتے اور اپنے اصحاب عقیدت و ارادت کو بھی با وضو رہنے کی تلقین فرماتے اور کہا کرتے الموضوع سلاح المؤمنین و وضو مومنوں کا ہتھیار ہے) ان کا ارشاد ہے کہ با وضو آدمی پر نہ جاؤ و اثر کرتا ہے، نہ جن بھوت اُسے تکلیف پہنچا سکتے ہیں اور نہ موذی چیزیں اُسے مبتلائے مصیبت کر سکتی ہیں۔ فرمایا کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ انصار سے پوچھا کہ تم میں وہ کون سی صفت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید میں تمہارے بارے میں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ فرمایا گیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا ہم لوگ با وضو رہتے ہیں۔

فرمایا کرتے کہ وضو کر کے جو کام بھی کیا جائے، اس میں برکت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ خود پاکیزگی اختیار کرنا اور دوسرے کو پاکیزہ رہنے کی تلقین کرنا منشا اسلام ہے۔ صوفی اور سالک دربار خداوندی میں اسی لیے زیادہ مقبول ہیں کہ وہ طہارت اور پاکیزگی کا التزام کرتے ہیں۔ مجذوب بھی بارگاہ الہی میں مقبول ہوتا ہے، مگر وہ سالک اور صوفی کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ سالک شرع کا مکلف ہے اور ہر وقت اللہ سے طالبِ رضا رہتا ہے۔ اس کے برعکس مجذوب پر استغراق اور جذب کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ سالک تمام درجاتِ سلوک طے کر کے اعلیٰ مرتبے پر ناز ہو جاتا ہے، لیکن مجذوب جزئیاتِ شرع اور مراتبِ تصوف سے واقف نہیں ہوتا۔

ارادت مندوں سے کہا کرتے کہ اصل فضیلت اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتی ہے، جس کو اتباعِ رسول نصیب نہیں، اُسے مرتبہ فضیلت نصیب نہیں ہوتا۔ ہر قسم کے روحانی فیوض و برکات اور درجات و مراتب کا بنیادی منبع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔

ہمیشہ سچی نظر کر کے چلتے۔ دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے۔ اس کے لیے کتاب و سنت میں جو احکام صادر فرمائے گئے ہیں وہ لوگوں کو سناتے۔ زیادہ باتیں کرنے سے منع کرتے اور زبان کو قابو میں رکھنے کی تلقین کرتے۔ ہر کام خلوص نیت سے کرنے کی تاکید فرماتے۔ کسی کو ذہنی اور جسمانی تکلیف نہ پہنچاتے۔ مالِ مشتبہ سے سخت پرہیز کرتے۔ سب کی بات کامل توجہ اور غور سے سنتے۔ لباس اور کھانے پینے میں کسی نوع کا تکلف نہ کرتے۔ سادہ لباس پہنتے اور سادہ کھانا کھاتے۔ چھوٹے پر شفقت فرماتے اور اپنے ہم عمر اور بڑوں کا احترام کرتے۔ بہت سے لوگ ان سے فقہی مسائل پوچھنے آتے اور تحریری فتوے لینے کی غرض سے بھی حاضر خدمت ہوتے، سب کو تسلی بخش جواب دیتے اور قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں فتوے تحریر فرماتے۔ جو لوگ زبانی مسائل دریافت کرتے ان کو بھی نہایت اطمینان سے مسئلے کی نوعیت سمجھاتے، جب تک وہ مطمئن نہ ہو جاتا اور مسند اچھی طرح ذہن نشین نہ ہو جاتا اُسے اٹھنے نہ دیتے۔

ہر چھوٹا بڑا ان سے بے تکلفی سے بات کر سکتا اور بے جھجک اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا، ہر شخص کے علم اور ذہن کے مطابق بات کرتے اور اُس کے مرتبہ و مقام کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ کسی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوتے، جس میں ریا اور سمعہ کا ادنیٰ اثنا تبہ بھی پایا جاتا، اپنے ذاتی مفاد کو ہرگز پیش نظر نہ رکھتے۔ اگر انھیں شبہ پڑ جاتا کہ فلاں مقام کے لوگ ان کی کوئی مالی اعانت کرنا چاہتے ہیں تو وہاں بالکل نہ جاتے اور جانے کا پروگرام طے بھی ہو چکا ہوتا تو منسوخ کر دیتے یا اس وقت تک ملتوی کر دیتے جب تک یہ شبہ دور نہ ہو جاتا۔

مزاج کے نرم اور طبیعت کے دھیمے تھے کسی سے سخت کلامی نہ کرتے، ہر شخص

سے پیار اور محبت سے پیش آتے۔ بحث سے شدید نفرت تھی۔

فقہی مسلک

فقہی مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے اور اتباع سنت ان کا اور ہونا بچھونا تھا۔ اہل حدیث کے مسائل مشہورہ آئین اور دفع بدین وغیرہ پر عامل تھے۔ فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے۔ دیگر مسائل میں بھی اسی مسلک کو ترجیح دیتے اور فتوے میں کتاب و سنت کو پیش نگاہ رکھتے۔

وعظ میں بدعات اور مروجہ رسوم کی سخت مخالفت کرتے اور خالص کتاب و سنت کے مسائل بیان فرماتے۔ مسند توحید نہایت عمدہ اور موثر انداز میں بیان کرتے۔

وصیت

مولانا نے عازم بیت اللہ ہونے سے قبل اپنے بیٹوں کے لیے حسب ذیل وصیت تحریر فرمائی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ — الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی رَسُوْلِهِ الَّذِیْ لَا نَبِیَّ بَعْدَهُ وَعَلٰی اٰلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ
بِذَلِّیْ مَرْضِیَاتِ اللّٰهِ جَهْدًا اِمَّا بَعْدَ - امروز دو شنبہ ۵ شوال ۱۲۸۵ ہجری
مقدسہ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ فقیر عبد اللہ المعروف بعظام رسول بن جناب
فضیلت و سنگاہ رحیم بخش بن حافظ نظام الدین خادم بن حافظ فاضل کامل بہا الدین بن
جامع کمالات حافظ محمد اکرم بن حافظ فاضل عصمت اللہ بن مصدر کمالات زبدہ اہل اللہ
کامل التحریر جناب عبد اللہ بن سکندر بن نور محمد بن پیر محمد مجتبیٰ فضل الہی عازم زیارت
حرمین شریفین زاد ہما اللہ شرفا گردید۔ لہذا بہ فرزند ذی عبدالقادر کہ امروز ۹ سالہ
است و بعد تلاوت قرآن شریف و تحصیل صرف تاز راوی بوستان و گلستان می خواند
و نور چشمی محمد عبدالعزیز کہ ۳ و نیم سالہ است وصیت میکنم کہ از ہمہ امور علم دینی
از تفسیر و حدیث و فقہ و سیر و تصوف مقدم دارند۔ و ملاک الامر و اساس الایمان یقین
کنند و ہمگی ہمت با و توجہ شوند خصوصاً صحبت محدثین لازم شمسازند کہ اہل حدیث اہل اللہ اند

بعد فراق از علم دینیہ دست بیعت بشیخ کامل مکمل و ہند۔ و دریں زمان مثل عبد اللہ غزنوی
 در قیاس ما احدے نیست صحبتش اکسیر است۔ و بحقیقت آنحضرت کامل مکمل پیر است
 و عبد القادر ترجمہ قرآن از لیشاں شروع کنند۔ و بسم اللہ عبد العزیز از لیشاں شروع کنند
 کہ در عقیدہ فقیر مثل جنید و نظیر حضرت بایزید است۔ لایدرک الواصف المطری خصائص
 و اہل یک سابقاً فی کل ما و صفا۔ ہمیں پس گرچہ پس کلمہ تماشم کہ در سلک خریدارانش باشم
 و می باید کہ ملحدین و زنادقہ و کسے کہ سر مو مخالف شریعت محمدیہ باشند مجلس نکلند و باولیا
 اللہ و کمال صوفیہ حسن عقیدہ ثابت نمایند۔ امام شجرانی فرمودہ ایک و لجوم الا ولیا رفاہا مسمومہ و
 شطیحات آن حضرت بر مہا اکمن بر تحمل نیک فرود آزند۔ و اوقات خود را اولاً بادائے
 صلوٰۃ در اوقات مستحبہ و اقامت ارکان و واجبات و سنن و مستحبات بتفید جماعت و
 خشوع تمام معہور کنند و ایمان خود را درست کنند و ثانیاً بتلاوت قرآن و درود شریف
 اذکار نور علی نور نمایند۔ و پس ۵۵

گو بماندیم زندہ بر دوزیم
 در بر دیم عذر مایند پر
 دامنے کز فراق چاک شدہ
 اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ

الغرض آپ مکہ معظمہ پہنچ گئے اور وہاں آپ نے ذیل کی غزل کعبہ شریف کے
 سامنے کھڑے ہو کر کہی۔

۱۲۸۸ھ

زراہ دور بہ بیت الحرام می آیم
 گزشت عمر جوانی بخطِ نفسانی
 بصد نیاز و بصد احترام می آیم
 سفید ریش باب السلام می آیم
 بصد ضمانت تا ایں مقام می آیم
 طفیل حضرت خیر الانام می آیم
 باستغاثہ و طلب مرام می آیم
 بسا کہ تشلب و تلخ کام می آیم
 زلال رحمت خود وہ کہ تا شوم سیراب

ووقت موقوف عرفات را نیم لائق
چو خوانند تو برحمت بکام می آیم
گر بختم ز جراتم بسجی در میسین
پس از طواف بسوئے مقام می آیم
برائے نبی شیطاں رسیده بر حجرہ
پسے طواف بمسجد حرام می آیم
خودہ خلق را اخلاق بد بفضل خدا
بطلب رحمت رحماں مدام می آیم
مگر کہ کیش منی در مناشد و تر باں
امیدوار عنایت غلام می آیم

یہ وصیت مسطورہ بالا جو مولانا مروج نے اپنے بیٹوں (عبدالقادر اور عبدالعزیز) کے لیے تحریر فرمائی، فارسی زبان میں ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اتحاد۔ آج بروز پیر ۵ شوال ۱۲۸۸ھ کو یہ فقیر عبد اللہ جو غلام رسول کے نام سے مشہور ہے، محض فضل خداوندی سے حرمین شریفین کی زیارت کا عزم کر رہا ہے۔ میرا بیٹا عبدالقادر جو کہ آج نو برس کا ہو چکا ہے اور قرآن شریف پڑھنے کے بعد علم صرف میں نرادی تک کتابیں پڑھ چکا ہے اور فارسی کی بوستان اور گلستان پڑھ رہا ہے، نور چشمی محمد عبدالعزیز جو کہ ساڑھے تین برس کا ہو گیا ہے، میں انھیں وصیت کرتا ہوں کہ علم دینی یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تصوف کے حصول کو تمام معاملات پر مقدم قرار دیں، اسی کو بنیادی کام اور اساس ایمان ٹھہرائیں اور ہر اعتبار سے اسی کو مرکز توجہ بنائیں۔ بالخصوص صحبت محدثین کو اپنے لیے لازم قرار دیں اور یقین رکھیں کہ اہل حدیث ہی اہل اللہ کا گروہ ہے۔ علم دین سے فراغت کے بعد کسی شیخ کامل و مکمل کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ میرے خیال میں مولانا عبد اللہ غزنوی کے مرتبے کا اس زمانے میں کوئی اور شخص نہیں ہے۔ ان کی صحبت اکیسرا درجہ رکھتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت عبد اللہ غزنوی پیر کامل و مکمل ہیں۔ عبد القادر دہلوی قرآن مجید کے ترجمے کا آغاز اور عبد العزیز اپنی تعلیم کا آغاز یعنی بسم اللہ انہی سے کریں، اس لیے کہ یہ فقیر یقین رکھتا ہے کہ وہ اس عہد میں مثل جنید اور قطبہ حضرت یا نبید ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی صفت کہ لفظ اللان کے اوصاف کا احاطہ نہیں کر سکتا وہ اپنے ہر وصف میں صفت صالح کا نمونہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں خود ان کے حلقہ دامن سے وابستہ ہوں۔

ہیں بس گرچہ کلد قماششم کہ در سبک خریدارانش باشم
 اپنے بیٹوں کو وصیت کرتا ہوں کہ ملحدوں اور زندقوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور
 کسی ایسے شخص کی مجلس اختیار نہ کریں جو شریعت محمدیہ کا کسی صورت میں بھی مخالف ہو۔
 اولیاء اللہ اور باکمال صوفیائے ہمیشہ حسن عقیدت رکھیں۔۔۔ اپنے اوقات کو
 اوائے نماز، اقامت ارکان دین، واجبات و سنن اور مستحبات کی بجا آوری میں صرف کریں، عبادت
 کے پابند رہیں اور دلوں کو خشوع و خضوع سے معمور رکھیں۔ دوسری بات جس پر عامل
 رہنا ضروری ہے یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کو جزو زندگی بنائیں، اذکار و وظائف
 کو اپنا معمول ٹھہرائیں اور درود شریف کثرت سے پڑھا کریں۔ بس میری یہی وصیت ہے۔
 گر بماندیم زندہ برو و زیم دامنے کز فراق چاک شدہ
 و در بمرودیم عذر ما پسندیز اسے لبسا آرزو کہ خاک شدہ

تصنیفات

مولانا غلام رسول ہر شعبہ علم پر عبور رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ، صرف و نحو،
 معانی و بیان، ادب و انشا اور علم کلام سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس دور کی مروجہ
 زبانوں یعنی عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ پنجابی ان کی مادری زبان تھی انھوں
 نے فارسی اور پنجابی کو ذریعہ تبلیغ بنایا اور ان زبانوں میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن کے
 نام درج ذیل ہیں :-

۱۔ فتاویٰ مولوی غلام رسول :- یہ ان کے فقہی نوعیت کے فتاویٰ ہیں جو مختلف
 لوگوں کے مسئلہ مسائل پر مشتمل ہیں، اس زمانے میں علمی زبان عام طور پر فارسی کو سمجھا
 جاتا تھا اور فقہی مسائل اور فتوے اسی زبان میں تحریر کیے جاتے تھے۔ یہ
 فتاویٰ بھی فارسی میں ہیں۔

۲۔ رسالہ تراویح :- یہ بھی فارسی میں ہے اور نماز تراویح سے متعلق ہے۔

۳۔ حلیہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم :- اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، آنحضرت
 کا حلیہ مبارک بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ قصہ حضرت بلالؓ :- یہ پنجابی نظم میں ہے اور اس میں مشہور صحابی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے واقعات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ قصہ سستی پتوں :- یہ بھی پنجابی نظم میں ہے اور اس میں سستی پتوں کے نام سے خالص روحانی اور علمی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

۶۔ سسی صرنی :- یہ بھی پنجابی نظم میں ہے۔

۷۔ مجموعہ نماز :- یہ پنجابی میں مترجم نماز ہے

۸۔ تفسیر سورہ فاتحہ :-

۹۔ پنج باب :- یہ پنجابی نثر میں ہے اور پکی روٹی کے انداز پر اس میں فقہی مسائل ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

۱۰۔ پکی روٹی :- یہ بھی فقہی مسائل پر مشتمل ہے اور پنجابی نثر میں ہے۔

ان کتابوں میں سے بعض کتابیں کئی مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

شعر و شاعری :-

مولانا غلام رسول فارسی اور پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے دادا حافظ نظام الدین خادم کاشمار بھی اپنے دور میں فارسی کے مشہور شعرا میں ہوتا تھا۔ مولانا غلام رسول کے پنجابی اشعار میں بعض اردو کے الفاظ بھی ہیں۔ حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو روانگی کے وقت جو شعر کہے، ان میں سے چند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

بھم اللہ ہو یا فضل الہی	فراغت حج بیت اللہ سے پائی
مدینہ کی طرف ہوئی تیاری	کیتی حجاج اونٹوں پر تیاری
پہلے دن قافلہ ہو جمع سارا	کیتونے خاطر وی وادی آتارا
مدینہ طیبہ می وا جو آئی	کلیجے عاشقان سے ٹھنڈ پائی
وہ روضہ دُور سے نظری جو آیا	خدا اوہ نورد ا جلوہ دکھایا،
ادبے قافلے ہوئے پیادے	محبتِ غیر سے دل صاف سادے
مبارک شہر تھیں داؤں جو چلیاں	ہسے دل دکھڑے مانند کلیاں

صلواتاں دانگ بلبل دے پکاراں
 کیتی آج طالع بیدار یاری
 عجب وہ مسجد نبویؐ منور
 نہ جھلن اکھیاں وہ دیکھ انوار
 کہا ہن جی نے کیا سامان کرے
 مبارک روضہ مسجد دے کنارے
 اس نظم کا آخری شعر ہے :-

غلام ایہہ عین میرا مدعا ہے
 شکستہ شیشہ دل کا صدا ہے

گھر سے عازم حرمین شریفین ہونے سے پہلے ان کے دل کی جو کیفیت تھی اور دیارِ رسولؐ
 کی جو محبت ان کے قلب و روح میں کروٹ لے رہی تھی اس کا اندازہ ان کے
 مندرجہ تحت پنجابی اشعار سے کیا جاسکتا ہے :-

چلیں اس دیس نوں دے سار بانا
 چلا شتر ہو واں قربان تیری
 ہوئی رات جو روون نہیں میزے
 رسول اللہؐ دے کر کریا و آئنا ر
 مدینے میں پہنچا اک وار مینوں
 غبار اس راہ واسر مہ بتا واں
 جے پر ہوون تے ماراں اڈاری
 جتھے کیتا حبیب اللہ مکانا
 تیرے راہاں توں گھول جان میری
 کلیجے چھیک پاوون دین میرے
 الہنے مار بھڑکے شوق دیدار
 جیاتی میں بلا دلدار مینوں
 ہوواں صدقے اگر اک جہات پاواں
 دیکھاں روضہ جے طالع کرن یاری

صبار روضہ رسول اللہؐ دے جاہیں
 کہیں بعد از سیر لالہ بار صلوات
 جوئے محبوب و جمانی نگاہ کر
 میرا احوال رو رو کے سنائیں
 کروڑیں بار تسلیم و تحیات
 دھوڑے سے جان آئی لبالب پر

النبی عشق سے جل بل گھیا جی کہو اس درودا دارو کراں کی
خدا جانے جدوں کی باتیاں میں میرے بابل تیرے لڑائیاں میں
اس نظم کے یہ شعر ملاحظہ ہوں، کس قدر درود و سوز میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنی
کمزوریوں کا کس کس موثر انداز میں ذکر کیا گیا ہے :-

گناہاں نال میں نامر سیاہ ہوں بسا تقصیر مند و پڑگناہ ہوں
تغافل نال گذری عمر ساری گتیاں ستیاں، کھڑی رہیاں بچاری
کیا کرساں جو بھلکے کات منگسن آجلدی جیج بوے آن ڈھوسن
جدوں ڈولی کہاں اسن چانی اکیلے چھوڑ جاسن بھین مہانی
بیگانیاں نال ہے پرولیس جاناں نہیں پھرت نت ایس ویس آناں
علام ایہ پڑگناہ بے ساز و ساماں پھڑا محکم رسول اللہ دا داماں
اسی مضمون کے چند فارسی اشعار پڑھیے :-

گویم تو اے صبا پیامے در وادی عشق چند گامے
از ملک عجم مگر بر آئی در ناحیہ عرب در آئی
بادیدہ زار و دل نگارے در شہر مدینہ کن گزارے
ہیں روضہ پاک سرور دیں آل مضجع خاتم النبیین
بر دینی بہ تن کشیدہ در قبر شریف ارمیدہ
اس نظم کا آخری شعر ہے :-

از حد شدہ در و انتظارم

بر راہ تو دیدہ اشکبارم

مکہ معظمہ پہنچ کر آپ نے جو فارسی اشعار کہے ان میں سے چند یہ ہیں :-

۳۰ اپنے نام کی طرف اشارہ ہے کہ والدین نے میرا نام ہی غلام رسول رکھا ہے یعنی مجھے
وقت پیدائش ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بنا دیا گیا ہے۔

زیرا دور بہ بیت الحرام می آیم بصد نیاز و بصد احترام می آیم
گزشت عمر جوانی بحظ نفسانی سفید ریش باب السلام می آیم
برائے عفو جراتم بہ توبہ مستغفر بصد ندامت تائیں مقام می آیم
مدینہ منورہ جانے کے بعد آپ نے جو فارسی اشعار کہے، وہ یہاں درج کیے جاتے
ہیں۔ ابتدا میں یہ الفاظ مرقوم ہیں۔ ”مدینہ منورہ بروضہ طیبہ گفتہ شد ۱۲۸۹ھ“

شکر خدا چہ وقت سعید است و بختیار غنچہ مراد قلب شگفت از دم بہار
دیدم بچشم عشق مدینہ منورہ ایندم منزو کہ گوہر جاں را کنم نثار
یعنی شب وصال رسید است در حیات شب قدر ہا با فدائی بیساعتش بزار
ذوقش بجز حلاوت ایماں کجا چشید کذاب مدعی کہ از میں فیض برکت ار
تھا کہ چہ دولتیت کہ شد دستیاب من در دزباں کنم چو عنادل ہزار بار
اسادہ باداب بحضور محمدی صلوٰۃ ذاکیات و تحیات بے شمار
یار صل علی الذی اخترتہ واجتبتہ و علی تمامۃ الہ و علی صحابۃ الکبار
وہو النبی شفیعنا خیر البشر خیر الرسل ہو رحمة للعالمین کالشمس فوسط النہار
اے سرورد و عالم سلطان مرسلین بس مجرم شفاعت خود کن رفیق و یار
از جان و دل غلام رسولم مرا چہ غنم یک نیمہ نگاہ ترا ام امیدوار

مولانا غلام رسول بلاشبہ اپنے دور کے جید عالم، نامور فقیہ، بہت بڑے صوفی،
نہایت متقی اور پرہیزگار، مستجاب الدعوات اور ممتاز شاعر تھے۔ انہوں نے اگرچہ فارسی
میں بھی شعر کہے، لیکن ان کا زیادہ کلام پنجابی میں ہے۔ نظم اور نثر میں انہوں نے پنجابی زبان
کی بہت خدمت کی اور اپنے ماحول کے مطابق زیادہ تر اسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ
بنایا۔ فارسی میں انہوں نے فتوے تحریر فرمائے اور اس زمانے میں یہی رواج تھا۔ جو
لوگ فہمی نوعیت کے مسائل دریافت کرتے تھے، ان کو فارسی میں جواب دیا جاتا تھا اور
فارسی میں عربی عبارتیں بجزت درج کی جاتی تھیں۔ مولانا کے فتاویٰ بھی اسی نوعیت کے
ہیں اور ان میں عربی اور فارسی دونوں زبانیں مرقوم ہیں۔

ان کی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ تینوں زبانوں کے ادیب تھے۔ عربی کے بھی، فارسی کے بھی اور پنجابی کے بھی۔!

گزشتہ صفحات میں ان کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان کی ایک کتاب کا نام ”قصہ سستی پتوں“ ہے۔ یہ کتاب پنجابی نظم میں ہے اور سستی پتوں کے نام سے اس میں تصوف و روحانیت کا درس دیا گیا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے :-

بلوچا ظالماں سن دین میرے

کجا دایاردا دوئین میرے

ہر اعتبار سے یہ اُدنیچے درجے کا شعر ہے۔

وفات

قلعہ مہیل سنگھ میں مولانا غلام رسول کی مسجد میں ایک حافظ صاحب رہتے تھے، جو گاؤں کے بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے اور مسجد کے مؤذن تھے۔ ایک روز مولانا غلام رسول خلاف معمول ان کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس دن مولانا کی عمر کے ۶۳ سال پورے ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ حافظ صاحب بہت متذنب اور پرہیزگار تھے۔ مولانا نے ان سے فرمایا، حافظ صاحب! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، تم مجھ پر اللہ کا یہ خاص فضل رہا ہے کہ مجھ سے کسی ایسے عمل کا ارتکاب نہیں ہوا جو خلاف سنت ہو اور کوئی ایسا عمل ترک نہیں ہوا جو مسنون ہو۔ اب آخری سنت باقی رہ گئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ وہ بھی نصیب فرمادے تو زہے قسمت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پورے ۶۳ سال ہوئی ہے اور میری عمر بھی کل ۶۳ سال کی ہو جائے گی۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔

اتفاق سے دوسرے روز ساہیوال سے دو مہمان آگئے۔ مولانا نے نماز ظہر سے قبل اپنے بڑے لڑکے مولوی عبدالقادر سے فرمایا کہ ”قطب الدین درویش کو ساتھ لے کر گھر جاؤ اور وہاں سے دانے اٹھو اگر خراس پر لار کھو تاکہ آٹا پس جائے۔“ اس کے بعد ظہر کی اذان

ہوئی، آپ نے خود جماعت کرائی۔ نماز کے بعد دونوں مہانوں کو اپنے ساتھ لے کر حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت بالکل تندرست تھے، کسی قسم کی کوئی بیماری نہ تھی مہانوں کو تلقین کرنا شروع کی۔ پہلے مولوی فضل الدین صاحب کو کلمے کا ذکر کرایا۔ ایک بار کلمے کی ضرب دی۔ دوسری بار ضرب دے رہے تھے کہ روح مبارک جسیدِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہ صورت حال دیکھ کر مہان گھبرا گئے۔ مولوی فضل الدین صاحب جلدی سے باہر آئے اور مولانا کے بھائی حکیم غلام محمد سے کہا کہ مولوی صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ طبیبِ حاذق تھے۔ انھوں نے دیکھتے ہی فرمایا ”مولوی صاحب وفات پا گئے ہیں“۔ یہ خبر پہلے قلعہ مہاں سنگھ میں پھیلی، اس کے بعد آنا فانا گرو و نواح کے دیہات میں پہنچ گئی۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے، متعدد طبیب بھی آ گئے۔ اطباء نے کہا کہ مولانا کی موت واقع نہیں ہوئی، ان کو سکھتہ ہو گیا ہے، انھوں نے آپ کو رمی لگائی، لیکن حکیم غلام محمد بار بار یہی کہتے رہے کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔

حکیم غلام محمد مرحوم نے تمام اطباء اور باقی لوگوں سے کہا کہ ہمارے خاندان میں یہی معاملہ چلا آ رہا ہے۔ ان کے والد مولوی رحیم بخش نے بجاالتِ تندرستی نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں جان دی۔ دادا صاحب حافظ نظام الدین خادم نے حالتِ رکوع میں وفات پائی۔ یہی معاملہ مولوی صاحب کو پیش آنا تھا جو آ گیا۔

مولانا غلام رسول جمعرات کو ظہر اور عصر کے درمیان فوت ہوئے اور جمعہ کے دن انھیں دفن کیا گیا۔ جنازے میں بے شمار لوگ جمع تھے۔ یہ ۱۲۹۱ھ کا واقعہ ہے۔

اللہ اللہ! کتنے پاک باز تھے یہ لوگ، والدِ مکرم نے بارگاہِ الہی میں زمین پر پیشانی رکھ کر حالتِ سجدہ میں اللہ کے حضور حاضری دی۔ جدِ امجد نے اللہ کے دربار میں بھکتے ہوئے رکوع کی حالت میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی اور بیٹے اور پوتے نے کلمہ طیبہ پڑھتے اور اس کی تلقین کرتے ہوئے وفات پائی، اور ان کی یہ دعا اور تمنا

پوری ہوئی کہ ٹھیک ۶۳ سال میں یعنی عمر نبوت کو پہنچ کر اس دُنیلے فانی سے کوچ کیا۔
اللہ نے ان کو ہمیشہ اپنے سایہ عاطفت میں رکھا اور جو دعائوں نے کئی اُسے شرف قبول
حاصل ہوا۔ ان کی یہ آخری دعا بھی قبول ہوئی اور انہوں نے ٹھیک ۶۳ سال عمر
پائی۔ اللہ ان کو اور ان کے آبا و اجداد کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

اللہم اغفر لہم وارحمہم وعافہم واعف عنہم و

ادخلہم فی جنت الفردوس -

اولاد و احفاد

مولانا غلام رسول کے دو بیٹے تھے۔ بڑے مولوی عبدالقادر اور ان سے چھوٹے
مولوی عبدالعزیز۔

مولوی عبدالقادر کے چار بیٹے تھے۔ عبدالملک، عبدالرشید، محمد صادق
اور عبدالوکیل۔

مولوی عبدالعزیز کے بھی چار بیٹے تھے۔ عبدالواحد، محمد شفیع، محمد اشرف اور
عبدالرحمن۔

یہ بالکل مختصر سلسلہ اولاد ہے۔ ان سے آگے ان کی اولاد و احفاد کا سلسلہ
ما شاء اللہ بہت وسیع ہے۔

۶۔ خلیفہ غلام رسول لاہوری

لاہور کو ہمیشہ مرکزِ علما اور مجمعِ فضلا کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تیرھویں صدی ہجری
اور انیسویں صدی عیسوی میں جن عظیم شخصیتوں نے اس شہر میں جنم لیا، ان میں مولانا غلام رسول
بن مولانا غلام فرید لاہوری کا اسم گرامی لائقِ تذکرہ ہے۔ مولانا غلام رسول اپنے فضل و کمال
اور نامور باپ مولانا غلام فرید کے مسند نشین ہونے کی بنا پر لوگوں میں خلیفہ غلام رسول
کے نام سے معروف تھے۔ حنفی المسک تھے اور فقہ و اصول اور دیگر علوم مرہوجہ میں

بھارت رکھتے تھے۔ مشکل مسائل کے حل و کشود کے لیے اس دور کے علمائے لاہور انہی سے رجوع کرتے تھے۔ لاہور کی مسجد موران جو پاپڑ منسٹری میں واقع ہے، ۱۲۲۴ھ میں تعمیر ہوئی، اس مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا جس میں بہت سے طلباء حصولِ علم کرتے تھے، اس مدرسے کی مسند تدریس پر ہی مولانا غلام رسول لاہوری متمکن تھے اور ان کے برادرِ صغیر مولانا غلام اللہ اس کا رخبر میں ان کے معاون تھے۔ رائے بہادر کنہیا لال نے اپنی کتاب تاریخ لاہور میں ان دونوں بھائیوں کا ذکر عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "لاہور میں سکھی عہد میں مولوی خلیفہ غلام رسول اور خلیفہ غلام اللہ تھے۔ بڑا مدرسہ ان کا جاری تھا۔ ہزاروں طلباء درویش دُور دُور ملکوں سے وہاں آکر تعلیم پاتے تھے۔ تمام زمانہ ان کا بے دل و جان ادب کرتا تھا۔ ہنود و اہل اسلام سب ان کے شاگرد کہلاتے۔"

خلیفہ غلام رسول کا حلقہ تلامذہ بہت وسیع تھا جن میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثیر تعداد میں شامل تھے اور ان سے مستفیض ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ خلیفہ غلام رسول نے اپنے والد گرامی مولانا غلام فرید سے استفادہ کیا تھا اور اس عہد کے تمام علوم متداولہ پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ وہ پنجاب میں سکھوں کا دورِ حکومت تھا اور اس دور میں خلیفہ صاحب مدوح نے بہترین علمی و تدریسی خدمات انجام دیں، بلاشبہ یہ جامع علومِ نقلیہ و عقلیہ تھے۔ تصوف کے سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں وفات پائی۔

مفتی غلام سبجان بہاری

مفتی غلام سبجان بہاری اپنے عہد کے علامہ اور شیخ و فاضل بزرگ تھے اور

۱۳۱ھ تاریخ لاہور ص ۷۷۔ حدائق الحنفیہ ص ۲۷۲۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۴۔

ترتیب الخواطر ج ۷ ص ۳۵۴۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۹۰۔

دیارِ ہند کے علمائے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولد و منشا بہار تھا۔ مولانا معظّم الدین اور دیگر علمائے عصر سے تحصیلِ علم کی فراغت کے بعد اپنی علمی و فقہی قابلیت کی بنا پر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مسند تدریس پر فائز کیے گئے۔ مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر وہاں کے افتا کا منصب ان کے سپرد کیا گیا۔ بعد ازاں کلکتہ اور بنگال کے قاضی القضاۃ کے عہدہ جلیلہ پر متمکن ہوئے۔ یہ ایک بہت بڑا منصب تھا جس پر متمکن ہونے کا انہیں فخر حاصل ہوا۔ فقہ اور دیگر علوم میں کامل دسترس رکھتے تھے، اور اپنی بوقلموں صلاحیتوں کی بنا پر ارباب حکومت اور اصحاب دولت کی نظروں میں بہت عزت و احترام کے حامل تھے۔ — بلاشبہ تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں یہ جمید عالم و فقیہ تھے۔

۸۔ قاضی غلام علی ہاشمی سورتی

قاضی غلام علی ہاشمی سورتی کے والد ماجد کا نام قاضی جمال الدین اور جد امجد اسم گرامی قاضی عبداللہ تھا۔ اس خاندان کے تمام ارکان تحقیق و کاوش کے ولدان اور فضل و کمال کے حامل تھے۔ صوبہ گجرات کے شہر سورت کی مسند افتا و قضا ان کو ورثے میں ملی تھی اور فقہ و کلام اور دوسرے علوم پر ان سب کو عبور و استحضار تھا۔ قاضی عبداللہ ہاشمی سورتی کے مفتی اور قاضی تھے اور مختلف مسائل میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔ قاضی عبداللہ کے بعد ان کے بیٹے قاضی جمال الدین ہاشمی نے یہ منصب سنبھالا اور سورت کے قاضی اور مفتی ہوئے۔ ان کی وفات ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۶ھ کو ہوئی۔ قاضی جمال الدین کے سفر آخرت پر روانہ ہونے کے بعد ان کے صاحب زادے قاضی غلام علی ہاشمی کو سورت کے منصب قضا و افتا پر متمکن ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

قاضی غلام علی ہاشمی اپنے عہد اور علاقے کے جلیل القدر فقیہ تھے اور فقہائے حنفیہ میں ان کو نہایت اعزاز و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سورت

اور اس کے نواح کے قاضی اور مفتی تھے۔ جو مشکل فقہی مسائل پیش آتے ان کی عقدہ کشائی کے لیے انہی کے باب علم پر دستک دی جاتی تھی۔

ان کی علمی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ فرانسس انٹا و قضا کی انجام دہی کے علاوہ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا اور بہت سے تشنگانِ علم ان کے حشرہ فیض سے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔

اس ہندی عالم و فقیہ نے ۲۲ رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ کو اپنے آبائی شہر سورت میں وفات پائی۔

۹۔ شیخ غلام علی مجددی دہلوی

برصغیر کے تیرھویں صدی ہجری کے علما و فقہاء میں جنہوں نے زمرہ صوفیاء میں شہرت پائی، مولانا شاہ غلام علی دہلوی کا اسم گرامی مسرفرست ہے۔ وہ بجا طور پر شیخ اشپوخ اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ ان کا اصل وطن بٹالہ تھا جو مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کا مشہور شہر ہے۔ مختلف اوقات میں یہ شہر اصحابِ علم اور اربابِ فضیلت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ایک خاندان علوی سادات کا تھا، اس خاندان کے بزرگوں میں شاہ غلام علی کے والد ماجد شاہ عبداللیف بٹالوی بہت مشہور تھے جو زہد و عبادت اور تقویٰ و قناعت میں عالی مرتبہ پر فائز تھے۔ دنیا اور امور دنیا سے منقطع ہو کر جنگوں کی تنہائی میں جا کر ذکرِ الہی میں مشغول ہو جاتے اور کئی کئی مہینے اسی عالم میں گزار دیتے۔ شاہ ناصر الدین قادری کے مرید تھے اور عوام و خواص میں بہت تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شاہ غلام علی نے اس صاحبِ تقویٰ باپ کے گھر ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۵ء) میں جنم لیا۔ شاہ غلام علی کے علمِ محترم بھی دینداری اور صالحیت کا پیکر تھے، جنہوں نے سرسید احمد خان

تیرھویں صدی ہجری

کے بقول ”رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارت سرپاٹشات سے عبداللہ آپ کا نام رکھا لیکن ”غلام علی“ کے نام سے مشہور ہوئے۔

شاہ غلام علی سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک بٹالہ اور اس کے گرد و نواح میں رہے اور وہیں کے اساتذہ سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس زمانے میں ان کے والد شاہ عبداللطیف کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا اور وہ شاہ ناصر الدین قادری سے بیعت تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے فرزند دلہند کو بھی اسہنی کے حلقہ بیعت میں شامل کر دیں۔ چنانچہ باپ کی خواہش کے مطابق ۱۱۷۴ھ میں انہوں نے دہلی کا قصد کیا لیکن جس دن وہ دہلی پہنچے اسی دن شاہ ناصر الدین قادری کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد والد بزرگوار نے سعادت مند بیٹے سے کہا کہ اب جس کی چاہیں بیعت کر لیں۔ اس اثنا میں پورے چار سال مختلف بزرگوں کے آستانوں پر حاضر ہوتے رہے۔ اس وقت دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا سلسلہ درس جاری تھا، شاہ غلام علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں کا درس لیا، اور سند فراغت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس دوران میں حضرت شاہ رفیع الدین سے بھی استفادہ کیا۔ اب وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم رسمہ کی تکمیل کر چکے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) میں مرزا منظر جان جاناں کے آستانہ رشد و ہدایت پر پہنچے اور ان کے حلقہ بیعت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت عمر کی بائیس منزلیں طے کر چکے تھے اور بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ مرزا صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور یہ شعر پڑھا۔

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم

سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

(سجدۂ عشق کے لیے میں نے ایک آستان پالیا، مجھے تو ایک سرزمین کی ضرورت

تھی لیکن میں نے آسمان پالیا۔)

بیعت کے بعد پندرہ سال مرشد کی مجلس ذکر و شغل میں بسر کیے اور مجاہدہ و ریاضت

کی مختلف منزلیں طے کیں، یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحب ارشاد ہوئے۔ اُنہوں نے بیعت تو سلسلہ قادریہ میں کی تھی، لیکن ذکر و اذکار اور شغل و اشغال طریقیہ، نقش بندہ مجددیہ میں جاری کیا اور تمام طرق تصوف کی اجازت حاصل کی۔ اپنے مرشد مرزا منظر جان جانال کی شہادت (۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء) کے بعد ان کے سجاوہ نشین ہوئے اور تمام صوفیائے عصر پر فوقیت لے گئے تاہم وفات پورے پینتالیس سال مسند ارشاد پر متمکن رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفیض فرمایا۔

شاہ غلام علی نہایت پابند سنت اور متوکل علی اللہ تھے۔ اس دور کے امرا اور بادشاہ چاہتے تھے کہ ان کی خدمت کریں اور خانقاہ کو مالی امداد دیں، لیکن شاہ صاحب نے ان کی یہ پیشکش کبھی قبول نہ فرمائی۔ ایک دفعہ والی ٹونک نواب امیر محمد خاں نے انتہائی التجا سے ان کے اور خانقاہ کے درویشوں کے لیے وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ جواب میں ان کو یہ شعر لکھ بھیجا۔

ما ابروئے فقر و قناعت نمی بریم

با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

دہم فقر و قناعت کی آبرو ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے، امیر خاں سے کہہ دو کہ روزی اللہ کے ہاں سے مقرر ہے)

ان کی ذات سے بے شمار لوگوں نے فیض پایا اور بہت سے ملکوں کے لائق افراد نے حاضر خدمت ہو کر ان سے بیعت کی۔ ہندوستان کے علاوہ ترکی، شام، بغداد، مصر، چین، افغانستان، کردستان اور حبش کے لوگ ان کے آستانے پر حاضر ہوئے اور شرف ارادت حاصل کیا۔ وہ عوام و خواص کا مرکز عقیدت اور مرجع خلافت تھے۔ کہنا چاہیے۔

چو کعبہ قبلہ حاجت شد از دیار بعید

روند خلق بدیدارش از بسی فرسنگ

رچونکہ کعبہ مرکز حیات قرار پایا ہے، اس لیے لوگ دور دور کا سفر کر کے اس

کی زیارت کے لیے آتے ہیں)

ان کی خانقاہ میں ہر وقت کم و بیش پانچ سو فقیر اور درویش رہتے تھے جو ان سے فیض حاصل کرتے تھے اور باوجودیکہ امداد کے لیے کہیں سے باقاعدہ ایک حتمی بھی مقرر نہ تھا، لیکن سب کے کھانے پینے اور لباس کا وہ خود ہی انتظام کرتے تھے، اور یہ تمام سلسلہ اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد سے چلتا تھا۔ فیاضی اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا، جس نے جو مانگا دے دیا۔ جو اچھی اور عمدہ چیز بطور تحفہ کہیں سے آتی، اس کو بیچ کر فقرا پر خرچ کر دیتے۔ جو موٹا کھسوٹا لباس خانقاہ کے درویشوں کو میسر ہوتا، وہی خود بھی پہنتے، جو کھانا عقیدت مند کھاتے، وہی آپ تناول فرماتے۔

خاک نشینی است سلیمانیم

ننگ بود افسر سلطانیم

ہست بے سال کہ می پوشمش

کہ نہ شد حمامہ عریانیم

امیر سلیمانی خاک نشینی ہے میرے لیے سلطان کا تاج باعث ننگ ہے۔

بہت مدت سے میں لباس عریانی پہن رہا ہوں، لیکن ابھی تک وہ لباس پُرانا نہیں ہوا۔ یعنی حرص و طمع اور مخز و غرور سے میرا دل پاک ہو گیا ہے۔
اگر کبھی اسبابِ مادی اور سامانِ دنیا کا ذکر آتا تو بیدل کا یہ شعر پڑھتے۔

حرص نالغ نیست بیدل در نہ اسباب جہاں

ہر چه ما داریم ز اں ہم اکثرے در کار نیست

رے بیدل! حرص میں قناعت ہی نہیں ہے، ورنہ ہمارے پاس جو کچھ ہے اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یعنی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہماری ضرورت سے زائد ہیں)

ان کے شب و روز کا زیادہ حصہ عالم بیداری میں گزرتا، بہت کم سوتے، زیادہ تر مصروفِ عبادت رہتے۔ نیند غالب آتی تو جاننا ز پرہی سو جاتے۔ خانقاہ میں پوربا

کافر ش اور بوریہی کا مصطلی تھا۔ وہیں چڑے کا ایک تکیہ تھا، دن رات اسی مصطلے پر نشست
رہتی اور تمام وقت عبادت میں بسر ہوتا۔ طالبین ارد گرد حلقہ بنا کر بیٹھے رہتے۔ اگر کوئی شخص
فرش کے لیے کہتا تو جواب میں سکندر لودی کے معاصر جمالی کے یہ شعر پڑھتے :-

لنگے زیر و ننگے بالا نے غم و زور نے غم کالا

گز کے بوریہ و پوسکے وکے پڑ زور دوستکے

ایں قدر بس بود جمالی را عاشق رند لا ابالی را

را ایک لنگی نیچے اور ایک لنگی اوچھو سی ہمارا لباسی ہے، جس کے سبب نہ تو کسی چور
کا ڈر ہے اور نہ کسی سامان کا غم۔

ایک گز بوریہ اور پوسکیں اور ایسا دل جو درد اور دوست کی آرزو سے پڑے۔

جمالی کے لیے جو ایک عاشق اور رند لا ابالی ہے، یہی بہت ہے۔

انہوں نے احکام شریعت سے کبھی تجاوز نہ کیا، ہمیشہ امور سنت کو پیش نظر رکھا،
مال مشتبہ ہرگز قبول نہ کرتے، جو شخص خلاف شرع اور خلاف سنت کوئی حرکت کرنا
اس سے نہایت خفا ہوتا اور اس کا اپنے قریب آنا گوارا نہ کرتے۔ اس سے مخاطب
ہو کر فرماتے :-

یا مرو یا یا ر اریق پیس رہن

یا بہ کش برخانماں انگشت نیل

یا مکن یا سپلیاناں دوستی

یا بنا کن حساۃ در خورد پیل

دیا تو نیلے لباس دلے دوست کے پاس نہ جا، یا پھر خاندان پر نیل کی انگلی پھیرے۔

یا تو ہاتوں کے ساتھ دوستی نہ رکھ، یا پھر ہاتھی کے لائق اپنا گھر بنا۔

مطلب یہ کہ ہمارے شریک مجلس ہونا چاہتے ہو یا ہماری صحبت و رفاقت میں آنے کا

ارادہ ہے تو ہمارا رنگ اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ احکام شرع کی مخالفت

بھی کرو اور ہمارے حلقے میں بھی بیٹھو۔ یہ دو عملی یہاں نہیں چلے گی۔

شاہ غلام علی نے اپنے اوقات شبِ روز کا ایک نقشہ بنا رکھا تھا جس پر وہ سختی سے عمل کرتے تھے۔ نمازِ فجرِ اول وقت میں ادا کرتے، اس کے بعد تلاوتِ قرآن مجید ہوتی، وہ قرآن کے حافظ تھے اور قرأت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اشراق تک حلقہٴ مریدین میں بیٹھے اور صوفیاء کے طریقے کے مطابق توجہ اور استغراق کا سلسلہ جاری رہتا۔ نمازِ اشراق سے فارغ ہو کر تفسیر اور حدیث کا درس دیتے۔ پھر تھوڑا سا کھانا کھا کر سنتِ نبویؐ کے مطابق قیلولہ کرتے۔ بعد ازاں اول وقت نمازِ ظہر ادا کی جاتی۔ پھر طلباء و مریدین کو تفسیرِ حدیث، فقہ اور تصوف کی کتابیں پڑھاتے۔ فقہی مسائل کی بھی وضاحت فرماتے، نمازِ عصر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ عصر کی نماز سے اول وقت میں فراغت کے بعد مریدین کا حلقہ قائم ہوتا۔ عشا کے بعد وظائف میں مشغول ہو جاتے اور اسی حالت میں نیند آ جاتی پھر تہجد کے لیے اٹھ جاتے۔ عقیدت مندوں کو بھی نمازِ تہجد کی تاکید فرماتے۔

پلاشبہ شاہ صاحب مدوح تیرھویں صدی ہجری کے جدید عالم، نامور صوفی، عظیم المرتبت فقیہ، عابد و زاہد اور صاحبِ فضل و کمال بزرگ تھے۔ ان کی وجہ سے دیارِ ہند کی روحانی دنیا میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوا، اور لوگوں کے قلب و ذہن کی دنیا متغیر ہوئی۔ اسی بنا پر ان کے عقیدت مند ائمہ تیرھویں صدی کا مجدد و قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ تو بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقہٴ عقیدت میں شامل تھے ہی، دیگر اسلامی ممالک کے بھی بے شمار حضرات ان سے مستفیض ہوئے اور پھر انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر دینِ خالص کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا۔

شاہ غلام علی نے شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی، لیکن دہلی میں ان کی خانقاہ تصوف شاہ عبدالعزیز کے حلقہٴ درس کا مقابلہ کرتی تھی اور ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ انتہائی وسعت اختیار کر گیا تھا۔ ان میں بیک وقت دو مہتمم بالشان اوصاف پائے جاتے تھے۔ یعنی طریقِ ولی اللہی کا اعتدال و توازن اور علم و عرفان بھی ان میں مبدعہٴ اتم موجود تھا، اور مجددِ ملت ثانی کے جذبہٴ حیائے دین

ذوق تصوف اور ولولہ اتباع سنت سے بھی پوری طرح بہرہ مند تھے۔ علوم عقلی و نقلی کے ماہر اور تبلیغ و اشاعت دین کے دلدادہ تھے۔

سر سید احمد خاں کے والد ماجد سید محمد متقی مرحوم کے شاہ صاحب بہت کرم فرماتے تھے۔ سید احمد خاں کی ولادت کے وقت ان کے والد نے شاہ صاحب کو گھر تشریف لانے کے لیے عرض کیا، وہ آئے اور نومو لوہ کے کان میں اذان دی اور سلسلہ مجددیہ کے امام حضرت محمد و الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے نام پر نیچے کا نام احمد رکھا۔ سید احمد سے شاہ صاحب پوتوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ سید احمد بھی ان کا انتہائی احترام کرتے اور انہیں ”دادا حضرت“ کہتے تھے۔ سر سید نے ”آثار الصنادید“ میں نہایت عقیدت و احترام سے ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے انداز تبلیغ، اتباع سنت اور علم مرتبت کی عمدہ طریقے سے وصناحت کی ہے۔ ان کے والد ماجد، افراد خاندان اور خود سر سید سے ان کو جو محبت و عودت تھی اور پھر سر سید کا خاندان ان سے جو عقیدت و احترام رکھتا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سر سید لکھتے ہیں :-

”میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے والد ماجد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی، اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آذادہ مزاج اور وارستہ طبع تھے کبھی کبھی بموجب اس مصرع کے

کرم ہائے تو مارا گستاخ کرد

کوئی بات گستاخانہ عرض کرتے یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بار بار ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں نے اپنے تئیں غم زن و فرزند سے دور رکھا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت فرزندوں سے سوا دے دی۔ جو چاہو سو کہو اور جو چاہو سو کرو۔ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور

آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصتے پر بٹھالیے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ تیز تو ہوتی نہیں، خصوصاً صغیر سن میں جو چاہتا سو کہتا، جو چاہتا سو کرتا اور حرکات بے تیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے۔ میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا... بیالیس سال تک آپ کی ذاتِ فیضِ آیات سے یہ عالم متور رہا۔“

شاہ صاحب کے تلامذہ اور مسترشدیں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اس میں ہندوستان کے ہر علاقے اور اسلامی ملکوں کے اربابِ کمال شامل تھے۔ ان میں سے جن حضرات نے خاص طور سے شہرت پائی، ان میں سید اسماعیل مدنی، شیخ احمد کردی، شیخ خالد رومی، شیخ محمد جان باجوری، شیخ ابوسعید دہلوی، ان کے بیٹے مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا یوسف احمد رام پوری، مولانا بشارت اللہ بہرائچی اور سید ابوالقاسم حسینی واسطی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان تمام حضرات نے بے پناہ دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ خالد رومی نے اپنے وطن ترکی واپس جا کر مرشد کے علم و تصوف کو خوب پھیلایا اور تمام دولت عثمانیہ میں اس کی تبلیغ و اشاعت کی۔ وہ ترکی کے بلند پایہ علما میں سے تھے، عربی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے مرشد شاہ غلام علی کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے، ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے:-

خبر از من وہید آں شاہِ خوباں را بہ پہنہانی

کہ عالم زندہ شد بار و گرازا بر نیسانی۔

(حسینوں کے اس بادشاہ کو میری طرف سے یہ خبر پوشیدہ طور پر پہنچا دو کہ ابر نیسانی

کی بدولت دنیا ایک مرتبہ پھر زندہ ہو گئی ہے)

اس سے آگے چل کر کہتے ہیں:-

امام اولیا سیاحِ پیدائے خدائینی
ندیم کبریا، ملاجِ دریائے خدادانی

ہیں راہنمایاں شمع اولیائے دین
چراغِ آفرینش، مہرِ برجِ دانش و بنیش
دلیل پیشوایانِ قبلہ اعیانِ روحانی
کلیدِ گنجِ حکمتِ محرمِ اسرارِ سبحانی
امینِ قدسِ عبدالقہشے کز التفاتِ او
وہ سنگِ سیاہِ خاصیتِ لعلِ بدخشانی

ان اشعار کا ترتیب وار ترجمہ یہ ہے :-

وہ اولیا کا امام اور خدا بینی کا ظاہر سیاح ہے۔ وہ کبریا کا ندیم اور پیشواؤں کے

سمندر کا ملاح ہے۔

وہ راہنماؤں کا سردار اور تمام اولیائے دین کی شمع ہے۔ وہ حکمت کا رہبر اور

روحانی بزرگوں کا قبلہ ہے۔

وہ خلقت کا چراغ اور دانش و بنیش کے بُرج کا سورج ہے۔ وہ حکمت کے

خزانے کی چابی اور اسرارِ سبحانی کا محرم ہے۔

قدس کا امین یعنی عبداللہ ایک ایسا بادشاہ ہے جس کی عنایت و توجہ سے

سنگِ سیاہ میں لعلِ بدخشانی کی خاصیت پیدا ہو گئی ہے۔

شاہِ غلامِ علی کے زمانے کو سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے دورِ زوال سے

تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن علمی اور روحانی لحاظ سے یہ نہایت عروج کا زمانہ تھا۔ اس

میں لا تعداد علما و مشائخ کے درس و تدریس اور تصوف و سلوک کے حلقے قائم

تھے، جن کے اثر و رسوخ اور شہرت و قبولیت کے دائرے برصغیر کی سرحدوں

سے بھی آگے نکل گئے تھے اور بہت سے اسلامی ملکوں تک پھیلنے چلے گئے تھے۔

دہلی کے افق پر اس وقت علم و معرفت کا جو شامیانہ تنا ہوا تھا، اس کے متعلق شیخ

خالد رومی کہتے ہیں :

بہ دہلی ظلمتِ کفر است، گفتند وہ بہ دل گفتم

بہ ظلمتِ رواگر در جستجوئے آبِ حیوانی

یعنی مجھے بتایا گیا کہ دہلی میں کفر کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے دل

سے کہا کہ اگر تجھے آبِ حیات کی ضرورت ہے تو پھر تاریکی ہی کی طرف چل۔

بہر حال شاہ فلام علی دہلوی دنیائے تصوف و طریقت کے بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ علوم عقلی و نقلی کے بھی ماہر تھے۔ ان کے ملفوظات ”درالمعارف“ کے نام سے ان کے ایک مرید مولانا رفوف احمد رام پوری نے مرتب کیے جو دینی، تاریخی اور معاشرتی حیثیت سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر مروجہ علوم کے ماہر تھے اور ان علوم کا باقاعدہ طلباء کو درس دیتے تھے۔ انہوں نے تمام عمر شادی نہیں کی، تخریق کی زندگی بسر کی، وظائف و کمزاد، تعلیم و تدریس اور تلاذہ و مریدین کی ذہنی و روحانی اور علمی تربیت ہی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ اس عالم اجل اور ولی کامل نے ۱۲ — صفر ۱۲۴۰ھ کو دہلی میں وفات پائی اور بہت بڑی تعداد میں لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے **فیلہ اللہو برد مضجعه ووسع مدخله**۔

۱۰۔ مفتی غلام غوث گوپاموی

مفتی غلام غوث محمدی گوپاموی شیخ و فاضل اور علامہ وقت تھے۔ تیسویں صدی ہجری کے مشہور علما اور نامور فقہاء میں گروانے جاتے تھے۔ درس نظامیہ کی مشہور کتاب ”سلاہ العلم“ کے شارح قاضی مبارک گوپاموی کی اولاد سے تھے اور اپنے وسعت علم و مطالعہ کی بنا پر حلقہ علما میں عزت و احترام کا مقام رکھتے تھے۔ عمر کے ابتدائی دور ہی میں حصول علم کا شوق ان کے دل میں کر دھ لگ گیا تھا، چنانچہ صغیر سنی ہی میں مدراس کا

۳۵۔ اسمار الصنادید ص ۲۰ تا ۲۱۲۔ واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۱۵۳ تا ۱۵۵۔

نزهة الخواطر ج ۱ ص ۳۵۶ تا ۳۵۸۔ رود کوثر ص ۶۴۹ تا ۶۵۷۔ تذکرہ علمائے ہند

ص ۱۵۵۔ علم و عمل ج ۱ ص ۲۶۰۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۶۹۳ تا ۶۹۸۔ گلزار اولیا

ص ۷۴ تا ۷۵

عزم کیا اور قاضی ارتضاعلی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ قاضی صاحب مدوح ان کے ہم وطن تھے اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور خوب استفادہ کیا۔ حصول علم سے فراغت کے بعد ان کی شہرت علمی مختلف علاقوں میں پہنچی تو انھیں علاقہ مدد اس کے ایک شہر گنتور کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ طویل عرصے تک یہ خدمت انجام دی۔ محکمہ قضا کے ساتھ افتا کا منصب بھی ان کے سپرد ہوا، علاوہ ازیں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ گنتور اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کو ان سے بہت فیض پہنچا۔

اسی اثنا میں بیمار پڑ گئے اور یہ بیماری ان کی زندگی کی آخری بیماری ثابت ہوئی۔ علاج کی غرض سے گنتور سے نکلے اور حیدرآباد (دکن) کو روانہ ہوئے۔ لیکن حیدرآباد سے چار میل کے فاصلے پر انتقال کر گئے۔ یہ ۱۲۳۲ھ کا واقعہ ہے۔

۱۱۔ مولانا غلام فرید لاہوری

مولانا غلام فرید لاہوری فقہ و اصول اور دیگر علوم مروجہ میں کامل درک رکھتے تھے۔ اس دور زوال میں انھوں نے بلدہ لاہور میں نہایت علمی و تدریسی خدمات انجام دیں۔ علوم ظاہری میں تو درجہ کمال پر فائز تھے ہی، علوم باطنی میں بھی اس عہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ عابد و زاہد اور ذاکر و مشاغل عالم دین تھے۔ عمر بھر مشغول درس و تدریس رہے اور حالت گوشہ گیری میں خدمت علم و فن کی۔ ارباب دنیا اور اصحاب عز و جاہ سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ ان کا اصل کام طلباء کو تعلیم دینا یا مطالعہ کتب میں مصروف رہنا اور یا پھر عبادت خداوندی تھا۔ اس کے علاوہ دوسری کسی چیز کو مرکز توجہ نہ قرار دیتے۔

ان کے دو بیٹے بھی اس سلسلے میں اہمیت کے نقش قدم پر چلے۔ ایک خلیفہ غلام سہول اور دوسرے خلیفہ غلام اللہ۔ انہوں نے باپ کی روایات علمی و تدریسی کو زندہ رکھا اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی علمی خدمت انجام دیتے رہے۔ جس طرح باپ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے، اسی طرح سعادت مند بیٹوں نے بھی بے شمار لوگوں کو علم کی راہ پر لگایا اور ان کی ذہنی و فکری تربیت کا فریضہ انجام دیا۔

یہ تمام حضرات فقہی نقطہ نظر سے حنفی تھے۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح کے تمام حلقوں میں اپنے تئیں و تقویٰ اور فضل و کمال کی وجہ سے اکرام و اعزاز کے مستحق گردانے جاتے تھے۔

مولانا غلام فرید لاہوری کا انتقال ۱۲۱۶ھ کو میں لاہور میں ہوا۔

۱۲۔ مولانا غلام قادر گوپاموی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر گوپامو کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ اس میں متعدد علماء فقہانے جنم لیا اور بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد فاخر تھے جو اپنے عہد کے ممتاز اصحاب علم میں سے تھے۔ ان کے بیٹے مولانا عبدالحق گوپاموی تھے، جنہیں بحر العلوم مولانا عبدالحق فرنگی محلی لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ پھر مولانا عبدالحق کے صاحب زادہ گرامی قدر مولانا غلام قادر گوپاموی تھے جو علوم متداولہ میں یگانہ روزگار تھے۔ قاضی ارتضاعلی گوپاموی کے شاگرد تھے، جن کا مدراس میں حلقہ درس قائم تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا غلام قادر نے بھی مدراس کو اپنی تدریسی و تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور طویل عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ اس علاقے میں ان کی مساعی جمیلہ سے لوگوں نے خوب استفادہ کیا اور

۳۷ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۵، ۱۵۶۔ حدائق المنقبیہ ص ۲۶۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۵۹۔

کثیر تعداد میں اہل علم نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔
 مولانا غلام قادر گویا مومی جہاں درس و تدریس میں ممتاز تھے وہاں تصنیف و تالیف
 کے میدان میں بھی انہوں نے جگ و تاز کی اور فقہ و عقائد کے موضوع پر کئی رسائل
 لکھے لیکن افسوس ہے ان رسائل کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ صرف یہی بتا چلی سکا
 ہے کہ فقہی مسائل اور عقائد میں انہوں نے تصنیفی خدمات انجام دیں۔ اس عالم اہل
 نے ۲ ربیع الاول ۱۲۹۳ھ کو مدراس میں وفات پائی۔

۱۳۔ خلیفہ غلام اللہ لاہوری

خلیفہ غلام اللہ لاہوری اپنے عہد کے لاہور میں فاضل اجل اور عالم اہل تھے۔
 مولانا غلام فرید لاہوری کے فرزند نامور اور خلیفہ غلام رسول لاہوری کے برادر صغیر
 تھے۔ ورع و تقویٰ، زہد و عبادت، درس و تدریس عرض طرز حیات کے تمام
 پہلوؤں میں اپنے والد عالی قدر اور بہادر کبیر کا نقش حسین تھے۔ ان کا زمانہ لاہور
 میں سکھ حکومت کا زمانہ تھا اور ظاہر ہے اس نازک ترین زمانے میں تبلیغ دین اور
 ترویج اسلام کے لیے میدان عمل میں اتنا نہایت مشکل بلکہ بالفاظ واضح اچھاپ
 کو گونا گوں خطرات میں ڈالنا تھا، لیکن خلیفہ غلام اللہ نے نہایت حسن و خوبی سے
 یہ فریضہ انجام دیا۔ ان کے مدرسے میں مختلف اوقات میں بے شمار تشنگان علم نے
 حاضری دی اور ان سے استفادہ کیا۔ اس مردِ خدا کی تدریسی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں
 لوگوں نے ان سے تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، صرف و نحو اور منطق و معانی وغیرہ علوم
 کی تحصیل کی اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس عہد کے پنجاب میں ان تینوں
 باپ بیٹوں کی تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کی دھوم مٹی اور علما کا شاید ہی کوئی ایسا

خاندان ہوگا جو ان حضراتِ علما سے تعلق رکھتا اور علاقہ نیا و مندی نہ رکھتا ہو۔
 خلیفہ غلام اللہ لاہوری کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ارکانِ حکومت سے
 قطعاً ردا لیا نہ رکھتے تھے اور گوشہ نشینانہائی میں بیٹھ کر لوگوں کی علمی اور ذہنی و روحانی
 تربیت کرتے تھے۔ کہنا چاہیے کہ اعلیٰ کلمۃ اللہ ان کا پیشہ اور اشاعتِ علم دین
 ان کا شیوہ تھا۔

اس عالم اجل نے ۱۲۷۲ھ کو جنت کی راہ لی۔ مرجع الفضلا سے ان کی تاریخ
 وفات نکلتی ہے۔

۱۳۔ مفتی غلام محمد لاہوری

مفتی غلام محمد لاہوری کا چند پشتوں تک کا سلسلہ نسب یہ ہے مفتی غلام محمد
 بن مفتی رحیم اللہ بن مفتی رحمت اللہ بن مفتی محمد نقی۔ یہ خاندان علم و ادراک میں
 خاص شہرت رکھتا تھا۔ اس کا تعلق مشہور بزرگ حضرت خواجہ بہار الدین زکریا
 ملتانی سے تھا۔ مفتی غلام محمد کے اسلاف میں ایک بزرگ مخدوم مفتی محمد قریشی
 تھے جو "میاں کلاں" کے عرف سے معروف ہوئے اور جنہوں نے ۸۹۱ھ میں وفات
 پائی۔ سلطان بہلول لودھی نے ان کو لاہور کا مفتی مقرر کر دیا تھا اور وہ سلطان سے
 نقل مکانی کر کے لاہور آگئے تھے۔ اپنی سکونت کے لیے انہوں نے موجی دروازے
 کے اندر ایک حویلی تعمیر کی اور ایک محلہ آباد کیا جو اس دو درہنِ فضل کی وجہ سے
 "کوٹلی مفتیاں" کے نام سے موسوم ہوا۔

مفتی محمد قریشی عرف میاں کلاں اپنے دور کے عالم و فاضل اور ماہرِ علم فقہ تھے،
 اسی لیے ہندوستان کے بادشاہ بہلول لودھی نے ان کو لاہور کے منصبِ افتا پر

ماہور کیا تھا۔ ان کے زمانے میں بھی اور ان کے بعد بھی کئی پشتوں تک لاہور میں افتا کا منصب اسی خاندان کے علما کے سپرد رہا اور انہوں نے اس منصب کے وقار کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ اس خاندان میں بہت سے اونچے درجے کے علما و فقہا پیدا ہوئے۔

مفتی غلام محمد نے اپنے والد مفتی رحیم اللہ سے اخذ فیض کیا اور مولانا غلام رسول لاہوری کے حلقہ مدرس میں شامل رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔

لاہور کے اس عالم دین اور فقیہ نامدار نے ۹۔ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ (۶ اکتوبر ۱۸۵۹ء) کو سفر آخرت اختیار کیا۔ ”خورشید دین محمد“ سے سن وفات نکلتا ہے۔

مفتی غلام محمد کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں نے علم و فضل کے میدان میں بہت شہرت پائی۔

ایک بیٹے کا نام سید محمد لاہوری تھا۔ یہ عالم باعمل بزرگ تھے۔ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) کوچ بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ابھی کوٹ مٹھن پہنچے تھے کہ انتقال کر گئے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں، (۱) خلاصۃ المدارج (۲) فقہ محمدی اور (۳) مخزن الفرائض۔

دوسرے بیٹے حافظ غلام احمد تھے جو ۱۲۹۰ھ میں فوت ہوئے۔

تیسرے بیٹے کا اسم گرامی مفتی غلام سرور لاہوری تھا۔ یہ فاضل، اردو اور پنجابی کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں خزینۃ الاصفیاء، حدیقۃ الاولیاء، مدنیۃ الاولیاء، بہارستان تاریخ، تاریخ مخزن پنجاب، مخزن حکمت، تحفۃ الابرار اور تحفۃ سروری وغیرہ شامل ہیں۔ یہ فاضل، اردو اور پنجابی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے نثر اور نظم میں خوب خدمت کی اور بہت نام پایا۔ اپنے دور کے یہ بلند پایہ عالم، ممتاز فقیہ، مشہور مؤرخ اور اچھے شاعر تھے۔

مفتی غلام سرور جون ۱۸۹۰ء (۱۳۰۷ھ) میں اپنے برادرزادہ مفتی جلال الدین بن سید محمد کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد ہیضہ میں

مقبلاً ہو گئے اور دوران سفر میں ۲۴۔ ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ (۱۲ اگست ۱۸۹۰ء) کو وفات پائی گئی۔ مولانا غلام دستگیر قصوی ان کے رفیق سفر تھے، انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی اور میدان بدر کے قریب بالا حسانی میں دفن کیے گئے۔

۱۵۔ حافظ غلام محمد قادری لاہوری

مولانا حافظ غلام محمد قادری لاہوری "امام گانوں" کے نام سے معروف تھے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے، حافظ غلام محمد بن حافظ محمد صدیق بن حافظ محمد حنیف بن محمد لطیف۔ یہ نام خاندان علم و عرفان کے زیور سے آراستہ تھا۔ حافظ غلام محمد کے دادا حافظ محمد حنیف کابل سے ترک وطن کر کے پنجاب آئے تھے اور پھر مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ حافظ محمد حنیف بلاشبہ اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے لیکن اس خاندان کی شہرت کا اصل باعث حافظ محمد صدیق ہوئے جو بلند پایہ مدرس، نامور عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ حافظ صاحب ممدوح کا سال وفات ۱۱۹۳ھ ہے۔ یہ لاہور کی مسجد وزیر خاں کے خطیب اور امام تھے۔

حافظ غلام محمد قادری اپنے عہد کے معروف عالم دین تھے، فقہ و اصول اور دوسرے علوم مرثویہ پر عبور رکھتے تھے اور مسجد وزیر خاں کی خطابت و امامت ان کے سپرد تھی۔ اس مسجد میں ان کا سلسلہ درس و تدریس بھی جاری تھا۔ سکھوں نے اپنے دور حکومت میں بہت سی مسجدوں کو بارود خانے اور گھوڑوں کے اصطبل بنا لیا تھا، لیکن حافظ غلام محمد کی حکمت عملی کے باعث مسجد وزیر خاں ان کی دست برد

نہے مولانا حافظ محمد صدیق لاہوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے ہند جلد پنجم حصہ

دوم ص ۱۹۰ تا ۲۰۱

سے محفوظ رہی۔ ان کی نیکی، نرم مزاجی اور فراوانی علم فضل کی بدولت لاہور کے سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے، ارکان حکومت بھی ان کی تکریم بجالاتے تھے۔ ان کا طرز زندگی کچھ ایسا تھا کہ سکھ حکمران بھی ان کی عزت کرتے تھے، یہاں تک کہ خود مہاراجہ رنجیت سنگھ ان کو ذاتی طور پر جانتا اور ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتا تھا، اور اس دور میں یہ بہت بڑی بات تھی۔

حافظ غلام محمد نہایت نرم دل اور نیک خوتھے، صوفیا کی مجالس میں حاضری دیتے، اہل اللہ سے مخلصانہ روالہ رکھتے اور درویش صفت لوگوں سے محبت و الفت کا برتاؤ کرتے تھے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ اونچے درجے کے خوش نویس تھے اور اجرت پر کتابت کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ اس آمدنی کا بڑا حصہ غرباء و مساکین اور مستحقین میں بانٹ دیتے تھے۔

ان کے زمانے میں مسجد وزیر خاں کا مدرسہ مرجع علما و طلباء تھا۔ طلباء کا وہ بہت خیال رکھتے اور ان کی ضروریات خود مہیا کرتے۔ اگر کوئی طالب علم بیمار پڑ جاتا تو اس کا علاج کراتے اور اگر مالی پریشانی میں مبتلا ہوتا تو اس کی پریشانی کو رفع کرنے کی کوشش کرتے۔

فارسی کے وہ اچھے شاعر تھے اور پُر تاثیر شعر کہتے تھے، غریب تخلص کرتے تھے۔ ان کا وعظ بھی بہت مؤثر ہوتا تھا۔ صاحب تصنیف بھی تھے ان کی تصنیف شدہ ایک کتاب کا نام "شمس التوحید" اور دوسری "گنج مخفی" ہے جو فارسی نظم میں ہے۔

لاہور کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی اور مسجد وزیر خاں کے باہر دفن کیے گئے۔

۱۶۔ حافظ غلام محی الدین بگوی

مولانا حافظ غلام محی الدین بگوی پنجاب کے جن خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ کئی پشتوں سے مرجع خلافت تھا اور اس کے تمام افراد علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کے والد کا نام نامی حافظ نور حیات، دادا کا حافظ محمد شفا اور پردادا کا اسم گرامی حافظ نور محمد تھا۔ ان کا سلسلہ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت مکرّم رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

حافظ غلام محی الدین کے اسلاف میں ایک بزرگ مولانا عبدالرحمن بن صالح تھے جو آٹھویں صدی ہجری میں وارد پنجاب ہوئے۔ پھر مولانا عبدالرحمن کی اولاد میں سے ایک بزرگ مولانا محمد ہاشم نے گیارہویں صدی ہجری میں دریائے جہلم کے کنارے موضع بگہ میں سکونت اختیار کی، جو بھیرہ کے قریب ضلع سرگودھا میں ہے۔

مولانا محمد ہاشم کے دو بیٹے تھے، ایک محمد صالح، دوسرے محمد یوسف دونوں کو اللہ نے علم و عرفان اور زہد و ورع کی نعمت سے نوازا تھا۔ مولانا محمد صالح کی اولاد نے قصبہ بھاوریوں اور شاہ پور کو اپنا مسکن بنایا اور مولانا محمد یوسف کے اخلاف نے اپنے آبائی گاؤں بگہ میں اصلاح و ارشاد اور درس و تدریس کا حلقہ قائم کیا۔ پھر آگے چل کر مولانا محمد یوسف کے جانشین مولانا میرداد بگوی اور مولانا میرداد کے صاحب زادے حافظ نور محمد بگوی اپنے عہد کے ممتاز عالم ہوئے جو مبلغ کتاب و سنت تھے اور غیر شرعی رسوم و رواج کے شدید مخالف! حافظ نور محمد کے مندرجہ مذکورہ حافظ محمد شفا ہوئے جو شاہ زندہ کے عرف سے معروف تھے اور جنہوں نے ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی۔ مولانا حافظ غلام محی الدین اپنی حافظ محمد شفا کے پوتے تھے اور والد کا اسم گرامی حافظ نور حیات تھا۔

حافظ غلام محی الدین بگوی اپنے دور کے جید عالم تھے، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام،

اصول و معانی اور دیگر علوم متداولہ پر کامل عبور رکھتے تھے اور زہد و اتقا میں بے مثال تھے۔۔۔ ماہِ محرم ۱۲۱۰ھ (۹۵)ء کو اپنے آبائی گاؤں بگے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بارے میں ایک عجیب و غریب واقعہ منقول ہے جو ان کے بالکل ابتدائی ایام حیات سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے راوی ان کے والد ماجد حافظ نور حیات ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن وہ مسجد کے لیے اُٹھے تو ازراہِ محبت اپنے اس بچے غلام محی الدین کو اٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے گئے اور دریائے جہلم کے کنارے جا پہنچے۔ کپڑا بچھا کر بچے کو لٹا دیا اور خود وضو کر کے نوافل میں مشغول ہو گئے۔ اندھیری رات تھی اور بچہ قدرے فاصلے پر تھا۔ کچھ دیر بعد انھیں خیال گزرا کہ ایسا نہ ہو کوئی درندہ آجائے اور بچے کو اذیت پہنچائے، بچے کو اپنے پاس ہی لٹانا چاہیے۔ اس خیال سے جب وہ بچے کو اٹھانے گئے تو دیکھا کہ ایک مبارک صورت سفید ریش بزرگ بچے کو گود میں لیے بیٹھے ہیں۔ باپ نے بزرگ سے درخواست کی کہ اس بچے کے لیے دعا فرمائیں کہ یہ باعمل عالم ہو۔ بزرگ نے جواب دیا کہ یہ ازل ہی سے باعمل عالم ہے اور اس سے لوگوں کو بہت فیض پہنچے گا۔ یہ الفاظ کہہ کر وہ بزرگ آنکھوں سے غائب ہو گئے۔

مولانا غلام محی الدین کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بچپن ہی میں عام لڑکوں کے ساتھ نہ کھیل کر وہیں شریک ہوتے اور نہ ان کی ہنگامہ آرائی میں کوئی حصہ لیتے تھے، زیادہ تر خاموش رہتے اور اپنے ہم عمروں کو بھی خاموش رہنے کی تلقین کرتے اس لب و لہجے سے بات کرتے کہ لڑکے ان سے مرعوب ہو جاتے۔

جب چار برس چار ماہ کے ہوئے تو والد نے ان کو مسجد میں لے جا کر حافظ حسن کے سپرد کر دیا جو بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ حافظ حسن کی اپنی روایت ہے کہ قرآن شریف پڑھاتے وقت وہ بچوں پر بہت سختی کرتے تھے اور جو بچے سبق یاد نہ کر پاتے یا پڑھنے میں مستی کرتے انھیں سخت سزا دی جاتی تھی لیکن غلام محی الدین نے ان کو اس کا کبھی موقع نہیں دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ

اس بچے کو سبق نہیں آتا ہوگا مگر جب سنا اس نے صحیح صحیح سنا دیا۔ اس طرح انھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں قرآن شریف پڑھ لیا۔ عالم طہریت ہی میں نہایت ذہین تھے۔

غلام محی الدین نے قرآن پڑھ تو لیا تھا لیکن حفظ نہیں کیا تھا۔ آواز بہت اچھی تھی۔ قرآن مجید ختم کرنے کے بعد پہلا رمضان آیا تو لوگوں نے ان کے والد حافظ نور حیات سے کہا کہ غلام محی الدین سے نوافل میں قرآن سنا چاہیے۔ والد نے بیٹے سے پوچھا تم قرآن شریف سنا سکو گے؟ عرض کیا کہ اگر آپ روزانہ میرے ساتھ ایک پارے کا دور کر لیا کریں تو سنا سکوں گا۔ چنانچہ یہ سلسلہ شروع کر دیا گیا اور اسی رمضان میں پورا قرآن حفظ کر لیا اور سنا بھی دیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ ”آپ پورے دن میں ایک پارہ حفظ کرتے تھے؟“ بولے ”نہیں! چاشت کے وقت تک ایک پارہ حفظ ہو جاتا تھا“

قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد علوم متداولہ کے حصول کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور اپنے چھوٹے بھائی احمد الدین کو ساتھ لے کر دہلی جانے کا قصد کیا۔ احمد الدین کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال تھی اور وہ قرآن مجید کا دسواں پارہ حفظ کر رہے تھے، مگر دہلی کی تیاری اور وہاں پہنچنے تک انھوں نے پورا قرآن حفظ کر لیا۔

دہلی اس زمانے میں مرکزِ علم و علما تھا اور بہت سے اصحاب کا سلسلہ درس وہاں جاری تھا۔ دونوں بھائیوں نے مختلف حضراتِ علما سے حصولِ علم کیا مگر حدیث کا درس حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے لیا اور سندِ حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حاصل کی۔ یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب مولانا غلام محی الدین حدیث کی کتابیں ختم کر چکے تو ان کے اُستاد و محترم شاہ محمد اسحاق

مولانا حافظ احمد الدین کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے پاک و ہند، تیرھویں

صدی ہجری جلد اول از صفحہ ۸۸ تا ۹۱۔

اپنے اس عزیز شاگرد کو حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے اور سندِ حدیث عطا فرمانے کی درخواست کی۔ شاہ عبدالعزیز نے حدیث اور علمِ حدیث سے متعلق ان سے متعدد سوالات پوچھے، جن کے انہوں نے صحیح صحیح جواب دیے۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے اور سندِ حدیث عنایت فرما کر ان کے لیے دعا فرمائی اور فرمایا۔

مدان شاہ اللہ تعالیٰ آپ سے بڑا فیض ہوگا۔ اور نصیحت کی کہ ”جب تم وطن واپس جاؤ تو ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے تفرقہ پڑے۔“

قیامِ دہلی کے زمانے میں شاہ غلام علی محب دوی دہلوی سے بیعت ہوئے اور ان کی صحبت سے استفادہ کیا۔

علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد اپنے وطن (بگہ) آئے۔ ان کے والد ماجد حافظ نورچیتا وفات پا چکے تھے۔ پنجاب میں بہ سکھوں کا دورِ حکومت تھا۔ مولانا غلام محی الدین کی علمی شہرت گرو نواح میں پہنچ چکی تھی۔ بہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیز الدین کو ان کے علم و فضل کا پتا چلا تو وہ بگہ گئے، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بگہ سے لاہور تشریف لانے پر زور دیا۔ چنانچہ وہ لاہور آگئے اور بازار حکیمان کی لال مسجد میں مسندِ درس بچھائی۔ تقریباً تیس سال اس مسجد میں ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ اس اثنا میں بے شمار علماء و طلباء نے ان سے استفادہ کیا۔ لاہور ہی میں وہ مرضِ استرخا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر اپنے گاؤں بگہ تشریف لے گئے۔ قیامِ بگہ کے زمانے میں تیرہ چودہ سال اس مرض میں مبتلا رہے، مگر حالتِ مرض میں بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں پنجاب کے معروف بزرگ مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ مہیل سنگھ) کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

مولانا غلام محی الدین بگہ کی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، صرف و نحو، علمِ کلام، منطق و فلسفہ اور معانی و بیان وغیرہ تمام علوم مروجہ میں مہارت رکھتے تھے اور فقہی فتوؤں کے لیے کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔ نہایت

مفتی ماہر ہیزگار، متمحل مزاج اور کثیر الدرس و کثیر المطالعہ عالم تھے، ترویج علم اور اشاعت دین کا سلسلہ اب بھی کسی نہ کسی انداز میں اس خاندان میں جاری ہے۔ مولانا غلام محی الدین نے دوشنبہ کی شب ۳۰ شوال ۱۲۷۳ھ (۲۲ جون ۱۸۵۷ء) کو اپنے آبائی گاؤں بگٹہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے "غوثیہ عالم" کے الفاظ سے کن وفات نکلتا ہے۔

۱۷۔ مفتی غلام مصطفیٰ برووانی

مفتی غلام مصطفیٰ برووانی اپنے عصر اور علاقے کے شیخ و فاضل بزرگ تھے اور فنون حکمیہ و علوم عقنیہ پر بالخصوص عبور رکھتے تھے۔ علم فقہ میں بھی انھیں درک حاصل تھا، بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کے لائق شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، بحر العلوم کے علاوہ اس دور کے دیگر اساتذہ سے بھی انھوں نے اخذ علم کیا۔ چونکہ علم فقہ میں ماہر تھے اس لیے تکمیل تعلیم کے بعد انھیں شہر اٹاواہ کا مفتی مقرر کر دیا گیا تھا۔ طویل عرصے تک اس شہر کے منصب افتا پر فائز رہے اور اس باب میں بہت شہرت پائی۔ پھر اٹاواہ سے ان کا تبادلہ بیرجموم میں کر دیا گیا جو بنگال میں ہے۔ مفتی غلام مصطفیٰ برووانی فارسی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے، فارسی کا ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔

۱۸۔ مولانا غلام ناصر رام پوری

مولانا غلام ناصر کے والد کا نام محمد اکرم اور جد امجد کا اسم گرامی محمد اسلم تھا۔ اصلاً

۱۵۸۱ھ حدائق الحنفیہ ص ۲۷۶ تا ۲۷۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۸، ۱۵۹۔

۱۵۸۱ھ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۶۱۔

خراسان کے رہنے والے تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے اور
یوپی کے شہر رام پور میں اقامت گزیں ہوئے۔ اس زمانے میں رام پور کو ایک مسلمان
ریاست کی حیثیت حاصل تھی اور بہت سے علماء و فضلا اس ریاست میں
موجود تھے۔

مولانا غلام ناصر کی ولادت اور تربیت رام پور میں ہوئی اور وہاں کے اساتذہ
سے شرف شاگردی حاصل کیا تعلیم سے فراغ کے بعد جبل پور کے عہدہ قضا پر
فائز ہوئے۔ عرصہ دراز تک اس منصب پر فائز رہے۔

نہایت حلیم الطبع، متواضع، خوب رو، عمدہ کلام اور بلند اخلاق تھے۔ شاعر
بھی تھے اور بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ علم فقہ میں تو درگ رکھتے ہی تھے، اس کے
علاوہ ریاضی میں بھی کامل دسترس تھی۔ دیگر علوم مروجہ پر بھی گہری نظر تھی۔ غرض
تیرھویں صدی ہجری کے یہ ہندی عالم و فقیہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اور
تمام متداول اصناف علم سے ان کو گہرا ربط و تعلق تھا۔
اس جلیل القدر فقیہ نے ۹ شعبان ۱۲۵۹ھ کو رام پور میں وفات پائی۔^{۲۵}

۱۹۔ قاضی غلام بچی بہاری

قاضی غلام بچی بہاری فقہ و اصول کے ممتاز و ماہر علماء میں سے تھے اور
صاحب فضل و کمال اور شیخ عصر تھے۔ کلکتہ کے منصب قاضی القضاة پر متمکن تھے۔
۱۱۹۰ھ میں فقہ کی بلند پایہ کتاب ہدایہ کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ لارڈ ہسٹنگ کے زمانے
میں مولوی تاج الدین بنگالی، میر محمد ایسین ایرانی اور مولوی شریعت اللہ سنہلی کی مدد
پانچویں کو پہنچا پھر اس فارسی ترجمے کے حصہ معاملات کو کپتان ہملٹن نے انگریزی

^{۲۵} نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۶۲ بحوالہ یادگار انتخاب۔

میں منتقل کیا جو تین جلدوں پر مشتمل ہے لیکن انگریزی ترجمے میں متعدد مقامات پر بہت سی فاش غلطیاں تھیں۔ ان غلطیوں سے اس زمانے کے ہندوستان کے چیف جسٹس جان ہربرٹ ہارنگٹن کو مطلع کیا گیا تو انھوں نے ۱۲۲۱ھ میں ترجمے کی نظر ثانی اور تصحیح کے لیے اس عہد کے نامور عالم و فقیہ مولانا محمد راشد برودانی کی خدمات حاصل کیں۔ انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ترجمے کی تصحیح اور تنقیح و تہذیب کا فرض انجام دیا۔

بلاشبہ قاضی غلام یحییٰ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور نامور فقیہ تھے جو ایک طرف کلکتہ کے قاضی القضاة تھے تو دوسری طرف انھوں نے ہدایہ کو عربی سے فارسی زبان کے قالب میں ڈھالا۔ ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

چند دیگر فقہائے کرام

ان حضرات کے علاوہ جن کا گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے، صرف غ میں تین ایسے فقہائے کرام بھی ہیں جن کے بارے میں نہ تو یہ معلوم ہو سکا ہے کہ کوئی ان کی فقہی نوعیت کی کتاب تھی، نہ یہ پتا چل سکا ہے کہ وہ کہیں منصب قضا پر فائز رہے، نہ اس امر کا سراغ مل سکا ہے کہ کسی جگہ ان کو عہدہ افتا پر مسمن کیا گیا ہو اور نہ ان کے زیادہ حالات میر آسکے ہیں۔ بس اتنا علم ہوا ہے کہ یہ فقیہ تھے۔ ان کے متعلق جو کچھ پتا چل سکا ہے وہ درج ذیل ہے :-

۱۔ مولانا غضنفر لکھنوی :-

مولانا حیدر انصاری فرنگی محلی کے بیٹے اور مولانا محمد معین کے پوتے تھے۔ فرنگی محل (لکھنؤ) کے نامور عالم اور فقیہ تھے۔ بہت اچھے واعظ اور مبلغ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے چچا مولانا محمد معین اور مفتی ظہور اللہ انصاری لکھنوی سے

حصول علم کیا۔ کافی عرصہ ان کے حلقہ شاگردی میں رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تدریس و تذکیر میں مشغول ہو گئے۔ اپنے والد محترم مولانا حیدر انصاری کے ساتھ حج بیت اللہ کیا اور ان کے ساتھ حیدر آباد گئے۔ پھر لکھنؤ گئے اور شادی کی بعد از پھر حیدر آباد (دکن) کا عزم کیا اور وہیں ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

۲۔ مولانا غلام احمد سورتی :

مولانا غلام احمد بن غلام محمد بن ولی اللہ سورتی گجراتی اپنے دور کے مشہور شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ صوبہ گجرات کے شہر سورت میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولانا غلام محمد سورتی جلیل القدر عالم تھے۔ بیٹے نے انہی سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں پھر تمام عمر درس و افادہ طلبیا میں مشغول رہے۔ فقہائے حنفیہ میں عزت و احترام کے مالک تھے۔ ۲۹ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ کو وفات پائی اور اپنے والد کے قریب سورت میں دفن کیے گئے۔

۳۔ سید غلام نبی حیدر آبادی :

سید غلام نبی بن غلام سرور حسینی حیدر آبادی اپنے وقت کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ مولد و منشا حیدر آباد (دکن) ہے۔ اپنے عہد کے اساتذہ سے کسب علم کیا اور والد کی وفات کے بعد حیدر آباد کی مسجد میں خطیب مقرر ہوئے۔ اس علاقے کے محدث و فقیہ تھے۔ نہایت باہمت، سخی اور صاحبِ مجد و شرف تھے۔ ۱۲۵۲ھ کو حیدر آباد (دکن) میں انتقال کیا۔

ف

۲۰۔ مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی

مولانا فضل رسول بدایونی عثمانی مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور اپنے علاقے اور عہد کے جید عالم تھے۔ ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور بعض درسی کتابیں اپنے والد مکرم مولانا عبد الحمید عثمانی بدایونی سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے آٹھو گئے، وہاں مولانا نور الحق انصاری لکھنوی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شریک ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ درسی کتابوں کی تکمیل کے بعد دھول پور ما قصد کیا۔ وہاں حکیم پیر علی موہانی سے علم طب کی کتابیں پڑھیں۔ دھول پور میں طب بھی کھولا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ پھر ان کے والد مولانا عبد الحمید نے انہیں بدایوں بلالیا، کچھ مدت وہاں رہنے کے بعد بنارس چلے گئے۔ بنارس میں لوگوں کے علاج معالجے کا سلسلہ شروع کیا، وہاں مدت مدید تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر بدایوں آگئے اور وہاں اپنے والد گرامی سے اخذ طریقت کیا۔ بعد ازاں حجاز مقدس گئے اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہوئے۔ وہاں شیخ عبداللہ سراج گئی اور مولانا محمد عابد سندھی مدنی سے سند حدیث حاصل کی۔

اس کے بعد مراجعت فرماتے وطن ہوئے اور عرصے تک اپنے شہر میں رہے۔ بعد ازاں پھر قصد حجاز کیا اور حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر بغداد کو روانہ ہوئے۔ وہاں سید علی نقیب اثراف سے اخذ طریقت کیا۔ بغداد سے پھر منہستان کی راہ لی۔ حیدرآباد (دکن) اس زمانے میں مرکز علم و علما تھا، وہاں انہیں نہایت قدر و منزلت حاصل تھی اور اس نواح میں کثرت سے جاتے تھے۔ حیدرآباد کے اہل دولت ان سے خاص تعلق خاطر رکھتے، اپنی مجالس میں جگہ دیتے اور ان کی

مالی خدمت کرتے تھے۔

مولانا فضل رسول بدایونی بہت بڑے فقیہ اور مجاہد و مناظرہ میں مشہور تھے۔ اپنے مسلک اور لفظ نظر میں سخت متعصب تھے۔ علما سے مخالفت اور بحث و جدل میں بہت تیز تھے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی تکفیر کرتے تھے اور انہوں نے بدعات و رسوم کی جو تردید کی ہے، اُس کو غلط قرار دیتے تھے۔ بعض مسائل کی وضاحت کے سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو بھی بدعتِ تنقید بنا لیتے اور اس ضمن میں بہت آگے نکل جاتے۔

مولانا فضل رسول بدایونی متعدد کتابوں کے مصنف اور محشی تھے جن میں یہ کتابیں

شامل ہیں :-

البوارق المحمدیہ، تصحیح المسائل، سیف الجبار، فوز المؤمنین، تلخیص الحق، المعتمد،
احقاق الحق، کتاب الصلوٰۃ۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فصوص الحکم کی شرح بھی لکھی۔
علاوہ ازیں فلسفہ و منطق کی بعض درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔

مولانا فضل رسول بدایونی انگریزی حکومت کی ملازمت بھی کرتے رہے۔ پہلے مفتی

عدالت اور پھر کلکٹری میں سررشتہ دار کا منصب عطا ہوا۔ اس زمانے میں ضلع بدایوں کا
صدر مقام سہوان تھا۔ بنارس میں راجہ انوپ سنگھ کے ہاں سلسلہ ملازمت میں منسلک

رہے۔ کچھ عرصہ بریلی میں مطب کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب بدایوں پر
انگریزوں کا نظم و نسق باقی نہ رہا تو چند روز وہاں کا انتظام کیا اور سرکاری عملے کی حفاظت کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وہ انگریزوں کے حامی تھے، جب انگریزوں کا
بدایوں پر تسلط نہ رہا تو انہوں نے ان کے مال و جان کو بچانے کی کوشش کی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں :-

بدایوں میں انگریزی حکومت ختم ہو جانے کے بعد عجیب افراتفری رہی مگر مولوی

فضل رسول بدایونی نے کچھ انتظام برقرار رکھا اور لوگوں کی جان و مال بچانے کی

کوشش کی۔ ”حبیب الاخبار“ بدایوں مورخہ ۲۵ جون ۱۸۵۷ء مطابق ۳ ذیقعدہ

۱۲۷۳ھ رقم طراز ہے۔

چونکہ مقدس عالم اور صوفی مولوی فضل رسول نے اعلیٰ انتظامات کیے، لہذا کوئی ناقابلِ مدافعت خاص واقعہ وقوع پذیر نہ ہوا۔ انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر ٹیڑوں اور غارت گروں کی غارت گری سے لوگوں کو بچانے میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا اور سرکاری آدمیوں کی حفاظت اور امن کے لیے پوری کوشش کی۔

اس سے آگے لکھتے ہیں:-

سرکاری ملازم بہاری لال سب ڈپٹی انسپکٹر ساکن بدایوں جو اس زمانے میں وہیں تھا، لکھتا ہے:- حقیقت میں کھٹک کے ٹھا کردوں اور شیر علی نے موضع کھیرا نواہ کے مسلمان چودھریوں کو ساتھ بلا کر جاہا کہ شہر بدایوں کے شرفا کوٹ لیں اور اپنے خبط کی تسکین کا سامان فراہم کریں۔ لیکن مولوی فضل رسول کے بہترین انتظام نے بدایوں کو اس مصیبت سے بچا لیا۔ مولوی مذکور ان نیک سیرت اور ولی سیرت لوگوں میں سے ہے، جو آج کل نایاب ہیں۔

۱۸۵۷ء میں انھوں نے انگریزوں کی بر ملا حمایت کی، مگر بعض لوگ اس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری تحریر کرتے ہیں:-
مولانا فضل رسول بدایونی کے سوانح نگار نے اس واقعہ پر کشف و کرامات کا پردہ ڈالا ہے، ورنہ حقیقت ظاہر ہے۔

ردّ و ہابیت میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی۔ ان کے والد مولانا عبدالحمید بدایونی عثمانی نے بھی ردّ و ہابیت میں ایک رسالہ تصنیف کیا۔ فقہ اور فلسفہ و حکمت کے

۱۔ جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۱۲۰۔

۲۔ ایضاً ص ۱۲۰، ۱۲۱۔ بحوالہ فریڈم سٹرگل، ج ۵ ص ۳۱۸

۳۔ ایضاً ص ۱۲۱۔

نامور علما میں سے تھے۔ دُنیا اور دُنیا داروں سے خاص طور سے تعلق تھا۔ آخر عمر میں
 بیانی جواب دے گئی تھی۔ اپنے والدِ محترم سے فرقہ، خلافت پہنا، ان کے سجادہ نشین
 ہوئے اور سلسلہ بیعت جاری کیا۔ وہ ترکی بھی گئے اور سلطان ترکی کے مہمان ہوئے۔
 انگریزوں کی حمایت کے صلے میں انھوں نے مراد آباد کے کمشنر سے اپنی موردِ وثی
 جائداد کا معافی نامہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ ہے
 کہ وہ ہمیشہ تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور بحث و مناظرہ میں مشغول رہے۔ متعدد
 علمائے ان سے استفادہ کیا، جن میں مولانا فیض احمد بدایینی، مولانا سخاوت علی جون پوری
 مفتی اسد اللہ آبادی اور مولانا عنایت رسول چریا کوٹی شامل ہیں۔

ہندوستان کے اس عالم و فقیہ نے ستر برس عمر پائی اور پنج شنبہ کے روز ۳۔ جمادی الاخریٰ
 ۱۲۸۹ھ کو فوت ہوئے۔ بدایوں میں دفن کیے گئے۔

۲۱۔ مولانا فیاض علی عظیم آبادی

مولانا فیاض علی عظیم آبادی مجاہدِ علما اور سر بختِ فقہا میں سے تھے۔ مجاہدین کے
 اس نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو عظیم آباد (پٹنہ) میں مقیم تھا۔ والد کا نام الہی بخش
 اور جدِ امجد کا اسم گرامی ہدایت علی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم
 حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے، اس لیے جعفری کی نسبت سے مشہور
 تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ عظیم آبادی تھے، جنہوں نے اللہ کی راہ
 میں جہاد اور انگریزی حکومت کی مخالفت کو اپنا مصلح نظر ٹھہرایا۔ عظیم آباد (پٹنہ)
 کے پہلے مقدمہ بغاوت میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا اور رمضان کی آخری تاریخ
 ۱۲۸۱ھ (۲۷ فروری ۱۸۶۵ء) کو سزا کا حکم صادر ہوا۔ پہلے صنبلی جائداد اور پھانسی

۱۔ تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ۱۶۳، ۱۶۴۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۳۸۰ تا ۳۸۳۔

۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۷۷، ۳۷۸۔ قاموس المشاہیر ج ۲ ص ۱۲۷۔

کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا۔ پھر پھانسی کی سزا کو جس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔
۱۵۔ جون ۱۸۶۵ء کو کالے پانی پہنچے اور وہیں ۲۸۔ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (۱۳ نومبر
۱۸۸۱ء) کو وفات پائی۔

مولانا فیاض علی عظیم آبادی، مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ درسی
کتابیں مولانا احمد اللہ سے پڑھیں۔ حدیث اور فقہ کی تعلیم مولانا ولایت علی عظیم آبادی
سے حاصل کی۔ مولانا ولایت علی بھی اپنے دور کے بیسل القدر عالم اور نامور مجاہد تھے۔
حدیث کی سند انہی سے لی۔ ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی اور عرصے تک ذکر و اذکار
اور تدریس و تذکیر میں مشغول رہے۔ فن سپر گری بھی سیکھا اور اس میں مہارت نام
حاصل کی۔ ۱۸۴۶ء میں مولانا ولایت علی کے ساتھ جہاد کے لیے سرحد گئے اور
جنگ دُب کے بعد انہی کے ساتھ واپس آئے۔ جنگ امبیلہ میں بھی شریک
تھے۔ مجاہدین میں ان کا نام بصیر الدین تھا۔ تذکیر و معظمت میں بہت مشہور تھے نہایت
مؤثر و معظمت کتبتے تھے۔ بے شمار علما اور عوام نے ان سے فیض حاصل کیا۔ تبلیغ جہاد کے
سلسلے میں صوبہ بنگال ان کی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔

سرحد سے واپس آکر عظیم آباد (پٹنہ) میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا
تھا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو دعوت جہاد بھی دیتے تھے اور سرحد جا کر انگریزی
حکومت کے ساتھ جنگ کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں انہیں مولانا ولایت علی
عظیم آبادی کے وزیر اور دست راست سمجھا جاتا تھا۔

دوبارہ مستقل طور سے مع اہل و عیال کے ہجرت کر کے سرحد چلے گئے تھے۔ مال و متاع،
گھر کے سامان اور مویشی وغیرہ سب چیزوں سے دست بردار ہو گئے تھے۔ شاہ
محمد حسین نمنوہی کی دوسری صاحب زادی سے نکاح ہوا۔ اولاد سے محروم تھے۔ بڑے
بھائی مولانا احمد اللہ کے فرزند مولانا اشرف علی کو متبنی بنا لیا تھا۔ علاقہ سرحد میں
غالباً گلونو بوڑھی میں وفات پائی۔

۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۸۰۔ سرگزشت مجاہدین ص ۳۷۳، ۳۷۴

ان کے متبعی مولانا اثرت علی جو مولانا احمد اللہ کے فرزند تھے، ان کے ساتھ ہی سرحد چلے گئے تھے۔ مولانا فیاض علی کی وفات کے بعد وطن واپس آگئے تھے۔ بعد میں عبدالقدیر نام رکھا اور مختلف علوم و فنون حاصل کیے۔ بنارس کالج میں ریاضی کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ "اودھ اخبار" لکھنؤ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ کچھ مدت بہاول پور میں قیام کیا اور مہڈیا سٹر ہوئے۔ سابقہ سرگرم سیاسی زندگی تمام عمر ان کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنی رہی۔ خاندان کے باقی افراد کی طرح بہت باہمت اور صاحبِ عزم و استقلال تھے۔ ۲۔ شوال ۱۳۲۶ھ (۲۸۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء) کو وفات پائی۔

چند دیگر فقہائے کرام

ان کے علاوہ عرب و فن میں چند دیگر فقہائے کرام بھی شامل ہیں، جن کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :-

۱۔ مولانا فخر الدین ویلوی

علاقہ مدراس کے شہر ویلور کے رہنے والے تھے ممتاز عالم اور فقیہ تھے مسلمان شافعی تھے۔ ہمیشہ تعلیم و تدریس کو اپنا مشغلہ حیات بنائے رکھا۔ کثیر الدرس والا فادہ تھے خلق کثیر نے ان سے فیض حاصل کیا۔ (تاریخ نوائط)

۲۔ مولانا فرحت حسین عظیم آبادی

والد کا نام فتح علی اور دادا کا وارث علی تھا۔ خاندانی لحاظ سے ہاشمی زبیری تھے اپنے دور کے عالم، محدث اور فقیہ تھے۔ نیکی اور تقویٰ میں بہت مشہور تھے۔ ۱۲۲۶ھ میں عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولانا فتح علی عظیم آبادی سے علم حاصل کیا۔ شیخ محمد واعظ اور اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی عظیم آبادی سے بھی استفادہ کیا۔ سند حدیث مولانا ولایت علی سے لی۔ اخذِ طریقت سید احمد شہید بریلوی سے کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا دلائی علی عظیم آبادی کی جگہ مسندِ درس پر فائز ہوئے۔ موعظت و تذکیر کا فریضہ بھی خوب انجام دیا۔ اس کے بعد جہاد کے لیے سرحد گئے۔ بے شمار علماء و مشائخ نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اس عالم و فقیہ نے صرف اڑتالیس سال عمر پائی اور ۱۲۷۴ھ کو فوت ہوئے۔

۳۔ قاضی فضل الرحمن قرشی بردوانی

بردوان (بنگال) میں پیدا ہوئے۔ اپنے عصر اور علاقے کے بہت بڑے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ مولانا امین اللہ عظیم آبادی اور اپنے بڑے بھائی قاضی غلام سبحان قرشی بردوانی سے علم حاصل کیا۔ دیگر علماء سے بھی استفادہ ہوئے۔ علم سے فارغ ہونے کے بعد بنگال کے قاضی مقرر ہوئے۔ بعد ازاں انگریزی حکومت نے انھیں ہندوستان کا قاضی نقضاً بنا دیا تھا۔ عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ مسلماً حنفی تھے۔

۴۔ مفتی فضل اللہ امر وہوی

والد کا اسم گرامی سید سردار احمد حسینی رضوی تھا۔ امر وہہ میں پیدا ہوئے اور اپنے دور کے مشہور اساتذہ سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ اصول و فقہ اور دیگر علوم میں ماہر اور شیخ مانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ٹونک گئے۔ ٹونک میں نواب محمد علی خاں نے ان سے علم حاصل کیا اور پھر ٹونک کا منصب افتا ان کے سپرد کیا گیا۔

۵۔ سید فقیہ اللہ سندیلوی

والد کا اسم گرامی صالح الدین اور دادا کا علاء الدین تھا۔ حسینی سید تھے۔ فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ۱۲۰۳ھ کو سندیلہ میں ولادت ہوئی اور علماء کی ایک جماعت سے استفادہ کیا، جن میں شیخ احمد بخش سندیلوی، مولانا محمد ہادی دلوی، مولانا غلام حسین بنگالی، مولانا محمد اسلم بنگرامی، مولانا نور الحق لکھنوی، مولانا محمد حیدر لکھنوی، مولانا سراج الحق لکھنوی، مفتی محمد صغیر لکھنوی اور سید جعفر علی کسٹنڈوی شامل ہیں۔ پھر تدریس و تذکرہ کا سلسلہ شروع کیا اور بہت سے لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ۲۲۔ صفر ۱۲۵۹ھ کو سندیلہ میں وفات پائی۔

ق

۲۲— مولانا قطب الدین دہلوی

مولانا قطب الدین دہلوی کے والد گرامی کا نام محی الدین تھا۔ شیخ و عالم، محدث و فقیہ اور صاحب صلاح و تقویٰ بزرگ تھے۔ جنفی المسک تھے اور کبار فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم فقہ پر عبور میں رکھتے تھے۔ ۱۲۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا محمد مسکانی دہلوی سے حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھیں اور طویل عرصے تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہنے کا شرف حاصل کیا۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول اور دیگر علوم میں مہارت نامہ رکھتے تھے۔ جامع معقول و منقول اور حاوی فروع و اصول تھے۔ مسائل فقہی پر گہری نظر تھی اور بڑی بڑی کتابوں کی عبارتوں کی عبارتیں حفظ تھیں۔ ان کے حلقہ مدرس میں بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا اور ان کے فتوے کو دلائل کے اعتبار سے خاص اہمیت دی گئی۔ یگانہ علم و فضل اور ماہر فقہ و اصول ہونے کے ساتھ ساتھ زہد و عبادت اور عفت و قناعت میں بھی منہر و حیثیت کے حامل تھے۔ اپنے مسلک فقہی میں تعصب کی حد تک متشدد تھے اور ہنفیت سے اختلاف اور تقلید کا انکار کرنے والوں کے شدید مخالف تھے۔ مولانا سید نذیر حسین دہلوی ان کے ہم عصر تھے اور بعض مسائل فقہی میں وہ سید صاحب ممدوح کی سخت مخالفت کرتے تھے۔

مولانا قطب الدین دہلوی کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولوی فقیر محمد جہلمی حدائق الحنفیہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۷۶ھ میں وہ دہلی میں ان کی زیارت سے تو بہرہ ور ہوئے، لیکن افسوس ہے کہ ان سے استفادے کا موقع نہ ملا۔

ان کو "نواب قطب الدین خاں" کہا جاتا ہے اور ان کا شمار رو سائے دہلی میں ہوتا تھا، اس لیے کہ اجداد اکابر کا ہمیشہ مغل حکومت سے تعلق رہا اور وہ سلطنتِ مغلیہ میں اچھے خاصے مناصب پر فائز رہے۔ اسی بنا پر آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر

ان کا احترام کرنا اور عزت سے پیش آنا تھا۔ باقی عمال حکومت کے نزدیک بھی انھیں مستحق تکریم سمجھا جاتا تھا۔

مولانا موصوف بے شمار صفات سے متصف تھے۔ ان میں ایک صفت یہ تھی کہ وعظ و تذکیر اور اور تبلیغ دین کا انتہائی جذبہ رکھتے تھے اور ہر چوتھے دن باقاعدہ مجلس وعظ منعقد کرتے تھے۔

وہ بہت بڑے مصنف، مترجم اور مفسر بھی تھے۔ انھوں نے زیادہ کتا ہیں اور رسالے اردو میں تصنیف کیے۔ اس طرح انھوں نے اردو زبان کی خدمت بھی کی اور عام لوگوں کے فائدے کے لیے ان میں ضروری مسائل بھی بیان کر دیے۔ ان کی تصنیفات و تراجم میں مندرجہ ذیل کتا ہیں شامل ہیں جو حدیث وفقہ سے متعلق ہیں۔

۱۔ جامع النفاسیر :- یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جو اردو زبان میں ہے اور دو جلدوں میں ہے۔

۲۔ مظاہر حق :- یہ مشکوٰۃ کا اردو ترجمہ ہے جو چار جلدوں میں ہے۔ عام فہم اور شستہ ترجمہ ہے۔

۳۔ ظفر الجمیل :- یہ اردو میں حسن حسین کا ترجمہ ہے۔

۴۔ منظر جمیل

۵۔ مجمع الخیر،

۶۔ جامع الحسنات (۷) خلاصہ جامع صغیر (۸) ہادی الناظرین (۹) تحفہ سلطان

(۱۰) معدن الجواہر (۱۱) وظیفہ مسنونہ (۱۲) تحفۃ الزوجین (۱۳) احکام الاصلیہ

(۱۴) فلاح دارین (۱۵) تنویر الحق (۱۶) توفیر الحق (۱۷) تحفۃ العرب والعجم (۱۸)

احکام العیدین (۱۹) رسالہ مناسک (۲۰) خلاصۃ النصاب (۲۱) گلزار حبت (۲۲)

تنبیہ النساء (۲۳) حقیقۃ الایمان (۲۴) زاد المعاد (۲۵) تذکرۃ الصیام (۲۶) تذکرۃ الیوم

(۲۷) آداب الصالحین (۲۸) طب نبوی۔

وہ کئی مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے گئے اور بعض علمائے حجاز سے سند حدیث

حاصل کی۔ آخری مرتبہ ۱۲۸۹ھ میں سعادت حج سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اسی سال مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

۲۳۔ سید قطب الہدیٰ بریلوی

سید قطب الہدیٰ بن سید محمد واضح بن سید محمد صابر بن سیبائت اللہ بن سید علم اللہ حسنی حسینی بریلوی۔ ماہرین معقول و منقول میں سے تھے اور اپنے زمانے میں حدیث و فقہ، علوم عربیہ، انشا پر دازی اور حسن خط میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور علما و فضلا کی گود میں پرورش پائی۔ ابتدا میں اپنے والد سید محمد واضح بریلوی سے استفادہ کیا۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں علامہ تفضل حسین کشمیری اور دیگر علما سے حصول علم کیا۔ بعد ازاں عازم دہلی ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے حدیث و فقہ کی تکمیل کی اور ان کے کتب خانے کی متعدد بہترین کتابوں کی کتابت کی۔ شاہ عبدالقادر دہلوی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ نہتہ کیا اور ان سے سندلی۔ قرأت بھی اپنی سے سیکھی۔ شیخ غلام علی دہلوی سے اخذ طریقت کیا اور مدت تک ان سے منسلک رہے اور معارف و لطائف سے بہرہ وافر حاصل کیا۔ پھر اپنے وطن رائے بریلی آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔

ہدایت قوی حافظہ، انتہائی ذہین، متبحر کتاب و سنت، جامع شرک بدعت اور شائق کتابت تھے۔ خط انتہائی عمدہ تھا۔

سید قطب الہدیٰ نے صحیح بخاری، جامع ترمذی، عین العلم اور سفر السعاده پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے۔ نیز الجانب الشرقی فی کفر فرعون الغرقی کے نام سے

۱۔ آثار الصنادید ص ۲۴۶، ۲۴۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۳۸۸۔

داستان تاریخ اردو ص ۱۸۱ تا ۱۸۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۸۷، ۳۸۸۔

مفید المفتی ص ۱۴۲

کفر فرعون سے متعلق ایک رسالہ تصنیف کیا۔ اس عالم و فقیہ نے صرف بیالیس برس عمر پائی اور ۱۹۔۔۔ ربیع الثانی ۱۲۲۶ھ کو انتقال کیا۔

۲۴۔ مفتی توام الدین کشمیری

خط کشمیر کے مشاہیر علماء و فقہاء میں مفتی توام الدین کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:۔ توام الدین بن سعد الدین بن معز الدین بن امان اللہ۔۔۔ یہ تمام حضرات اصحاب علم و فضل تھے اور وادی کشمیر میں عزت و اکرام کے مالک تھے۔ مفتی توام الدین کی ولادت اس علمی گھرانے میں ۲۔۔۔ شعبان ۱۱۵۲ھ کو ہوئی اور کشمیر ہی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ بہوش سنبھالا تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے اور شیخ رحمت اللہ، شیخ عبداللہ، ملا مقیم اور اخوند زورابہدی ٹوپی گر کے حلقہائے درس میں شامل ہوئے۔ ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ صغیر سنی ہی میں علوم و فنون سے فارغ ہو گئے تھے اور کشمیر کے ممتاز فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔

مفتی صاحب ممدوح نے قرأت و تجوید بھی سیکھی اور اس کے لیے میر قاری تلمیذ شیخ القرا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اجازہ لیا۔ حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندھی مدنی کے تلمیذ رشید حاجی عبدالولی طرخانی سے حاصل کی۔ نیز حاجی نعمت اللہ نوشہروی اور مولانا امان اللہ شہید کے شاگرد محمد محسن پلچیری سے بھی استفادہ کیا۔ یہ وہی مولانا امان اللہ شہید ہیں جو صاحب ترجمہ مفتی ممدوح کے پردادا تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید محمد امین اولیٰ کی خانقاہ میں ہنگامہ درس جاری کیا اور طویل عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں بے شمار

لے تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۹۔۔۔ نزمۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۸۹۔

علما و طلبانے ان سے کسبِ علم کیا اور مرتبہ بلند کو پہنچے۔ رفتہ رفتہ کشمیر کی مسندِ قضا ان کے سپرد ہوئی اور شیخ الاسلام کا منصب پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے علاقہ کشمیر میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اور اتقا و تدریس کی قلمرو کے تنہا مالک تھے۔ چوبیس سال تک کشمیر کے قاضی اور مفتی رہے اور نہایت عالمانہ اور فقیہانہ اسلوب میں یہ نازک خدمت انجام دی۔

مفتی قوام الدین نے شاہ زین العابدین قادری میاں زکریا لاہوری شیخ الاسلام احمد اگلی اور خواجہ عبدالرحیم بچکان سے بھی استفادہ کیا اور مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔ ایک کتاب "صحائف سلطانی" ان کی تصنیف ہے جو ساٹھ علوم پر محیط ہے۔ کشمیر کے اس عالم و فقیہ نے ۹۔ ذیقعدہ ۱۲۱۹ھ کو وفات پائی۔

۳۰ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۰ ————— حدائق المحنفیہ ص ۲۶۳، ۲۶۴۔

نزمہ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۱۔

ک

۲۵— مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری

مولانا کرامت علی صدیقی جون پوری کا مختصر شجر نامہ یہ ہے :— کرامت علی بن امام بخش بن جبار اللہ بن گل محمد بن محمد دائم صدیقی جون پوری— اودہ— محرم ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) کو جون پور کے محلہ ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب پنتیس واسطوں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچاتا ہے۔ علوم درسیہ کی بعض کتابیں مولانا احمد علی چریا کوٹی سے، بعض مولانا احمد اللہ انامی سے اور بعض مولانا قدرت اللہ ودودی سے پڑھیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے اسلاف جون پور کی اسلامی سلطنت کے دور سے وہاں کی جامع مسجد اور عیدین کے منصب امامت و خطابت پر فائز تھے اور اس نواح میں عزت و احترام کے مالک تھے۔ یہ خاندان جون پور کے محلہ ٹولہ میں آباد تھا، اس محلے میں اب بھی اہل علم سکونت پذیر ہیں۔

حصول علم کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا کرامت علی کا تعلق امیر المؤمنین سید احمد شہید سے پیدا ہوا، اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سید صاحب نے ان کو دعوت و تبلیغ پر مامور فرمایا۔ اس لیے کہ یہ بہت اچھے واعظ تھے اور نہایت مؤثر تقریر کرتے تھے، ابتدا میں جون پور اور اٹس کے گرد و نواح میں اشاعتِ دین اور رواجِ بدعات کا فریضہ انجام دیتے رہے، اس کے بعد بنگال چلے گئے اور تمام زندگی دعوت و تبلیغ میں بسر کر دی۔ بنگال کے مسلمان اس زمانے میں بہت سی خلافِ اسلام رسوم میں مبتلا تھے، باپردہ لباس نہ عورتیں پہنتی تھیں نہ مرد۔ ان کے نام بھی ہندوؤں جیسے تھے، مولانا کرامت علی نے ان سے نہایت محبت و مہربانی کا سلوک کیا، بہت نرمی اور پیاری سے ان کو اپنے قریب کیا اور اس سلسلے میں قریہ قریہ گھومے اور وعظ و تقریر کا سلسلہ جاری

رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ ان سے مانوس ہو گئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے آپ کو شریعت کے رنگ میں رنگ لیا۔ پورے بنگال میں ان کی دعوت دین کا غلغلہ بلند ہوا، اور دیہات و قصبات اور بلا و وامصار کے لاکھوں افراد بدعات و رسوم کو ترک کر کے احکام اسلام کی پابندی کرنے اور توحیدِ خالص کو ماننے لگے۔

مولانا کرامت علی نے پچاس سال سے زائد عرصے تک خدمت دین کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ بنگال میں جگہ جگہ درس گاہیں قائم کیں، مسجدیں تعمیر کرائیں اور مبلغین و علما کی ایک بڑی جماعت ان کی کوششوں سے وہاں پیدا ہو گئی۔ وہ عموماً کشتی پر سفر کرتے اور طلباء و علما ان کے ساتھ رہتے، اثنائے سفر میں درس و تدریس کا کام برابر جاری رہتا۔

بنگال کے لوگ جو ابتدا میں ان سے دور بھاگتے تھے، ان کی دعوت حق کی وجہ سے ان کو انتہائی معزز و محترم قرار دینے لگے، وہ ان کو اپنے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت گردانتے تھے، کیونکہ انہی کی تبلیغ دین اور ترویج اسلام کے باعث انہیں راہ ہدایت نصیب ہوئی تھی۔

مولانا محمود جہاں درس و تدریس، ورع و تقویٰ اور پابندی شرع میں بے مثال تھے، وہاں کثرت تصانیف میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے! انہوں نے اشاعت اسلام، مسائل فقہ اور تصوف و سلوک سے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :-

- (۱) مفتاح الجنۃ (۲) زینۃ المصلی (۳) دعوات مسنونہ (۴) قرۃ العیون
- (۵) تزکیۃ نسواں (۶) زاد التقویٰ (۷) راحت رُوح (۸) نور علی نور (۹) فیض عام
- (۱۰) تزکیۃ العقائد (۱۱) مراد المریدین (۱۲) قوت الایمان (۱۳) نسیم الحرمین (۱۴)
- احقاق الحق (۱۵) تنویر القلوب (۱۶) حق الیقین (۱۷) قول الحق (۱۸) مرآة الحق،
- (۱۹) رفیق الساکین (۲۰) عکارة المؤمنین بطر والمعاذین (۲۱) براہین قطعہ فی مولد
- خیر البریہ (۲۲) کرامۃ الحرمین فی ازالة شبهة الفریقین (۲۳) لمخص القول الایمن (۲۴)

اطمینان القلوب (۲۵) ہدایۃ الرافقین (۲۶) برہان الاخوان (۲۷) مخارج الحروف
 (۲۸) زینۃ القاری (۲۹) شرح جزری اُردو (۳۰) شرح شاطبی (۳۱) ترجمہ اُردو
 مشکوٰۃ جلد اول (۳۲) ترجمہ شمائل ترمذی (۳۳) فتح باب صبیان (۳۴) کوکب دری
 (۳۵) نور الہدیٰ (۳۶) حجت قاطعہ (۳۷) مکاشفات رحمت (۳۸) دافع الوسواس
 (۳۹) مصباح النّلام (۴۰) رسالہ بیعت (۴۱) قامع المبتدعین (۴۲) استقامت
 (۴۳) رو بدعت (۴۴) قوتِ روح (۴۵) سبیل الرشاد (۴۶) القول الثابت
 (۴۷) رسالہ محمودیہ۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ بھی انھوں مختلف مسائل کے بارے میں چند
 چھوٹے بڑے رسالے تحریر کیے۔

وہ بہت اچھے قاری اور تجوید کے ماہر تھے۔ قرآن مجید نہایت خوش الحانی
 سے پڑھتے۔ قرأت و تجوید انھوں نے اس وقت پڑھی جب وہ حج کے لیے گئے۔
 اس ضمن میں سید ابراہیم مدنی اور سید محمد اسکندرانی کی شاگردی کی۔
 صاحبِ نزہۃ الخواطر سید عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں کہ وہ فقہ و اصول اور
 قرأت و تجوید کے ماہر تھے، لیکن علم حدیث سے زیادہ باخبر تھے۔ ان
 کے الفاظ یہ ہیں:۔ وکان قلیل الخبیرة بالحديث (یعنی حدیث کا کم علم
 رکھتے تھے۔)

بہر حال ان کا شمار اکابر فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ بنگال اور ڈھاکہ وغیرہ میں
 ان کی تبلیغ سے گھر گھر اسلام پہنچا اور وسیع پیمانے پر دین کی اشاعت ہوئی۔
 خط نہایت عمدہ تھا اور خطِ نسخ و نستعلیق اور طغریٰ میں بے مثال تھے۔ ایک دن
 چاول یا چنے پر پوری سورۃ اخلاص لکھ دیتے تھے۔

سخاوت و جود کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ پاس ہوتا فقر و مساکین میں تقسیم کر دیتے،
 انتہائی صاحبِ ہمت اور سیرِ چشم تھے۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا اصل مرکز بنگال کا
 علاقہ تھا اور وہیں کے ایک شہر رنگ پور میں انتقال کیا۔ جمعہ کے روز صبح صادق کے

وقت ۳ — ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ (۳۱ دسمبر ۱۸۷۳ء) کو وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے یہ

مولانا کرامت علی کے دو بیٹے تھے، ایک مولانا حافظ احمد اور دوسرے مولانا عبدالاول۔ دونوں علم و فضل میں ممتاز تھے۔ ان کے بھتیجے کا نام مولوی محمد محسن تھا، وہ بھی وقت کے جید عالم تھے۔

۲۶ — مولانا کرامت علی اسرانیلی دہلوی

مولانا کرامت علی کے والد گرامی کا نام مولانا حیات علی تھا۔ یہ حضرات ”اسرانیلی“ کی نسبت سے معروف تھے بسلاً شائع تھے اور دہلی کے کبار علماء و فقہاء میں گردانے جاتے تھے۔ مولد و منشا دہلی ہے۔ اس زمانے میں دہلی کو علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا فضل امام خیر آبادی اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی مساند تدریس آراستہ تھیں مولانا کرامت علی نے وقت کے ان تمام سرچشموں سے رجوع کیا اور اپنی علمی پیاس بجھائی۔ ان کے علاوہ مولانا محمد اسحاق دہلوی سے مستفید ہوئے۔ شاہ رفیع الدین سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مولانا فضل امام خیر آبادی سے منقولات کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا محمد اسماعیل سے کچھ عرصہ حدیث کا درس لیا اور پھر شاہ محمد اسحاق سے سند حدیث لی۔ حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد دہلی میں خود سلسلہ تدریس شروع کیا اور مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اپنے دور کے ممتاز عالم اور نامور فقیہ تھے۔ استحصار مسائل اور فتویٰ نویسی میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ نہایت

۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۱، ۱۷۲ — تجلی نور ج ۲ ص ۱۳۵، ۱۳۶ — تاریخ شیراز ہند

جون پور ص ۷۷۹، ۷۸۰ — نزمۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۹۲، ۳۹۵ — معنی المعنی ص ۱۲۳،

۱۲۵ — جماعت مجاہدین ص ۲۹۳ ۴

ذہن و فطین بزرگ تھے۔

ایک وقت آیا کہ دہلی میں ان کی معاشی حالت بہت بگڑ گئی اور وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ مجبوراً ترک وطن کر کے حیدرآباد (دکن) کو روانہ ہوئے اور وہاں حکومت اختیار کر لی۔ حیدرآباد اس زمانے میں اہل علم کی قدر و منزلت کے لیے مشہور تھا اور وہاں کے حکام و امرا ان سے بہت تکریم سے پیش آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مقامات کے متعدد ارباب علم اور اصحاب فقہ نے اس کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ مولانا کرامت علی بھی دہلی سے کوچ کر کے مع اہل و عیال کے وہاں پہنچے اور عزت و اکرام کے مستحق قرار پائے۔ حیدرآباد کے عدل و قضا کا محکمہ ان کے سپرد ہوا، اور اس خدمت کے صلے میں ہزار روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ پورے بیس سال اس منصب پر فائز رہے اور نہایت محنت و دیانت سے یہ خدمت انجام دی۔ یہ اہم منصب اس زمانے میں اسی شخص کو تفویض کیا جاتا تھا جو حدیث و فقہ میں مہارت رکھتا ہو، اور مولانا ممدوح بجا طور پر اس صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔

عربی علوم اور زبان پر عبور کا یہ عالم تھا کہ "السیرۃ الاحمدیہ" کے نام سے عربی میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی۔ اس عالم کبیر نے ۱۲۷۷ھ کو حیدرآباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

۲۷۔ مولانا کرم الہی لاہوری

بلد لاہور علم و فضل کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے۔ اس میں بے شمار علما پیدا ہوئے، متعدد مشائخ نے اس سرزمین میں جنم لیا، بہت سے محدثین اس کی خاک سے اُبھرے اور چاروانگ عالم میں مشہور ہوئے۔ لا تعداد فقہانے اس میں مسند تدریس بچھائی اور لوگوں کی کثیر تعداد کو فیض پہنچایا۔ لاہور کو یہ شرف بھی حاصل

۱۔ آثار الصنادید ص ۲۹۱۔ نزہۃ الخواطر ص ۳۹۵، ۳۹۶۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج ۲، ص ۳۱۵۔

ہے کہ اس میں تبرصغیر کے مختلف بلاد و قصبات سے اہل علم تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ان کے فیض صحبت اور ملازمت و التلاک سے ایک دنیا مستفید ہوئی۔ علاوہ ازیں یہ سعادت بھی اس شہر کو حاصل ہوئی کہ متعدد بزرگان دین و مجرمانک سے رخت سفر باندھ کر اس میں وارد ہوئے اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے لوگوں کے قلب و ذہن کو منور کرتے رہے۔

تیسرھویں صدی ہجری میں جن اصحاب علم اور اصحاب فقہ نے لاہور میں پرورش پائی، ان میں مولانا کرم الہی لاہوری کا اسم گرامی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اپنے عہد کے جلیل القدر عالم اور نامور شیخ تھے۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح کے اکابر فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فقہ کے علاوہ صرف و نحو، معانی، بیان، منطق و فلسفہ اور اصول و کلام کے جید عالم تھے۔ ان کی تمام زندگی درس و افادہ میں گزری۔ اپنے زمانے میں انھوں نے خلق کثیر کو مستفید فرمایا۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فرست میں "حدائق الحنفیہ" کے فاضل مصنف مولوی فقیر محمد جہلمی بھی شامل ہیں۔ مولوی فقیر محمد نے تبرصغیر کے مختلف مقامات میں متعدد علما سے حصول علم کیا۔ انھوں نے دہلی میں صدر الصدور مفتی صدر الدین خان سے بھی استفادہ کیا اور ان کے درس میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر قرآن و سماعاً کتب درسیہ و متداولہ کا عبور کیا۔ اس کے بعد اواخر ۱۲۷۷ھ میں وہاں سے مراجعت کر کے اپنے وطن مالوہ میں "آئے لیکن کچھ عرصے کے بعد لاہور چلے گئے،" جہاں فاضل جلیل القدر، فقیہ فرید المذہب مولوی کرم الہی صاحب متوفی ۱۲۸۲ھ سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا۔

بہر حال مولانا کرم الہی لاہوری فحول علمائے فقہ میں سے تھے۔ انھوں نے ۱۲۸۲ھ میں انتقال کیا۔

۲۸— مولانا کرم اللہ دہلوی

مولانا کرم اللہ دہلوی کے والد کا نام نامی عبد اللہ تھا۔ عبد اللہ دراصل ہندو تھے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے متاثر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور عبد اللہ نام رکھا گیا۔ عبد اللہ کے بیٹے کرم اللہ تھے، جنہوں نے شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین دہلوی (تینوں بھائیوں) سے کسب علم کیا اور مدت تک ان بزرگوں کی صحبت و رفاقت میں رہے، ان سے تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی مکمل تعلیم حاصل کی اور اپنے زمانے کے بلند مرتبہ علما میں شمار کیے گئے۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد اس دور کے مشہور روحانی بزرگ شیخ غلام علی دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سلسلہ نقشبندیہ میں سلوک و طریقت کی منزلیں طے کیں۔ اس طرح ظاہری اور باطنی علوم میں درجہ کمال کو پہنچے۔ اس کے بعد ۱۲۲۳ھ میں ارض حجاز کو روانہ ہوئے اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد سورت گئے اور کچھ عرصہ سورت میں رہے۔ اس آشنا میں بہت سے علما و مشائخ اور عوام و خواص نے ان سے استفادہ کیا۔ وہاں سے دہلی آئے اور ایک مدت تک دہلی میں اقامت اختیار کی۔ بعد ازاں پھر عازم حرمین ہوئے، لیکن جب سورت پہنچے تو سلطان کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور وہیں رک گئے۔

دہلی کے اس عالم و فقیہ نے ۲۷— شعبان ۱۲۵۲ھ کو مرض سرطان سے سورت میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

۴۳ حدائق الحنفیہ ص ۲۷۳، ۲۷۴ ———— نزمنا الخواطر ج ۷ ص ۳۹۲—

تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۲

۲۹ — مولانا کریم اللہ فاروقی

مولانا کریم اللہ کے والد کا اسم گرامی لطف اللہ تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے، نسباً فاروقی اور مسلکاً حنفی تھے۔ دہلی کے علمائے احناف اور فقہائے عظام میں خاص عزت و شہرت کے مالک تھے۔ ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جو کثرتِ درس و افادہ میں مشہور تھے۔ وقت کے فحول علماء و محدثین سے استفادہ کیا اور علم و فضل کے اونچے مرتبے کو پہنچے۔ ان کے اساتذہ کرام میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا رشید الدین خاں دہلوی اور مولانا محمد کاظم دہلوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات سے تمام علوم مروجہ و رسمہ کی تکمیل کی۔

علوم ظاہری سے قراغت کے بعد سپد آل احمد مارہروی عرف اچھے میاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذِ طریقت کیا اور ایک عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ بعد ازاں دہلی کو مراجعت کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار علماء و مشائخ نے استفادہ و استفادہ کیا۔

مولانا کریم اللہ بہت سے اوصاف کے حامل تھے۔ عالم و فقیہ، محدث و مدرس، قانع اور عابد و زاہد تھے۔ دنیا اور اہل دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور ہر طرف سے منقطع ہو کر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔

دہلی کے اس باعمل عالم و فقیہ نے نوے سال عمر پا کر ۴ شوال ۱۲۹۱ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔

۵۵ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۲ — آثار الصنادید ص ۲۷۹

نزمہ الخواطر ج ۱، ص ۳۹۸، ۳۹۹

ل

۳۔ مولانا لطف علی راجگیری

مولانا لطف علی بن رجب علی راجگیری، ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر راجگیری کے رہنے والے تھے۔ وقت کے شیخ و عالم اور محدث و فقیہ تھے۔ نہایت نیک اور باعمل بزرگ تھے۔ ۱۲۲۵ھ یا ۱۲۲۷ھ میں ولادت ہوئی۔ کچھ موش سنبھالا تو حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ اس کے لیے متعدد علاقوں اور شہروں کا سفر کیا اور اس دور کے جید اساتذہ سے مختلف علوم و فنون حاصل کیے۔ مثلاً مفتی نعمت اللہ لکھنوی، مفتی واجد علی بناری، مولانا نور الحسن کاندھلوی، مفتی صدر الدین خاں دہلوی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے کتب درسیہ پڑھیں۔ اس زمانے میں دہلی میں سید تذبیر حسین دہلوی کا سلسلہ درس حدیث جاری تھا مولانا لطف علی مذکورہ سب علمائے حصول علم کے بعد میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔ اس کے بعد اپنے شہر راجگیری گئے۔ اس وقت وہ پچیس سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ راجگیری میں انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے قرآن مجید بھی حفظ کیا۔

ایک مدت کے بعد انھوں نے پھر تحصیل علم کو اپنا مشغلہ ٹھہرایا۔ سہارن پور میں اس وقت مولانا احمد علی سہارن پوری درس حدیث دیتے تھے، یہ ان کے ہاں گئے کچھ عرصہ وہاں رہے اور علم حدیث میں ان سے استفادہ کیا۔ پھر عازم مراد آباد ہوئے، وہاں سید عالم علی حسینی نگیںوی سے اکتساب علم کیا۔

اس طرح کئی سال حصول علم میں بسر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ عظیم آباد آئے۔ گئے اور وہاں سلسلہ تدریس کا آغاز کیا۔ کافی عرصہ وہاں گزارا۔ پھر جازتیں دیا۔

اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ اس عہد میں مدینہ منورہ میں شیخ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی مقیم تھے اور طلباء کو حدیث کا درس دیتے تھے، مولانا لطف علی ان کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آئے اور ٹونک میں اقامت اختیار کی۔ وہاں کی مسند تدریس پر فائز ہوئے اور ایک سال کچھ مہینے وہاں مقیم رہے۔ وہاں سے چلے اور اثنائے سفر میں بنارس پہنچے تو بیماری نے اگھیرا، اور وہیں وفات پا گئے۔

مولانا لطف علی راجگیری کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اوائل عمر میں منطق و فلسفہ سے زیادہ دلچسپی تھی، ان علوم میں مہارت پیدا ہوئی تو تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد حدیث اور فقہ کو مرکز التفات ٹھہرایا اور ان علوم میں درجہ کمال کو پہنچے۔ بہت سے علما و طلباء کو حدیث اور فقہ کا درس دیا اور نہایت محنت سے یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔

ان میں بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ علم و فضل کے ساتھ ساتھ حلم، نرمی، متانت، صدق و صلاح اور ظاہر و باطن کی صفائی میں بے نظیر تھے۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ ۱۸۔ شوال ۱۲۹۶ھ کو دوران سفر بنارس میں وفات پائی ہے

۳۱۔۔۔ مولانا لطف اللہ لکھنوی

مولانا لطف اللہ ابن عبداللہ لکھنوی اپنے علاقے اور عہد کے علامہ، بہت بڑے فاضل اور نامور شیخ تھے۔ اس زمانے کے مشہور علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اصلاً یوپی کے ایک مقام غازی پور کے نواح میں زمانیہ کے رہنے والے تھے۔ مولد و منشا زمانیہ ہی تھا۔ کچھ بڑے ہوتے تو حصول علم کے لیے گھر سے نکلے اور لکھنؤ بنا پہنچے۔ پھر وہیں سکونت اختیار کر لی اور لکھنوی کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ زیادہ تر

کتبِ درسیہ مولوی ولی اللہ لکھنوی سے اور بعض مرزا حسن علی محدث شافعی سے پڑھیں نہایت ذکی، سربلغ الادراک اور قوی حافظہ تھے۔ بحث و جدال میں انتہائی تیز تھے۔ مسلماً حنفی تھے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد لکھنؤ میں اقامت گزریں ہو گئے تھے۔ تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی۔ بہت سے علمائے اُن سے استفادہ کیا۔ انھوں نے مناظرانہ انداز کی کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :-

۱۔ اوتاد المحمدیہ لمنکر الاجتهاد والنقلید :- یہ کتاب ایک مقدمہ، چار اوتاد اور خاتمے پر محیط ہے۔ اس میں شیخ عبدالحق نیوتنی بنارس کی ترویج کی گئی ہے۔

۲۔ لمعات الثقلین فی اثبات حدیث الاقتداء بالشیخین :- ایک مقدمہ، ذیل، تین لمعات اور خاتمے پر مشتمل ہے۔

۳۔ صولۃ الاسد علی اعداء التعدد :- یہ ایک رسالہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ ایک شہر کے مختلف مقامات میں نماز جمعہ پڑھی جاسکتی ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے مولانا محبوب علی سنہلی کے ایک رسالے "ہدایۃ الجمعۃ" کے جواب میں لکھا، جس میں مولانا محبوب علی نے تحریر کیا تھا کہ ایک شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ پڑھنا چاہیے، مختلف مقامات میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں۔

۴۔ مظهر العجائب :- یہ سورۃ فاتحہ کی تفسیر ہے جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس میں شیعہ کا رد کیا گیا ہے۔

۵۔ القبقاب :-

۶۔ طعن السنان :-

اس کے علاوہ انھوں نے بعض اور رسائل بھی قلم بند کیے۔

مولانا عبد اللہ لکھنوی نے ماہِ جمادی الاولیٰ، ۱۲۹۷ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

۳۲ — سید مجاہد الدین حسینی بالاپوری

ہندوستان کے علاقہ برار میں جن اصحاب تصوف اور اباب طریقیت فقہا نے جنم لیا، ان میں مولانا سید مجاہد الدین بن معصوم حسینی بالاپوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سید مدوح کا شمار مشائخ نقشبندیہ میں ہوتا تھا اور تیرھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے ممتاز فقیہ اور شیخ تھے۔ بالاپور میں جو علاقہ برار میں واقع ہے، ۱۱۵۸ھ کو پیدا ہوئے اور کچھ ہوش سنبھالا تو مولانا شمس الدین بالاپوری کے حلقہ مدرس میں شرکت کی۔ مولانا شمس الدین اس علاقے کے نامور عالم تھے۔ مجاہد الدین نے ان سے ابتدائی دینی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اورنگ آباد کا رخ کیا اور سید نور الہدیٰ حسینی اورنگ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے باقی کتب و رسبہ کی تکمیل کی اور کافی عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ اورنگ آبادی کے ایک بزرگ سید نور الہدیٰ حسینی کے والد مکرم سید قمر الدین حسینی کا سلسلہ طریقیت جاری تھا، فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس میں شامل ہو گئے اور ان سے اخذ طریقیت کیا۔ عرصے تک ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔

اورنگ آباد میں انہوں نے سید نور الہدیٰ اور سید قمر الدین دونوں باپ بیٹے سے استفادہ اور استفادہ کیا۔ سید نور الہدیٰ سے علوم رسمبہ کی تعلیم حاصل کی اور سید قمر الدین کے حضور تصوف و طریقیت کی منزلیں طے کیں۔ اس کے لیے کئی سال اورنگ آباد میں بسر کیے اور تعلیم و تربیت کے بہت سے مرحلوں کو عبور کیا۔

اس کے بعد اپنے وطن بالاپور واپس آئے اور اپنے والد ماجد سید معصوم حسینی بالاپوری سے جو اس دور کے عالم اور صوفی تھے، اخذ طریقیت کیا۔ عرصے تک ان کی صحبت میں رہے اور سلوک و طریقیت کے بلند مقام پر فائز ہوئے۔ بالاپور ہی میں درس و

افادے کا سلسلہ شروع کیا اور طویل مدت تک وہاں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس اثنا میں ان سے بہت سے علما و طلباء نے علم حاصل کیا۔

بعد ازاں ۱۲۳۳ھ میں حیدرآباد کو روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو حلقہ علما اور طبقہ امرا میں نہایت عزت و احترام کے مستحق گردانے گئے۔ اس زمانے میں حیدرآباد (دکن) کا حکمران سکندر جاہ تھا، اُس نے اُن کی بہت پذیرائی کی اور دو گاون بطور جاگیر عطا کیے۔

سید مجاہد الدین حسینی بالاپوری بلاشبہ جید عالم، ممتاز صوفی اور نامور فقیہ تھے، اپنے دور اور علاقے میں بڑی شہرت اور عزت کے مالک تھے۔ جمعرات کے روز ۲۰۔ رجب ۱۲۳۵ھ کو فوت ہوئے۔ بالاپور میں مدفون ہیں۔

۳۳۔۔۔ مولانا محبوب علی سنہلی

ہندوستان کا صوبہ یوپی جو اب اتر پردیش کے نام سے موسوم ہے، ہمیشہ علما و فضلا کا مرکز رہا ہے۔ اس کے تمام بلاد و قصابات اور دیہات میں اہل علم کی بہت بڑی جماعت مصروف تدریس و تصنیف بھی رہی اور تصوف و طریقت میں بھی اس نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس میں بے شمار مشائخ پیدا ہوئے جنہوں نے مختلف مقامات پر سجادہ مشیخت آراستہ کیا اور لاتعداد لوگوں کو روحانی فیض پہنچایا۔ بدین نے لاکھوں طلباء کو علم کی دولت سے بہرہ مند کیا اور مصنفین نے ہر موضوع سے متعلق کتابیں لکھیں اور تحریر کے ذریعے ہر طبقہ فکر کے اُن گنت افراد کو مستفید فرمایا۔ یوپی کے علاقوں میں ایک شہر کا نام سنہلی ہے، علی لحاظ سے کسی زمانے میں یہ نہایت زرخیز شہر تھا اور اس کے گرد و نواح میں بہت سے ارباب فضل سکونت پذیر تھے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر کے ایک عالم مولانا محبوب علی تھے جو حنفی المسک

تھے اور فقہائے احناف میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ سنبھل سے وہ رام پور گئے اور پھر ۱۲۶۰ھ میں لکھنؤ میں وارد ہوئے۔ وہاں چند روز شیخ پیر محمد لکھنوی کے مدرسے میں قیام کیا۔ وعظ و تذکیر ان کا مشغلہ تھا۔ مولانا لطف اللہ لکھنوی (متوفی جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ) ان کے حریف تھے۔ نماز جمعہ کے بارے میں مولانا لطف اللہ کا موقف یہ تھا کہ ایک شہر میں متعدد مقامات پر نماز جمعہ پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مولانا محبوب علی سنبھلی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ایک شہر میں ایک ہی مقام پر جمعہ ادا کرنا چاہیے، چنانچہ اس موضوع پر ایک رسالہ تصنیف کیا، جس کا نام ”ہدایۃ الجمعہ“ رکھا۔ اس میں انہوں نے ثابت کیا کہ ایک شہر کے متعدد مقامات میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں، بلکہ تین مقامات میں جمعہ پڑھنا مکروہ ہے اور اس میں کراہت تخریمی لازم آتی ہے۔ مولانا لطف اللہ نے اس کے جواب میں ”صولۃ الاسد علی اعداء التعدد“ کے نام سے رسالہ تحریر کیا اور اس میں انہوں نے مولانا محبوب علی کے نقطہ نظر کی تردید کی۔

مولانا محبوب علی سنبھلی سخت مزاج عالم تھے۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر عزیزی کو بھی بدفہم و تنقید ٹھہرایا اور ”ما اهل لعنہ اللہ“ کے مسئلے میں شاہ صاحب نے جو انداز اختیار کیا ہے، اس کو غلط قرار دیا۔ وہ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی مشہور کتاب ”تقویۃ الایمان“ کے مندرجات کو بھی صحیح نہ سمجھتے تھے۔

مولانا محبوب علی اگرچہ اپنے دور کے فقیہ اور عالم تھے، تاہم ان کے عہد کے بہت سے فقہاء و علما ان کے افکار و خیالات سے نہ صرف متفق نہ تھے بلکہ ان کی تردید کرتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا پتا بھی نہیں چل سکا اور ان کی علمی سرگرمیوں کا بھی اس سے زیادہ علم نہیں ہو سکا۔

۳۴ — شیخ محسن ترمہٹی

شیخ محسن بن یحییٰ بکری تمیمی ترمہٹی فریسی، تیسویں صدی ہجری کے کبار شیوخ و علما اور نامور محدثین و فقہاء میں سے تھے۔ ترمہٹ کے قریب ایک مقام فریسیہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم صدر رکن الدین ترمہٹی سے حاصل کی۔ پھر شریف عبدالغنی مفتی سارنی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ جواد سلمیٰ اور فقیہ محمد بکری کے سامنے بھی زانوئے تلمذ متہ کیا۔ بعد ازاں شیخ محمد سعید بن واعظ علی عظیم آبادی سے کسب علم کیا۔ ان سب حضرات سے علم نحو اور علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ پھر کانپور کا عزم کیا، وہاں شیخ سلامت اللہ صدیقی بدایونی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور تقریباً دو سال ان کی خدمت میں رہے، ان سے صحیح بخاری کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ اس کے بعد مولانا فضل امام خیر آبادی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بعض علوم کی کتابیں پڑھیں۔ پھر مفتی واحب علی بن ابراہیم بن عمر فاروقی بناری سے اکتساب علم کیا۔

جب وہ مندرجہ بالا علما سے حصول علم کر چکے تو اللہ نے انہیں توفیق رح مرحمت فرمائی اور ارض حجاز کو روانہ ہوئے۔ حج بیت اللہ کیا اور مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے مشہور محدث و فقیہ شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جو قمری حساب سے ۱۲۷۳ھ میں رونما ہوا تھا، ترک وطن کر کے مدینہ منورہ میں جا بسے تھے اور وہاں سلسلہ درس حدیث جاری کر دیا تھا۔ مدینہ منورہ میں ہندوستان اور دیگر ممالک کے بے شمار علما و طلباء نے ان سے علم حدیث پڑھا اور ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ شیخ محسن ترمہٹی بھی ان کی خدمت میں گئے اور ان سے علم حدیث پڑھا۔ شیخ محسن ترمہٹی نے ایک کتاب ”البیان الغنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی“

سپر و قلم کی۔ یہ رجال کے سلسلے میں حوالے کی کتاب ہے اور نہایت عمدہ اور شان دار کتاب ہے۔ اس کتاب کی تصنیف سے وہ ہجرت کے روز، عشا کے وقت ۱۹۔ رجب ۱۲۸۰ھ کو فارغ ہوئے۔ یہ کتاب انھوں نے مدینہ منورہ میں مکمل کی ہے۔

۳۵۔ قاضی محمد مغربی

قاضی محمد بن ابوسعید انصاری مغربی اصلاً تلمسان کے رہنے والے تھے اور مسلک مالکی تھے۔ اپنے وطن میں قرآن مجید حفظ کیا اور علم حدیث کی تکمیل کی۔ قرأت بھی وہیں پڑھی۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ گئے، وہاں علم فقہ میں عبور حاصل کیا پھر عازم ہند ہوئے اور لکھنؤ میں قیام کیا۔ اس عہد میں لکھنؤ میں درس نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین انصاری سہالوی کا غلغلہ درس بلند تھا، اس میں شریک ہوئے اور مولانا محمود ج سے فقہ اصول فقہ، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی کتابیں مکمل کیں۔ پھر دہلی کو روانہ ہوئے اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ دہلی سے نجیب آباد کا عزم کیا اور کافی مدت وہاں سکونت اختیار کیے رکھی۔ نجیب آباد سے مدراس روانہ ہوئے اور وہاں کی مسند افتا ان کے سپرد کی گئی۔

قاضی محمد مغربی جلیل القدر عالم، ممتاز فقیہ اور حافظ حدیث تھے۔ قرأت سبب پر عبور رکھتے تھے۔ کتب حدیث میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ الفاظ اور معانی نوک زبان تھے۔ نہایت ذہین اور عالی دماغ تھے۔ اللہ پر توکل کا یہ حال کہ لوگوں نے ان سے کہا، اپنی اولاد نواب کے حوالے کر دیں۔ فرمایا: واللہ! میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ اپنی اولاد کو صرف اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ: **وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ**۔ ان کی اولاد علم و فضل اور امانت و ریاست میں بلند مرتبے کو پہنچی اور

دیار ہند میں ان کے خاندان کے افراد نے بڑی عزت حاصل کی۔
ارض ہند کے اس مالکی فقیہ و عالم نے ۱۳ — محرم ۱۲۰۱ ھ کو وفات
پائی ۴۶

۳۶ — سید محمد سورتی

ارض ہند میں سورت وہ شہر ہے جس کو بے شمار علما و فضلا کے مسکن ہونے
کا شرف حاصل ہے۔ جب سے یہ سرزمین اسلام سے آشنا ہوئی ہے ہورت
اور گجرات وغیرہ میں بہت سے اربابِ فضیلت پیدا ہوئے اور متعدد اصحابِ
کمال نے مختلف مقامات سے یہاں آکر سکونت اختیار کی۔ اس بلدہ علم کے
علما میں ایک شخص سید محمد بن ابو محمد حسینی تھے جو تیرھویں صدی ہجری میں اس
نواح کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ سورت اور اس علاقے کے دیگر مقامات
میں نہایت شہرت رکھتے اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کے زمانے میں اُج کے ایک عالم سید محمد بن عبدالرزاق حسینی
اُچی، سورت میں سکونت پذیر تھے، سید محمد حسینی سورتی نے انہی سے اخذ علم کیا
اور اپنے شہر اور علاقے کے مشاہیر علما و فقہاء میں گردانے گئے۔ وہ ہندوستان
میں انگریزوں کا دور تھا اور انگریزی حکومت کے محکمہ عدلیہ میں باقاعدہ مفتی مقرر
تھے جو عدالتوں میں پیش ہونے والے دینی اور شرعی معاملات میں فتویٰ جاری
کرتے تھے اور پھر ان کے فتوے کی روشنی میں فیصلے صادر ہوتے تھے۔ سورت
میں بھی محکمہ افتا قائم تھا۔ صاحب ترجمہ سید محمد حسینی چونکہ فقہ اور دیگر علوم میں
کامل دسترس رکھتے تھے، اس لیے ان کو افتا کا منصب تفویض کیا گیا، جس پر یہ
طویل عرصے تک متعین رہے۔

افتا کی خدمات کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا جس میں بہت سے علما و طلباء نے ان سے استفادہ کیا۔

سورت کے اس جید عالم و فقیہ نے غرہ ذیقعدہ ۱۲۲۸ھ میں وفات

پائی ہے

۳۷ — مولانا محمد حسین آبادی

گزشتہ دور میں حیدرآباد (دکن) کو علما و فقہاء کے مرکز اور مشائخ و اتقیاء کے مسکن کی حیثیت حاصل رہی ہے اس کے حکمران اہل علم کی بے حد تعظیم کرتے اور ان کو انتہائی لائق اکرام قرار دیتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے نقل مکانی کر کے بہت سے علما حیدرآباد میں جا آباد ہوئے تھے اور امرائے حیدرآباد ان سے بدرجہ غایت احترام کا برتاؤ کرتے تھے۔ علما کی خاصی بڑی تعداد ایسی تھی جو علاقہ دکن سے تعلق رکھتی تھی اور وہاں کے حکمران ان کے ساتھ بھی نہایت تکریم سے پیش آتے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے مقامی علما میں مولانا محمد بن عزت حیدرآبادی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ وہ اپنے عہد کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ انھیں ان کے فضل و کمال کی بنا پر ریاست کی طرف سے نواب محی الدولہ محمد یار خاں مہادر کا خطاب ملا تھا۔ وہ دکن کے صدر الصدور اور دولت آصفیہ کے منتخب تھے۔ یہ مناصب ان کی علمی اور فقیہی قابلیت کی وجہ سے عطا کیے گئے تھے۔

وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی اور حاکم دکن کے نزدیک انتہائی عزت و احترام کے مستحق گردانے گئے۔ امرائے مملکت اور دیگر تمام لوگ ان کی بہت تکریم کرتے تھے۔ علما و مشائخ کے حلقوں میں بھی ان کو نہایت

شہ نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۴۱۱ بحوالہ حدیقہ سورت

احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اہل علم کی کثیر جماعت ان کے گرد جمع ہوگئی تھی۔ وہ اس درجے سخاوت و جودت کا مظاہرہ کرتے کہ علما و مشائخ کو بڑی بڑی رقوم و صلوات سے نوازتے۔

خراجی زمین کے متعدد قطععات ان کے پاس تھے جو ان کی اولاد و احفاد کو بھی منتقل ہوئے۔ علم و عمل، غنا و سخاوت اور مال و دولت میں ان کی طرح ان کی اولاد نے بھی بڑی شہرت پائی۔

مولانا محمد حیدر آبادی نے ۲۷ — ذی الحجہ ۱۲۸۳ ھ کو حیدرآباد (دکن) میں وفات پائی۔

۳۸ — مولانا محمد تھانوی

مولانا محمد بن احمد اللہ فاروقی تھانوی، مشہور علما و فقہا میں سے تھے۔ مولد و منشا تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) ہے۔ پہلے مولانا عبدالرحیم تھانوی اور شیخ قلندر بخش جلال آبادی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے متعدد درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر عازم دہلی ہوئے، وہاں مولانا مملوک علی نانوتوی سے علوم مروریہ کی تحصیل کی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے فلسفہ و منطق کی تکمیل کی۔ اس زمانے میں دہلی میں مولانا محمد اسحاق دہلوی کا ہنگامہ درس حدیث زوروں پر تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر علم حدیث میں عبور حاصل کیا۔ مولانا محمد تھانوی نہایت ذکی، سریع الادراک، قوی الحفظ اور نرم مزاج و نرم کلام تھے۔ ابتدائے عمر ہی سے اصحاب تقویٰ اور بزرگان دین سے تعلق رکھتے تھے۔ صغر سنی ہی میں سید احمد شہید بریلوی کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے تھے۔ جب جوانی کو پہنچے تو شیخ نور محمد جھنجانوی سے اخذ طریقت کیا۔

لے نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۱۲ بحوالہ مرجان تاب ۷

بعد ازاں ٹونک گئے اور وہاں کی مسند تدریس پر فائز ہوئے، مدتِ مدید تک وہاں درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں بہت سے علما و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔ پھر اپنے وطن تھانہ بھون واپس آگئے اور تمام عمر تذکیر و تلقین اور دعوت و ارشاد میں صرف کر دی۔

مولانا مسدوح منند و کتابوں کے مصنف تھے، ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔ دلائل الاذکار فی اثبات الجہر بالاسرار، القسطاس فی اثر ابن عباس، ارشادِ محمدی، اثباتِ ذکر بالجہر، مکاتبتِ محمدیہ، المناظر المحمدیہ، تفضیل الختین، تعلیقات علی شرح عقائد۔

تھانہ بھون کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲۹۶ھ میں انتقال کیا اور چھیاٹھ برس عمر پائی۔

۹ — مولانا محمد شاہ جہان پوری

مولانا محمد افغانی شاہ جہان پوری کا اصل نام محمد زمان خان تھا اور انہیں محمد زمان خان شہید کہا جاتا ہے (جیسا کہ آگے بتایا جائے گا) ان کو شہید کر دیا گیا تھا۔ باپ کا نام اکبر تھا۔ ۳ — ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ کو شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے اور کچھ بڑے ہوئے تو وہیں کے علما سے حصولِ علم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر کان پور گئے اور وہاں مولانا سلامت اللہ صدیقی بدایونی کے حلقہٴ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ بعد ازاں حیدرآباد جا کر شیخ کرامت علی دہلوی امرابلی سے جو شافعی المسلک عالم تھے، کتبِ حدیث کا درس لیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حیدرآباد (دکن) ہی میں سکونت اختیار کر لی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ وسعتِ علم و فضل کی بنا پر تھوڑے ہی

عرصے میں حیدرآباد اور اس کے گرد و نواح میں اُن کی شہرت پھیل گئی۔ والی دکن نواب ناصر الدولہ تک ان کے فضل و کمال کا شہرہ پہنچا تو اس نے ان کو طلب کیا اور اپنے بیٹے افضل الدولہ کا معلم مقرر کر دیا۔ افضل الدولہ فوت ہو گیا تو اس کے بیٹے محبوب علی خاں کے معلم بنا دیے گئے۔ اسی اثنا میں سفر حجاز پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ دمشق، شام، بیت المقدس، نجف، طیف و کربلا و بغداد اور بعض دیگر اسلامی بلاد و امصار کا سفر کیا۔

نہایت عابد و زاہد، ایشیا پیشہ، جواد اور متوکل علی اللہ تھے تمام عمر شادی نہیں کی، تخریق کی زندگی بسر کرتے رہے۔ طلباء کو درس دیتے اور درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ طلباء کے لباس، ان کی سکونت اور اکل و شرب کی خود ہی کفالت کرتے تھے۔ جب طلباء تعلیم سے فارغ ہو جاتے تو امرا و حکام سے سفارش کئے ان کی ملازمت وغیرہ کا بھی انتظام کرتے۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی تصنیفات میں ایک کتاب خیر الموعظ ہے جو دو جلدوں میں ہے اور حدیث کے موضوع پر ہے۔ ایک لسان الجن اور ایک کتاب الرحلہ ہے۔ ایک اور کتاب ہدیت المہدویہ ہے جو فرقہ مہدویہ کے سید محمد جون پوری کے متبعین کی تردید میں ہے۔ یہی کتاب ان کی شہادت کا باعث بنی۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو حیدرآباد کے فرقہ مہدویہ کے لوگ مشتعل ہو گئے اور ان کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ان میں سے ایک آدمی غضب ناک ہو کر آیا اور ان پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا۔ یہ عاثر نماز مغرب کے بعد اس وقت پیش آیا جب وہ اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، قاتل نے زور سے خنجر مارا، اور ان کے خون کے چھینٹے قرآن کی اس آیت پر جا گرے۔ "فَاَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ" یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۰۳ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے۔ سو دیکھیے ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

ان کی شہادت منگل کے روز ۶۔ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو حیدرآباد (دکن) میں ہوئی اور اپنے مدرسے کے احاطے میں دفن کیے گئے۔

۴۰۔ سید محمد لکھنوی

دیار ہند کے تیسرے صدی ہجری کے شیوخ و علماء و فقہاء میں سید محمد بن دلدار علی حسینی نقوی کا نام قابل ذکر ہے۔ وہ اپنے عہد کے علامہ، شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ شیوخ کے مجتہد اور امام تھے۔ ان کے اسلاف نصیرآباد کے رہنے والے تھے اور بعد کو لکھنؤ آگئے تھے، اس لیے یہ نصیرآبادی بھی کہلائے اور لکھنوی بھی۔!

سید محمد، ۱۔ صفر ۱۱۹۹ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی سید دلدار علی کے بڑے بھائی سے حصول علم کیا۔ طویل عرصے تک ان کے حلقہ شاگردی میں رہے اور تقریباً تیس سال کی عمر میں علوم متعارفہ کی تکمیل سے فارغ ہوئے۔ پھر خود درس و تدریس کی تیاری شروع کی، جس کی ان کے والد سید دلدار علی نے ۱۲۱۸ھ میں اجازت دی۔ مسند تدریس پر فائز ہونے کے بعد ان سے ان کے بھائیوں سید حسین، سید علی اور بہت سے علمائے استفادہ کیا۔ سید محمد نقوی لکھنوی اپنے عہد کے علوم رسمہ میں مہارت رکھتے تھے اور فقہ و اصول اور کلام میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اپنے علم و فضل کی بنا پر بادشاہان اودھ کے نزدیک بڑی عز و جاہ کے مالک تھے۔ بالخصوص امجد علی شاہ ان کو نہایت لائق احترام گردانتا تھا۔ اس نے ان کو سلطان اعلم کے لقب سے نوازا اور مملکت اودھ کا منصب افتا ان کے سپرد کیا۔ وہ ان کے گھر جا کر ان سے ملاقات کرتا، ان کی صحبت میں بیٹھتا، ان سے استفادہ کرتا اور نہایت

۵۵ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۸ تا ۱۹۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۳، ۲۱۴

تواضع اور انکسار سے پیش آنا۔

سید محمد نقوی لکھنوی اپنے عہد میں شیعہ کے مجتہد اور امام تھے شیعہ فقہ میں ان کو عبور حاصل تھا اور تمام اہم مسائل کے حل و کشور کے لیے اس دو کے شیعہ حضرات انہی سے رجوع کرتے تھے۔ عوام و خواص شیعہ میں ان کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں یہ کتابیں شامل ہیں :-

اصل الاصول :- یہ کتاب سید مرتضیٰ اخباری کی تردید میں

ہے جنہوں نے ان کے والد سید ولد ار علی نقوی کی کتاب اساس الاصول پر نقض وارد کیا۔

سید علی طباطبائی کی شرح الصغیر پر تعلیقات -

علامہ اللہ سندیلوی کی شرح مسلم پر تعلیقات -

الصمصام القاطع :- یہ کتاب مذہب اہل سنت کے ابطال میں

اور اس بات کے اثبات میں ہے کہ وہ اہل بیت سے عداوت رکھتے ہیں -

طعن الرماح :- یہ فذک اور شرطاس کی بحث سے متعلق ہے -

ایک کتاب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تحفہ اثنا عشریہ کی اس بحث

کے جواب میں ہے جو انہوں نے مسئلہ امامت کے بارے میں کی ہے -

الضربة الحیدریہ فی رد الشوكة العریہ :- یہ کتاب مولانا رشید الدین

خان دہلوی کی الشوكة العریہ کے رد میں ہے -

ثمر الخلافۃ :- یہ اس بات کے اثبات میں ہے کہ خلافت حضرت

حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے لیے مقرر تھی -

الجمالة النافعة :- یہ علم کلام اور اصول دین سے متعلق ہے -

سم الفار :- اہل سنت کے رد میں -

البرق المخاطف :- حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں -

ایک رسالہ نماز جمعہ سے متعلق ہے -

عالمی کی زبدۃ الاصول کی شرح :- یہ نامکمل رہی۔
 الفوائد النصیریہ :- یہ زکوٰۃ اور خمس وغیرہ کے موضوع
 سے متعلق ہے۔ یہ کتاب انھوں نے محمد علی شاہ کے نام پر موسوم کی جو اس
 کتاب کی تصنیف کے وقت نصیر الدولہ کے لقب سے ملقب تھا۔
 کشف الغطاء :- یہ کتاب ایک شیعہ عالم سید یار علی نصیر آبادی
 کے زور میں ہے جنہوں نے ان کے والد سید ولد ار علی نقوی کی تصنیفات پر
 اعتراضات وارد کیے تھے۔

گوہر شاہوار :- اس میں قرآن مجید اور اہل بیت کے درمیان مفاضلت ثابت کی گئی ہے۔
 السبع المثانی :- قرأت سے متعلق۔

احیاء الاجتہاد :- اصول فقہ کے موضوع پر۔
 ایک کتاب پاؤں پر مسح کے مسئلے سے متعلق ہے۔
 اس شیعہ عالم و مجتہد نے ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی ہے۔

۴۱ — مفتی محمد برووانی

علاقہ بنگال میں جن علما و فقہانے شہرت اور ناموری حاصل کی، ان میں
 مفتی محمد بن ضیاء الدین برووانی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ فقہائے حنفیہ
 میں سے تھے اور سرزمین بنگال کے ایک مقام برووان کے رہنے والے تھے،
 اسی لیے ان کو محمد راشد برووانی کہا جاتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں پیدا
 ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ اور دیگر مدارس میں تعلیم حاصل کی
 اور علوم و فنون میں ممتاز قرار پائے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کلکتہ
 کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ میں "مولوی" کے منصب پر فراز ہوئے جو

اس زمانے میں عدلیہ کا ایک اونچا منصب تھا اور جو انہی حضرات کو تفویض کیا جاتا تھا جو فقہ اور دیگر علوم سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اس کے بعد کلکتہ کے عہدہ افتا پر فائز ہوئے اور اس میں خوب کامیاب رہے اور اسی لیے مفتی مشہور ہوئے۔

مفتی محمد بردوانی نے ۱۲۲۱ھ میں فقہ کی انتہائی کتاب ہدایہ کے فارسی ترجمے کی تصحیح کے فرائض انجام دیے اور یہ خدمت انھوں نے ہندوستان کے وائسرائے سر جارج ہلر و بارلو کے زمانے میں ہندوستان کے چیف جسٹس جان ہیریٹ ہارنگٹن کے حکم سے انجام دی۔ ہدایہ کے جس فارسی ترجمے کی انھوں نے تصحیح کی وہ کلکتہ کے سابق قاضی القضاة غلام یحییٰ خاں بہاری نے کیا تھا۔

بہر حال مفتی محمد بردوانی ارض بنگال کے نامور فقیہ اور معروف عالم تھے۔ اپنے علم و فضل کی بنا پر ملک کے علمائے دین اور انگریز حکمرانوں کے نزدیک بہت عزت و احترام رکھتے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے اس فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۴۲ — مولانا سید محمد غزنوی

مولانا سید محمد غزنوی حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند تھے! اپنے دو بچے شیخ عالم اور محدث تھے۔ ان کے والد گرامی حضرت عبداللہ غزنوی کے حالات فقہانہ پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری کی دوسری جلد میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس ضمن میں کہیں کہیں سید محمد غزنوی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

سید عبداللہ غزنوی کو اعلیٰ کلمۃ الحق اور اشاعت توحید و سنت کی پاداش میں اس زمانے کے والی افغانستان نے اپنے ملک سے نکال کر پشاور کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اس وقت خاندان کے جو لوگ ان کے ساتھ تھے، ان میں

صاحب ترجمہ مولانا سید محمد غزنوی بھی شامل تھے۔ اہل حق کا یہ قافلہ مختلف مقامات سے ہوتا ہوا مشرقی پنجاب کے شہر امرت سر میں سکونت پذیر ہو گیا تھا اس کے تمام افراد تہذیب و تقویٰ میں بے مثال تھے۔

مولانا محمد بن عبداللہ غزنوی کا تذکرہ سید عبدالرحی حسنی نے نزہۃ الخواطر کی ساتویں جلد میں مولانا شمس الحق ڈیلانی کی قلمی کتاب تذکرۃ النبلا کے حوالے سے کیا ہے اور ان کے فضل و کمال، اتقا، زہد و عبادت اور تہذیب و نجابت کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کے ان اوصاف سے وہی شخص انکار کر سکتا ہے، جس کے دل میں ان کے خلاف بغض و کدورت کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہو۔

سید محمد غزنوی، افغانستان کے شہر غزنیہ کے نواح میں ایک قریہ صاحب زادگان میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تربیت کی منزلیں وہیں طے کیں۔ ان کے والد واحد حضرت عبداللہ غزنوی جو نسکی اور علمی رفعت میں ممتاز تھے، اپنے اس بیٹے سے نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے ان کو مختلف علوم کی درسی کتابیں پڑھائیں۔ اس کے بعد یہ لوگ افغانستان سے ہجرت کر کے وارد ہند ہوئے اور امرت سر کو اپنا مسکن ٹھہرایا تو مولانا محمد غزنوی نے دہلی کا عزم کیا وہاں مولانا سید زبیر حسین محدث دہلی کا سلسلہ درس حدیث جاری تھا، اس میں شامل ہوئے، ان سے علم حدیث پڑھا اور اپنے تمام اقربان و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد امرت سر آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

مولانا ممدوح کا شمار اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ہوتا ہے، وہ ان حضرات میں سے تھے جو مخالفین کی طرف سے اللہ کی راہ میں تکلیفوں اور اذیتوں میں مبتلا کیے گئے اور احیائے سنت کے سلسلے میں جنہیں ترک وطن کرنا پڑا۔ سید عبدالرحی حسنی ان کا تذکرہ کرتے ہوئے نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں :-

وہو اکبر ان پینہ علی سبیرتہ منلی
کہ ان کی ذات گرامی اس سے کہیں بلند ہے کہ میرے جیسا کوئی شخص ان
کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کرے۔
انہوں نے تفسیر جامع البیان پر حاشیہ لکھا، جس کی علما نے نہایت تحسین
کی۔ بلاشبہ مولانا مرحوم تیرھویں صدی ہجری کے مشہور مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔
مسئلہ اہل حدیث تھے۔ ذیقعدہ ۱۲۹۶ھ کو امرتسر میں فوت ہوئے۔

۴۳ — قاضی محمد خاں رام پوری

ہندوستان کے شہر رام پور کے فقہائے احناف میں قاضی محمد خاں بن
عرفان رام پوری اپنے عصر اور علاقے کے بہت مشہور اور نامور فقیہ تھے اور ان
کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز فضلا اور شیوخ میں ہوتا تھا۔ ان کے
والد ملا عرفان خراسان کے باشندے تھے، وہاں سے ہندوستان آئے اور
بحرالعلوم عبدالعلی انصاری فرنگی محلی سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد
رام پور میں سکونت اختیار کی اور فقہ و اصول میں کئی عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان
کے بیٹے قاضی محمد خاں کا مولد و منشا رام پور ہے۔ اپنے والد ملا عرفان، مفتی
شرف الدین رام پوری، ملا حسن لکھنوی اور زکریا العلوم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی سے
علم حاصل کیا۔ حصول علم سے فارغ ہونے تو اپنے شہر رام پور میں مسند درس
آراستہ کی۔ اس زمانے میں رام پور کو علما و فضلا کے مسکن کی حیثیت حاصل تھی۔
قیام رام پور کے زمانے میں بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔
رام پور سے ٹونک گئے اور ٹونک میں اس وقت متعدد اہل علم فروکش
تھے۔ وہاں ان سے امیر ٹونک نواب وزیر الدولہ نے علم حاصل کیا اور بھی کئی لوگ

مستفید ہوئے۔ نواب وزیر الدولہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں ٹونک کے محکمہ قضا پر متعین کیا۔ پھر وہیں اقامت گزریں ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے ایک بھائی قاضی خلیل الرحمن رام پوری تھے، وہ بھی فقہ و اصول کے جدید عالم تھے، لیکن فقہی نوعیت کے اختلافی مسائل میں نہایت متعصب حنفی تھے۔ اس کے برعکس قاضی محمد خاں نرم مزاج تھے۔ اگرچہ سگایہ بھی حنفی تھے لیکن مسائل کی وضاحت و تبیین میں کسی نوع کے تعصب کا اظہار نہ کرتے۔ اپنی بات مثبت انداز میں بیان فرماتے۔ خوش مزاج اور بلند اخلاق عالم تھے۔ کسی کا دل دکھانا اور مخاطب کو ذہنی یا قلبی تکلیف پہنچانا ان کی فطرت میں داخل نہ تھا۔

افسوس ہے تیرھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی ولادت اور وفات کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا۔

۴۴ — مرزا محمد کشمیری

مرزا محمد بن عنایت احمد کشمیری دہلوی، شیعہ عالم تھے۔ اپنے وقت کے شیخ اور فاضل تھے۔ اصلاً کشمیری تھے، ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ دہلی جا بے تھے۔ پھر دہلوی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولد و نشا دہلی سے۔ عالم طفولیت ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ ان کے زمانے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، دہلی کی مسند تدریس پر متمکن تھے، یہ بھی ان کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ علم فقہ کے لیے سید رحم علی دہلوی کی خدمت میں گئے، ان سے فقہ کی تمام کتابیں درساً و رسماً پڑھیں۔ علم طب اس دور کے معروف طبیب حکیم ثریف دہلوی سے حاصل کیا اور کافی عرصے تک ان سے استفادہ کرتے رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور بہت سے علما و طلباء کو مستفید کیا۔

علم کلام اور مجاہدہ و مناظرہ میں نہایت تیز تھے اور اس سلسلے میں سب سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے۔ فن طب میں بھی کامل تھے اور علاج کے لیے دُور دراز سے لوگ ان کی خدمت میں آتے تھے۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے، بہت سی اہم کتابوں کی تلخیص بھی کی۔ ان کی تصنیفات و تلخیصات میں یہ کتابیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ النزهة، اس میں اپنے استاد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کے پانچ ابواب کی تردید کی گئی ہے۔

۲۔ عالی کے رسالہ الوجیزہ کی شرح۔

۳۔ تنبیہ اہل الکمال والانصاف علی احتمال رجال اہل الخلفاء :- اس میں کتب صحاح ستہ کے ان رجال کی نشان دہی کی گئی ہے، جو کذب، وضع،

ضعف، خروج، ناصبیت، اربا اور قدریت سے منہم ہیں۔

۴۔ ایک رسالہ تعصبات اہل سنت کے بارے میں ہے۔

۵۔ سمعانی کی مشہور کتاب "الانساب" کا انتخاب۔

۶۔ علی متقی کی کنز العمال کے اُس حصے کا انتخاب جو ان کے نزدیک امامت حضرت

علی، امامت اولاد علی اور صحابہ کے معاملات پر دلالت کناں ہے۔

۷۔ رویت الہی سے متعلق ایک رسالہ۔

۸۔ حافظ ابن حجر کی فتح الباری شرح صحیح بخاری کی تلخیص۔

۹۔ فسطانی کی ارشاد الساری کی تلخیص۔

۱۰۔ تلخیص الطبع بن الصحیحین، حمیدی۔

۱۱۔ تلخیص جامع الاصول۔

۱۲۔ تلخیص الاستیعاب، ابن عبدالبر۔

۱۳۔ تلخیص حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم۔

۱۴۔ تلخیص مسند امام احمد بن حنبل۔

- ۱۵۔ تلخیص فتاویٰ عالمگیری -
- ۱۶۔ تلخیص تاریخ الرسل والملوک، طبری -
- ۱۷۔ تلخیص الخبیر فی احوال النفس النقیس -
- ۱۸۔ تلخیص شرح المقاصد، تقنازانی -
- ۱۹۔ تلخیص الملل والنحل، شہرستانی -
- ۲۰۔ تلخیص کتاب سیاست و الامتہ، دینوری -
- ۲۱۔ تلخیص شرح المواقف، جرجانی -

اس کے علاوہ متعدد تصنیفات و تلخیصات ان کی علمی خدمت میں شامل ہیں۔ بلاشبہ تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں یہ ممتاز شیعہ عالم و فقیہ تھے اور ان کی علمی خدمات کا دائرہ وسیع تھا۔ تصنیف، تلخیص، تدریس، طبابت، خلافت میں وسعت نظر اور جدل و مناظرہ میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی اور ہر میدان میں اپنی مثال آپ تھے۔

ایک روایت کے مطابق اس نامور شیعہ عالم نے ۱۲۳۵ھ کو اور ایک روایت کے مطابق ۱۲۲۵ھ کو وفات پائی۔^{۱۳}

۲۵۔ مولانا محمد کشمیری

وادی کشمیر میں تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحاب علم اور ارباب فقہ نے پورے برصغیر میں شہرت حاصل کی اور اپنے علم و فضل کا لوہا منوایا، ان میں مولانا محمد بن محمود بن رحمت اللہ منٹھی کشمیری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سید عبدالسلام اندرانی کی اولاد سے تھے اور بعض حلقوں میں محمد اکبر ہادی کے نام سے معروف تھے۔ ۱۱۵۳ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے جد امجد رحمت اللہ کشمیری سے اخذ علم کیا۔

^{۱۳} نزہۃ الخواص، ج ۷، ص ۲۱۹، ۲۲۰، ۲

قرأت و تجوید کے لیے اپنے کسبِ قاری محمد اسحاق کی خدمت میں حاضری دی اور اس موضوع سے متعلق ان سے خوب استفادہ کیا۔ علوم و فنون میں شیخ محمد اشرف کشمیری کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے۔

ان کے آبا و اجداد اور خاندان کے تمام افراد اصحابِ علم و فضل تھے اور سب کا سلسلہ فیض جاری تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے مستند تدریس کو زینت بخشی اور بے شمار لوگوں کو فیض پہنچایا۔ کشمیر میں بہت سے علما و فضلا نے جنم لیا اور ہر ایک نے اپنی بساط اور قابلیت کے مطابق تبلیغ اسلام اور ترویج علم کی۔ صاحبِ ترجمہ مولانا محمد کشمیری نے بھی اس ضمن میں بہترین خدمات انجام دیں اور متعدد حضرات نے ان سے اکتسابِ علم و اخذِ فیض کیا۔

کشمیر کے اس ممتاز عالم و فقیہ نے، ۱۔ ربيع الاول ۱۲۳۳ھ کو وفات پائی۔

۲۶ — مولانا محمد رفیق کشمیری

خطہ کشمیر کے ایک اور عالم و فقیہ مولانا محمد بن مصطفیٰ بن معین الدین رفیق کشمیری تھے جس کی کنیت ابوالرضا تھی۔ ۱۱۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور والدہ کے جد ماجد عبدالملک سیوی اور ماموں علامہ نورالہدیٰ ٹوپی گرسے تحصیل علم کی تفسیر، حدیث اور فقہ میں ماہر کامل تھے۔ علم حدیث اپنے عم بزرگ وار اور والد ماجد سے پڑھا۔ خاندان کے سب لوگ علم و فضل سے بہرہ ور تھے اور معقول و منقول میں عبور رکھتے تھے۔ صاحبِ ترجمہ مولانا محمد رفیق بھی ان اوصاف سے متصف تھے جوئی مشرب فقیہ اور منبع کتاب و سنت تھے۔ ان کے کسب مولانا محمد اشرف بھی عالم دین اور

تصوّت و سلوک کے دلدادہ تھے، چنانچہ انہوں نے انہی سے اخذ تصوّت کیا اور تصوّت کی کتاب عوارف المعارف بھی انہی سے پڑھی۔ تصوّت و طریقت کے موضوع پر چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

ان کا سلسلہ تدریس بھی جاری تھا، جس سے علاقہ کشمیر کے متعدد علما و فضلاء نے استفادہ کیا۔ ان میں بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ جدل و مناظرے سے کنارہ کش رہتے اور نہایت منانت اور سنجیدگی سے علمی خدمات انجام دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے عوام و خواص ان کا بے حد احترام کرتے اور ان کی خدمات گوناگوں کی توصیف کرتے تھے۔

خطہ کشمیر کے اس جید عالم، نامور فقیہ اور ممتاز صوفی نے چہار شنبہ کے روز ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۲۱۸ھ کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کا سفر کیا۔

۴۷۔ سید محمد پھلواروی

ہندوستان کے صوبہ بہار کا شہر پھلواروی کسی سو سال سے علم و فضل اور طریقت و سلوک میں مشہور ہے۔ یہ شہر بے شمار علما کا مسکن، متعدد فقہاء کا مولد اور بہت سے صوفیاء و مشائخ کا مرجع رہا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جن علما و فقہانے جنم لیا ان میں سید محمد بن نعمت اللہ بن مجیب اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے یہ اپنے والد کے پانچویں بیٹے تھے۔ ۱۰ صفر ۱۱۹۸ھ کو پھلواروی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ گھر میں علم کی تہر جاری تھی اور تصوّت کا زور تھا۔

۱۵ حدائق الحنفیہ، ص ۲۶۷، ۲۶۸۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۷۔

نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۱، ۲۲۲۔

یعنی علوم ظاہری اور باطنی دونوں سے خاندان کے تمام افراد بہرہ ور تھے۔ باپ سید نعمت اللہ نے اپنے بیٹے کی خوب تربیت کی اور جید اساتذہ سے ان کے حصولِ علم کا اہتمام کیا۔ اس وقت پھلواڑی میں شیخ احمدی بن وحید الحق جعفری کا منگامہ درس جاری تھا، ان سے انھوں نے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور اپنے والدِ مکرم سے اخذِ طریقت کیا اور عرصہ دراز تک ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔ ان کے والد سید نعمت اللہ اپنے دور کے معروف صوفی اور عالم تھے، ان کا حلقہ فیض بہت وسیع تھا۔ لائق بیٹے نے باپ ہی سے اخذِ فیض کیا اور تمام علوم مروجہ اور تصوف و طریقت میں عالی مرتبے کو پہنچے۔

پھلواڑی کے اس عالم و فتنہ اور صوفی نے ۳۔ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ کو پھلواڑی میں وفات پائی اور اپنے بھائی سید ابوالحیات پھلواڑی کے قریب دفن ہوئے۔

۴۸۔ مفتی محمدی عظیم آبادی

ہندوستان کے شہر پٹنہ کو جو صوبہ بہار کا دارالخلافہ ہے، کسی زمانے میں عظیم آباد کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس شہر سے بڑھنے کی بے شمار علمی، عملی اور سیاسی یادیں وابستہ ہیں۔ گذشتہ صدی میں اس کی خاک سے بہت سی جلیل القدر شخصیتوں نے جنم لیا اور بے انتہا خدمات انجام دیں۔ عمل کے ہر میدان میں انھوں نے اپنے جھنڈے گاڑے اور ہر گوشہ زندگی میں شہرت کے یامِ عروج کو پہنچے۔ انتہی بزرگوں میں ایک بزرگ مفتی محمدی بن معصوم عظیم آبادی تھے، جو تیسری صدی ہجری کے معروف شیخ، بہت بڑے عالم اور ممتاز فقیہ تھے۔ انھوں نے اس دور کے مشہور عالم شیخ احمدی بن وحید الحق جعفری پھلواڑی کے حضور زائے شاگردی تہ کیا، طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور ہر شعبہ علم میں درجہ کمال کو

۱۷۷ تزئین الخواطر ج ۷ ص ۲۲۲، بحوالہ شجرہ شیخ بدرالدین۔

کو پہنچے۔ علوم سے فراغت کے بعد مسندِ افتا پر فائز ہوئے اور یہ خدمتِ حسن و خوبی سے انجام دی۔ اس کے علاوہ درس و انامے کا سلسلہ بھی جاری کیا اور متعدد حضرات نے ان سے علم حاصل کیا۔

مفتی محمدی عظیم آبادی ۲۷۔۔۔ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

۲۹۔۔۔ مولانا محمد آفاق دہلوی

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرمندی کے اصلاف میں تیرھویں صدی ہجری کے بزرگوں میں مولانا محمد آفاق دہلوی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:۔۔۔ محمد آفاق بن احسان اللہ بن محمد اطہر بن محمد تقی بن عبدالاحد فاروقی۔ اپنے زمانے کے شیخ، عارف باللہ، عالم، موافق المشرک فقہ اور طریقہ مجددیہ کے امام تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں ولادت ہوئی اور شیخ ضیاء اللہ کشمیری سے اخذِ طریقت کیا۔ علومِ مروجہ کی تحصیل اس عہد کے جید علما سے کی۔ فقیر منشی اور منبع سنت رسولؐ اٹھے طبیعت میں مسکنت اور شکستگی کا اس قدر غلبہ تھا کہ خود کو دیوار کے نقش و نگار کی مانند سمجھتے اور فرماتے کہ جس طرح دیوار اور اس کے نقش و نگار کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اسی طرح اس دنیا میں انسان کو بھی پائیداری نصیب نہیں۔ وہ بھی ختم ہونے والا ہے۔ علم کے غرور اور تعلی سے بالکل پاک تھے مسائل فقہ پر کامل عبور تھا۔ بہت سے اکابران کے حلقہٴ ارادت میں شامل تھے، جن میں مولانا فضل الرحمن محدث مراد آبادی کا نام نامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اپنے مرشد خواجہ ضیاء اللہ کشمیری کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے اور خلق کثیر کو روحانی اور باطنی فیض پہنچایا۔ علماء و مشائخ اور عوام و خواص کے

کے نزہت الخواص ص ۳۳۳ بحوالہ تاریخ الکلا۔

حلقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔
 ایک زمانے میں افغانستان گئے اور وہاں اس درجے مستحق تکویم قرار پائے
 کہ وہاں کے حکمران زمان شاہ نے ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کی سعادت
 حاصل کی۔ کابل اور دوسرے بلاد و تقصبات کے بہت سے لوگ ان سے بیعت ہوئے۔
 ان صوفی مزاج فقیہ نے بدھ کے روزے۔ محرم ۱۲۵۱ھ کو نماز مغرب
 کے بعد اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی اور جمہرات کو دہلی کے محلہ
 منگل پورہ میں دفن کیے گئے۔ ۹۱ سال کی عمر پائی۔

۵۰۔ شاہ محمد اسحاق دہلوی

دیار ہند کی عظیم المرتبت شخصیتوں میں حضرت مولانا محمد اسحاق دہلوی کا اسم
 گرامی صفحات تاریخ میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ وہ شیخ وقت، امام عصر، عالم اجل
 محدث عالی قدر اور فقیہ نام دار تھے۔ زہد و تقویٰ، اتباع سنت اور ورع و
 عبادت میں بھی یگانہ روزگار تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے
 اور خلیفہ تھے۔ نسباً فاروقی تھے۔ مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:۔ محمد اسحاق بن محمد افضل
 بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن منصور بن احمد بن محمد بن قوام الدین
 فاروقی دہلوی۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کی دو صاحب زادیاں تھیں۔ ایک مولانا عبدالحی
 بڑھانوی کے عقد میں آئیں اور ایک مولانا محمد افضل فاروقی دہلوی کے نکاح
 میں۔ مولانا محمد افضل کی زوجہ محترمہ سے صاحب ترجمہ حضرت مولانا
 شاہ محمد اسحاق ظہور میں آئے جو آگے چل کر علم و عمل اور فضل و کمال میں فریادگار
 قرار پائے۔

۱۸ اشارات الصالحین، ص ۱۱۱۔ تذکرہ اولیائے دہلی، ص ۱۳۵۔ نزہۃ الخواطر، ص ۳۲۳۔

مولانا محمد اسحاق کی ولادت ۸ — ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ اور ایک روایت کے مطابق ۸ — ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ کو دہلی میں ہوئی۔ نشوونما اور تربیت اپنے جلیل القدر نانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی نگرانی میں پائی۔ کتب صرف اور کافیہ تک علم نحو کی کتابیں مولانا عبدالحی بڑھانوی سے پڑھیں۔ باقی درسی کتابوں کی تکمیل شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے حلقہ درس میں کی۔ علم حدیث کے لیے ان دونوں بزرگوں کے علاوہ شاہ عبدالعزیز کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہہ کیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد حدیث کی سندان سے لی۔ شاہ عبدالعزیز کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے اس نواسے پر انتہائی شفقت فرماتے اور اسے بیٹے کی حیثیت دیتے تھے۔ کتابوں، مسودوں اور متاع علمی کی صورت میں جو کچھ بھی ان کے پاس تھا، نواسے کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہی ان کی سند پر بیٹھے اور شاہ نقیب علم حدیث کی کثیر تعداد کو مستفید فرمایا۔ شاہ صاحب نے اپنی زندگی ہی میں ان کو تدریس علم حدیث پر مامور فرما دیا تھا، چنانچہ پورے بیس سال انہوں نے شاہ صاحب کے سامنے اور ان کی نگرانی میں یہ اہم خدمت انجام دی۔ اس محدث جلیل نے ۱۲۴۰ھ میں ارض حجاز کا عزم کیا اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ میں شیخ عمر بن عبدالکریم دمتمنی ۱۲۴۷ھ کا سلسلہ درس حدیث جاری تھا، ان سے ۱۲۴۱ھ میں سند حدیث لی۔

بعد ازاں اپنے وطن ہندوستان کو مراجعت فرمائی اور پہلے کی طرح دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی سند درس حدیث پر رونق افروز ہوئے۔ حج سے واپسی کے بعد پورے سولہ سال یہ عظیم الشان خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا اور حصول علم حدیث سے مشرف ہوئے۔ پھر ۱۲۵۸ھ میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد یعقوب اور دیگر افراد خانہ کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ کے لیے رخت سفر

باندھا اور فریضہ حج ادا کرنے کے بعد مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں مغلوں کا آخری حکمران بہادر شاہ ظفر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ اس کی بادشاہت برائے نام تھی، اصل حکومت انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی۔ بہادر شاہ، اس کے امرا و وزرا، دہلی کے علما اور وہاں کے سرکردہ لوگوں نے ان کو ہجرت کرنے سے روکنے کی کوشش کی اور دہلی میں سکونت پذیر دہننے پر زور دیا، لیکن وہ نہیں مانے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان پر عملاً انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور شاہ عبدالعزیز ایک فتوے کے ذریعے اس ملک کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔ پھر شہداء اسلام میں اضمحلال و ضعف واقع ہو چکا تھا، بدعات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور رسوم کفر نئی نئی شکلوں میں سامنے آرہی تھیں۔ ان حالات میں ان کے لیے اس ملک میں سکونت اختیار کیے رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مع اہل و عیال کے دہلی سے کوچ کیا اور مکہ معظمہ جا کر متوطن ہو گئے۔

مولانا ممدوح علمی اہم اعتبار سے ہندوستان کی آبرو اور فضل و کمال میں اپنی مثال آپ تھے۔ نہایت متبع سنت، انتہائی پرہیزگار، فرشتہ سیرت، بلند اخلاق اور عمدہ کردار تھے۔ قانع بدعت اور داعی سنت نبویؐ تھے۔ زبدۃ المحدثین اور فخر علمائے دین تھے۔ دن رات تدریس حدیث اور عبادت الہی میں مصروف رہتے۔ نیکی اور تہذیب کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز نے ان کو اپنا امام جماعت مقرر کر رکھا تھا اور وہ عین سنت کے مطابق نماز پڑھاتے تھے۔

شاہ صاحب اپنے بلند مرتبت بھتیجے مولانا محمد اسماعیل اور عالی قدر نواسے مولانا شاہ محمد اسحاق سے بدرجہ غایت مشفقانہ برتاؤ کرتے اور انہیں دیکھ کر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرماتے :-

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحٰقَ

(یعنی سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔ (ابراہیم: ۳۹)

شاہ صاحب نواسے کے زہد و عبادت پر انتہائی خوش ہوتے اور عالم سرت
میں فرمایا کرتے: میری تقریر اسماعیل نے اور تحریر رشید الدین نے لے لی اور
تقویٰ اسحاق کے حصے میں آیا۔

دستِ سخا اس قدر وسیع تھا کہ جو کچھ پاس ہوتا، مستحقین اور اہل حوائج میں
تقسیم فرما دیتے۔ ہندوستان میں بھی یہی حال رہا اور سرزمینِ حجاز میں بھی غربا و مساکین اور
بیوہ عورتوں کی امداد فرماتے رہے۔ ہندوستان سے جانے والے حجاج کی ضرورتیں
پوری کرتے اور ان کو اپنے ہاں مہمان ٹھہراتے۔ نہایت منزل علی اللہ تھے۔ دنیا کے
مال و دولت سے کبھی تعلق نہ رکھا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ قابلِ بیان ہے جو ارواح
ثلاثہ میں مرقوم ہے اور وہ یہ ہے :-

تحصیل سکندر آباد میں ایک بہت بڑا گاؤں جن پور تھا۔ کسی زمانے میں یہ گاؤں
مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کی ملکیت تھا۔ یہ دونوں بھائی انتہا درجے کے
سچی اور فرارح حوصلہ تھے اور اسی وجہ سے اکثر تنگ دست رہتے تھے تنگ دستی
کی وجہ سے بعض دفعہ طول و معنوم بھی ہو جاتے تھے۔ واقعہ کے راوی مولانا مظفر حسین
بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ دونوں بھائی نہایت ہشاش بشاش
اور خوش و خرم ہیں۔ سوچا کہ خوشی کی وجہ پوچھوں، لیکن جرأت نہ ہوئی۔ بالآخر
مولانا محمد اسحاق سے پوچھ ہی لیا۔ متعجبانہ لہجے میں فرمایا: تمہیں نہیں معلوم؟ عرض کیا
”نہیں مجھے کچھ علم نہیں“ فرمایا: ”ہمارا گاؤں جن پور ضبط ہو گیا ہے، یہ خوشی اسی کی
ہے۔ جب تک گاؤں ہمارے قبضے میں تھا، اللہ پر پورا توکل نہ تھا، اب صرف اسی
پر توکل اور اسی پر بھروسہ ہے۔“

شانِ عزیمت اور توکلِ الہی کی یہ بہت بڑی مثال ہے۔ اس مادی دور میں

۱۰۰ الحیات بعد المات ص ۳۷

۱۰۱ ارواح ثلاثہ ص ۱۲۳

اس قسم کی مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔

مولانا کوئی مقرر یا خطیب نہ تھے، لیکن کلہر حق کہنے میں انتہائی جری اور پرجوش تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک انگریز پادری آئی آیا جو بہت لسان تھا۔ اُس نے آتے ہی ایک ہنگامہ بپا کر دیا اور دلی کے علما کو مناظرے کی دعوت دی۔ اس دور کے جو علما خاندان شاہ عبدالعزیز اور مولانا شاہ محمد اسحاق کے مخالف تھے، انھوں نے اس پادری سے کہا کہ مولانا محمد اسحاق کو مناظرے کی دعوت دی جائے۔ مولانا نہ تو مناظرانہ اسٹیج پیج جانتے تھے، نہ انھیں بحث و مجاہدے کی عادت تھی، نہ زیادہ باتیں کرتے تھے اور پھر زبان میں کچھ لکنت بھی تھی، اس لیے ان کے مخالف علما کا خیال تھا کہ یہ چرب زبان اور لسان پادری ان کو ضرورت دے گا اور اس طرح ان کی سبکی ہوگی۔

پادری نے ان کو دعوت مناظرہ دی تو انھوں نے فوراً قبول فرمائی۔ مولانا فرید الدین مراد آبادی، مولانا محمد یعقوب اور قیوم رشید الدین خاں نے ان کو مشورہ دیا کہ خود مناظرہ نہ کریں، ہم میں سے کسی کو اپنا نمائندہ یا وکیل مقرر کر لیں جو ان کی طرف سے مناظرہ کرے۔ فرمایا: پادری نے مجھے دعوت مناظرہ دی ہے، لہذا میں ہی مناظرہ کروں گا، کسی کو وکیل یا نمائندہ بنانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد مناظرے کی تاریخ اور وقت مقرر ہو گیا اور دلی کے لال قلعے میں مناظرہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وقت مقررہ پر بے شمار لوگ قلعے میں پہنچ گئے اور مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ پادری صاحب سامنے آئے تو اس بااختہ ہو کر کانپنے لگے۔ اسلام یا مولانا کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکے۔ کچھ دیر یہی صورت حال رہی اور پادری صاحب نے کوئی بات نہ کی تو مولانا نے پادری سے فرمایا: ”آپ کچھ فرمائیں گے یا میں عرض کروں؟“ اُس نے کہا ”آپ ہی فرمائیے“ مولانا نے اسلام کی حقانیت پر دلائل دیے اور عیسائیت کی تردید فرمائی۔ مولانا کی تقریر ختم ہو گئی، لیکن پادری خاموش رہا۔ نہ اس نے عیسائیت کا دفاع کیا

نہ اسلام کی مخالفت کی اور نہ مولانا کے دلائل کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نکالا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قوتِ گویائی چھین لی ہے۔ اس کے سکوت سے ان لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی جو مولانا کے خلاف تھے اور ان کو شکست دلانے کے خواہاں تھے۔

تقریر ختم کر کے مولانا نے مخالفت اور موافق حاضرین کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے ابا قاعدہ بائبل پڑھی ہے۔ اگر پادری میدانِ مناظرہ میں اتر آتا اور سلسلہ کلام آگے بڑھتا تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلے میں ضروری میری مدد فرماتا۔ یہ بھی فرمایا کہ ”اگر پادری کے مقابلے میں اسحاق کو شکست ہو جاتی تو کوئی افسوسناک بات نہ تھی، مجھ کو علم کا دعویٰ ہی کب سے، لیکن اسلام تو سب کا ہے۔ میرا بھی اور میرے مخالفوں کا بھی۔ اگر اس موقع پر شکست کھا جاتا تو یہ تنہا میری شکست نہ ہوتی بلکہ اسے جہلی کے تمام مسلمانوں کی شکست سمجھا جاتا۔ فرمایا ”اللہ تعالیٰ اپنے دین کی ضرورت فرماتا ہے۔ آج بھی اس نے پادری کے مقابلے میں اسلام کی مدد فرمائی۔ پادری کا خاموش رہنا، اسلام کی مدد ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔“

مولانا محمد اسحاق کے تلامذہ کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ دہلی میں بھی ان سے بے شمار حضرات نے استفادہ کیا۔ اس زمانے میں ہندوستان اور عرب و عجم کے بہت سے علما و طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیلِ علم حدیث کی۔ قیامِ حجاز کے دور میں بھی ان کا دائرہ تدریس وسعت پذیر تھا۔ اس میں افریقہ، مصر، عرب، ترکی، ہندوستان اور افغانستان کے علاقوں کے تشنگانِ علم بھی شامل ہوئے اور ان سے فیض حاصل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ بہر حال علم کا یہ دریا دہلی سے جاری ہوا، اور بحرِ ہند میں جاگرا، پھر اس کی موجیں بحرِ عرب سے

ہم آغوش ہو کر مکہ معظمہ تک پہنچیں اور چار سال تک صحرائے عرب کو سیراب کرتی رہیں۔
ہند اور عرب کے جو تہذیب اس سے سیراب ہوئے، ان کی وسیع فرست میں
مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا محمد یعقوب، مولانا محمد عمر بن محمد امین شہید دہلوی، شیخ محمد انصاری، مولانا کرامت علی
اسرائیلی، مولانا عبدالحق دہلوی، مولانا صفت اللہ پانی پتی، مولانا سید نذیر حسین
دہلوی، مولانا محمد تھانوی، مولانا عبد الغنی مجددی دہلوی، مولانا محمد ابراہیم گڑھسوی،
مولانا علی احمد ٹونکی، نواب قطب الدین خاں دہلوی، شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی،
مولانا عالم علی مراد آبادی، مفتی عنایت احمد، مولانا محمد عازمی عربی، مولانا سبحان بخش
شکار پوری، مولانا عبد اللہ سندھی، مولانا مفتی عبد القیوم بھوپالی، مولانا قادری
کرم اللہ دہلوی، حافظ محمد فاضل سورتی، مولانا احمد علی سہارن پوری، قاری
عبدالرحمن پانی پتی، مولانا نور الحسن کاندھلوی، حافظ محمد جون پوری دہلوی، مولانا
رستم علی خاں دہلوی، مولانا بہاء الدین دکھنی۔

یہ چند بزرگوں کے اسمائے گرامی ہیں، سب کا شمار مدائن مکان سے باہر ہے۔
ان کے تلامذہ نے بھی آگے چل کر اصحاب علم کو خوب مستفید فرمایا اور جگہ جگہ
درس و تدریس کے حلقے قائم کیے۔ ان میں دو بزرگ وہ ہیں جو مولانا کے صحیح
جانشین ہوئے اور جن کے چہترہ فیض سے لاتعداد حضرات نے اپنی علمی پیاس بجھائی، وہ ہیں
مولانا عبد الغنی مجددی دہلوی اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی۔ مولانا عبد الغنی
تو دہلی سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے، لیکن سید نذیر حسین نے دہلی ہی کو اپنا
سکن قرار دیا۔ کھارہ سید صاحب مدوح نے اس فوتے پر بھی دستخط کیے، جس
میں ۱۸۵ء کی جنگ کو انگریزوں کے خلاف جہاد قرار دیا گیا تھا، پھر اس کے
نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کا حلقہ درس حدیث نہایت
وسیع تھا اور ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد حد شمار سے باہر ہے۔ عرب و
عجم اور ہندوستان کے لاتعداد اہل علم نے ان سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔

اسی طرح مولانا عبدالغنی مجددی دہلوی کے تلامذہ کی تعداد کا تعین کرنا بھی ممکن نہیں۔
 مولانا محمد اسحاق دہلوی کے یوں تو تمام شاگرد اپنی اپنی جگہ ایک خاص مقام و مرتبہ
 رکھتے ہیں، لیکن ان دونوں — مولانا عبدالغنی مجددی اور سید نذیر حسین دہلوی —
 نے جو خدمات انجام دیں، اس میں کوئی ان کا حریت نہیں۔ ان کو اللہ نے اس
 درجے شرف عطا فرمایا کہ برصغیر کے تمام اہل علم کا سلسلہ سند ان کی وساطت
 سے مولانا محمد اسحاق اور پھر شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
 تک منتهی ہوتا ہے۔

مولانا محمد اسحاق دہلوی کی جلالتِ علم اور حدیث و فقہ میں ان کی وقت نظر
 کا یہ عالم تھا کہ ان کے استاد شیخ عمر بن عبدالکریم کی فرمایا کرتے تھے۔
 قد حلت نبيہ بركة جده الشيخ عبد العزيز الدهلوي^{۵۳}

(ان میں ان کے تانا شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی کی برکتِ علمی حلوں کر گئی ہے)

مکہ مکرمہ کے اُس دور کے ممتاز عالم شیخ عبداللہ سراج کی (متوفی ۱۲۶۲ھ)
 نے ان کو غسل دیا۔ وہ غسل دیتے ہوئے فرماتے تھے :-

واللہ انہ لوعاش وقرأت علیہ الحدیث طول عمری ما نلت ما نالہ۔^{۵۴}

راجد اگر یہ زندہ رہتے اور میں تمام عمر ان سے حدیث پڑھنے میں صرف کر دیتا تو

اس مرتبے کو نہ پہنچ سکتا جس کو یہ پہنچ چکے ہیں۔

ان کی پوری زندگی علم و حدیث کی تدریس میں گزری۔ لکھنے کا موقع بہت کم

ملا۔ انھوں نے مختلف سوالوں کے جواب میں فقہی نوعمیت کے جو فتوے تحریر کیے،

ان کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کا تیار چل سکا ہے۔

۱۔ حاشیہ مسائل۔

۵۳ الحیات بعد المات ص ۲۶

۵۴ ایضاً

۲۔ مسائل اربعین -

۳۔ تذکرۃ الصوم -

مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی نے ستر برس کی عمر پاکر ماہِ رجب ۱۲۶۲ھ کو مکہ مکرمہ میں انتقال کیا اور حنت المعلىٰ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر کے قریب دفن کیے گئے۔

۵۱۔ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی

مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی علامہ دہر، عالم کبیر، فقیہ ذمی مرتبت اور محدثِ دوراں تھے۔ شاہ عبد الغنی کے فرزند، شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے بھتیجے، شاہ ولی اللہ محدث کے پوتے اور شاہ عبد الرحیم کے پرپوتے تھے۔ بڑھنیر پاک و ہند کی اس وسیع و عریض سرزمین میں علم و فضل و عطر و ارشاد، تصنیف و تالیف، درس و تدریس، ایسے اسلام، تجدیدِ دین، اصلاحِ اُمت اور جہادِ نبوی سبیل اللہ کے جو بلند ترین اوصاف اس عالی قدر قائدانہ کے لائق احترام ارکان میں پائے جاتے ہیں، اس میں کوئی ان کا مقابل نہیں۔ مولانا شاہ محمد اسماعیل نے اپنے اسلاف کے ان اوصاف اور بزرگوں کی اس میراث کی نہ صرف جفاظت کا فریضہ انجام دیا بلکہ اپنے بے پناہ عمل و سعی سے ان کے حُسن و زیبائی میں انتہائی اضافہ بھی کیا۔

۲۵۰ آثار الصنادید ص ۲۷۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۷۸، ۱۔
 ۲۵۱۔ حقائق الحنفیہ ص ۲۷۲۔ واقعات
 ۲۵۲۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ۲۸۰ تا ۲۸۳ د
 ۲۵۳۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۔ الجداول ج ۲ ص ۲۳۰
 ۲۵۴۔ تذکرہ اربابِ ثناء اور الحیات بعد المات۔

مولانا شاہ محمد اسماعیل کی ولادت صحیح اور مستند روایت کے مطابق
۱۲۔ ربیع الاول ۱۱۹۳ھ (۲۶۔ اپریل ۱۷۷۹ء) کو دہلی میں ہوئی۔ والدہ ماجدہ
کا نام نامی بی بی فاطمہ تھا، اپنے مرشد امیر المجاہدین سید احمد شہید
بریلوی سے تقریباً سات سال بڑے تھے۔

تعلیم و تربیت

شاہ اسماعیل نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آٹھ سال کی عمر

میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ۱۶۔ رجب ۱۲۰۳ھ (۱۲۔ اپریل ۱۷۸۹ء) کو ان

کے والد شاہ عبدالغنی کا انتقال ہوا، اس وقت بیٹے کی عمر صرف دس برس کی

تھی۔ تینوں اعمام کرام (شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر) تیم تھے کہ

آغوش محبت میں لینے اور اپنے گھر لے جانے کے لیے تیار تھے۔ لیکن رسمی طور پر یہ

ذمے داری شاہ عبدالقادر نے لے لی، جن کی اپنی اولاد صرف ایک لڑکی تھی۔

شاہ اسماعیل نے درسی کتابیں اپنی سے پڑھیں اور تمام مروجہ علوم میں وہ درجہ حاصل

کر لیا جو ان کے عہد میں تعلیم و تدریس کا آخری درجہ سمجھا جاتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز

سے حدیث کی سند لی اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں حصول علم سے فارغ ہو گئے۔

سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان کا ذکر نہایت عقیدت و احترام

سے کیا ہے۔ وہ ان کی بے پناہ ذہانت و فطانت اور قابلیت کا ذکر کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ تعلیم کے عہد آغاز میں استغنا کا یہ عالم تھا کہ اس بات کا کوئی خیال

نہ رہتا تھا کہ سبق کہاں ختم کیا تھا اور اب کہاں سے شروع ہوگا کیسی ایسا ہوتا کہ

اصل مقام سے بعد کی عبارت پڑھنا شروع کر دیتے، شاہ عبدالقادر ٹوکتے تو

جواب دیتے کہ پچھلی عبارت کا مطلب آسان تھا، اس لیے پڑھنے کی ضرورت

نہ تھی۔ شاہ عبدالقادر اس متروکہ حصے سے کچھ پوچھتے تو جواب میں ایسی تقریر فرماتے،

کہ سب لوگ حیران رہ جاتے کیسی اصل مقام سے پیشتر سبق کا آغاز کر دیتے،

شاہ عبدالقادر متنبہ فرماتے تو اسماعیل ایسے شبہات وارد کرتے کہ ناضل استاد کو

بھی جواب میں خاص توجہ مبذول کرنا پڑتی ۔

دلی کے تمام علمی حلقوں میں ان کی غیر معمولی ذکاوت اور انتہا درجے کی ذہانت کی شہرت تھی ۔ فارغ التحصیل ہوتے تو لوگ امتحان کے طور پر برسرِ راہ روک کر مشکل سوالات شروع کر دیتے ۔ سوال کرنے والوں کا یہ خیال ہوتا کہ کتاب ان کے پاس نہیں ہے ، لہذا اطمینان بخش جواب نہ دے سکیں گے ۔ لیکن شاہ شہید بے توقف جواب میں تقریر شروع کر دیتے اور سُننے کی ایسی تشریح فرماتے کہ پوچھنے والے حیران ہو جاتے بلکہ اکثر اوقات اپنی جراتِ سوال پر ندامت محسوس کرتے ۲۶

بلاشبہ وہ منبخر عالم اور انتہائی ذکی و ذہین تھے ۔ تیس ہزار حدیثیں انھیں زمانی یاد تھیں ۲۷

سید احمد شہید کی بیعت

حصولِ علم سے فراغت کے بعد شاہ اسماعیل شہید کی فصیلتِ علمی، ذہانت و ذکاوت اور قابلیت کی شہرت ہر حلقے میں پہنچ گئی تھی ، لیکن ابھی کوئی مستقل کام شروع نہیں کیا تھا اور طبیعت میں کچھ بے پروائی سی پائی جاتی تھی ۔ یہاں تو اس کی یہ وجہ ہوگی کہ خاندان میں جو مشاغل رواج پذیر تھے ، ان کے نزدیک وہ اصل مقاصد تک پہنچنے کے لیے کافی نہ تھے اور وہ کوئی نیا قدم اٹھانا چاہتے تھے ، یا پھر وہ اپنے دل میں ایک لائحہ عمل مرتب کر چکے تھے اور اس کا آغاز کرنے کے لیے رفقا و معاونین کی تلاش میں تھے ۔ کئی سال اسی حالت میں گزر گئے ۔ اس اثنا میں اگرچہ انھوں نے اپنے اسلاف کے طریق کار کے مطابق تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور کئی اہم شخصیتوں نے ان سے علم حاصل کیا ، لیکن یہ کام ان کے کامل اطمینان قلب کا باعث نہ تھا ۔

۲۶ آثار العنادید ص ۲۵۱ ، ۲۵۲

۲۷ مقدمہ بر تقریر الامان راز غلام رسول مہر، ص ۹

ایک عرصے تک یہی حالت رہی، تا آنکہ ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) میں امیر المجاہدین
 سید احمد بریلوی نواب امیر خاں والی ٹونک کی رفاقت و ملازمت ترک کر کے راجپوتانہ
 سے دہلی پہنچے اور اکبر آبادی مسجد میں اقامت گزریں ہوئے۔ وہ بدست ہی متقی اور
 پرمہیزگار بزرگ تھے۔ بوں نبی انھوں نے دہلی میں قدم رکھا، لوگوں نے ان کے
 ملفقہ بیعت میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ پہلے مولانا محمد یوسف پھلتی، پھر
 شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحی برہانوی اور بعد ازاں شاہ اسماعیل
 نے ان سے بیعت کی۔ اس وقت سے ان کی زندگی کا دھارا بالکل بدل گیا اور ان
 کے شب و روز پہلے سے کہیں زیادہ لوگوں کی دعوت و ارشاد میں بسر ہونے
 لگے۔ یہ شنبہ اور جمعہ کو بالالتزام شاہی مسجد میں وعظ فرماتے۔ سرسید
 رقم طراز ہیں کہ نماز جمعہ کے لیے لوگ اس کثرت سے آتے تھے جیسے عیدین کی نمازوں
 میں آتے تھے۔ سامعین کا شمار نہ ہوتا تھا، وعظ کا طریقہ ایسا تھا کہ جو کچھ فرماتے
 دلوں میں پیوست ہر جانا، اگر کسی بات پر کوئی خلش پیدا بھی ہوتی تو آگے چل
 کر بالکل رفع ہو جاتی۔ احیائے سنت اور ردِ شرک و بدعت ان کے وعظوں کا
 خاص موضوع ہوتا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے احیائے دین کا سلسلہ پوری سرگرمی سے
 شروع کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کی تجدیدی تہنگ و تاز کا ذکر کرتے ہوئے
 تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام بلاشبہ ہر رنگ میں جامع اور
 کامل ہے۔

”بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تاز دینِ علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب
 استعداد تک محدود رہا، اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع
 کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیق الہی نے یہ معاملہ صرف

علامہ و محدث و شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا، خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔

می خواست رست خیز عالم بر آورد
 آن باغیاں کہ تربیت این نہال کرد
 اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہی کے چھینڈے کے نیچے نظر آتے۔
 حضرت پیر انصاری کا قول یاد ہے ”من مرید خرقانی ام، لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود“
 باوجود پریش مریدی من می کرد“ شاہ صاحب نے مزاجِ وقت کے عدم تحمل و استعداد
 سے مجبور ہو کر بحکم

بر من نیکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں
 سر بلو بختاوند در نرد بستند

دعوت و اصلاحِ امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹک کے حجروں میں
 دفن کر دیے گئے تھے، اب اس سلطانِ وقت اور سکندر عزم کی بدولت شاہ جہان آباد کے
 بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ بچ گیا اور ہندوستان کے کناروں
 سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرے اور افسانے پھیل گئے۔ جن بانوں کے کہنے
 کی بڑے بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب برسرِ بازار کی جا رہی اور
 ہو رہی تھیں اور خونِ شہادت کے چھینٹے صرف و حکایت کے نقوش و سواد کو صفحہ عالم
 پر ثبت کر رہے تھے۔

آخر تو لائیں گے کوئی آفت نغاں سے ہم
 حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور
 حق کا درور کھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے؟ خود ہی اس خاندانِ
 علی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذہ علم و عمل موجود تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و
 تدریس کی پادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر راؤ

شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے دوسرے کاموں میں الجھ کر رہ گئے، یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہلو تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر حیرت آیا۔ دنیا اس کے لیے خلعتِ عظمت اور شرفِ قبول کا ندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سالوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ اُمیدواروں پر اُمید داری کے بعد دیگرے گزرتے رہے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔ یعنی مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کے سوا اس دور میں کوئی دوسرا راہِ جہاد اور جاوہ شہادت کی طرف قدم نہ بڑھا سکا۔

سفر حج

شوال ۱۲۳۶ھ (جولائی ۱۸۲۱ء) میں امیر المجاہدین سید احمد بریلوی نے حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ اس زمانے میں سمندر کے سفر میں خطرہ ہلاکت کی وجہ سے بعض علمائے فرضیت حج کے سقوط کا فتویٰ جاری کر دیا تھا، بلکہ کچھ ایسے اصحابِ علم بھی تھے جو یہاں تک فرمانے لگے تھے کہ :- ولا تلقوا یا ایدیکم الی التھلکة کی رو سے عازم حج ہونا (معاذ اللہ) معصیت ہے۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا، جس کی روک تھام کی ایک صورت تو یہ تھی کہ تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی تردید کی جائے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید بریلوی، مولانا محمد اسماعیل دہلوی، مولانا عبدالحی بڑھانوی اور دیگر علمائے حق نے نہایت حسن و خوبی سے یہ فریضہ انجام دیا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ایک عملی اقدام کیا جائے اور پورے ملک میں ادا تے حج کے لیے لوگوں کو تیار کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد اسماعیل، مولانا

عبداللہؑ، سید احمد بریلوی اور ان کے رفقاء نے نام دار نے اس کے لیے ایک زوردار مہم شروع کی اور ساڑھے سات سو مسلمانوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ کا قصد کیا۔ اس قافلے میں مولانا محمد اسماعیل کی والدہ مکرمہ اور ہمیشہ محترمہ بھی شامل تھیں۔ دس جہاز کرائے پر لی گئے اور ہر جہاز کی جماعت کے لیے ایک امیر مقرر کیا گیا۔ ایک جہاز کی جماعت کے امیر خود مولانا اسماعیل تھے۔ یہ قافلہ کلکتے سے روانہ ہوا، اور فریضہ حج ادا کرنے کے بعد شعبان ۱۲۳۹ھ (اپریل ۱۸۲۲ء) کو ہندوستان واپس لوٹا۔

دعوتِ جہاد

حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد مولانا شہید نے اپنے مرشد سید احمد شہید کے تیار کردہ منصوبے کے مطابق اپنے آپ کو دعوتِ جہاد کے لیے وقف کر دیا اور وعظ و تبلیغ میں لوگوں کو جہاد کے لیے کمر بستہ ہونے کی تلقین فرمانے لگے۔ اس ضمن میں سر سید لکھتے ہیں :-

بموجب ارشاد سید اصفیاء یعنی پیر طریقی بدیٰ اس طرح سے تقریر و وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائلِ جہاد فی سبیل اللہ بشیر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ کی صیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینہ باطن مصفا و مجلا ہو گیا اور وہ اس طرح سے راہِ حق میں سرگرم ہوئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا، سر اس کا راہِ حق میں نذا اور جان اس کی اعلاء لواءِ دین محمدیؐ میں صرف ہوئے۔

مطلب یہ کہ ان کی تقریر کا موضوع اور وعظ کا مقصد فقط یہ ہونا کہ مسلمان اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے میدانِ عمل میں نکل آئیں اور جو غیر ملکی طاقت ان پر مسلط ہو گئی ہے، اس کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ اس سلسلے میں انہوں نے پورے ملک کا دورہ کیا اور ہر جگہ مختلف پیرائے سے یہ بات بیان فرمائی۔

ہجرت

تقریباً پونے دو سال انھوں نے لوگوں کو دعوتِ جہاد دی اور ملک کے تمام اہم مقامات پر اپنا نقطہ نظر شریعت کی روشنی میں وضاحت سے بیان کیا۔ جب مختلف شہروں اور قصبوں میں مجاہدین کی جماعتیں قائم ہو گئیں تو کامل سوچ بچار کے بعد سرحد کے علاقے سے آغازِ جہاد کا فیصلہ کیا گیا، کیونکہ اس زمانے میں پنجاب کی سبھی حکومت مسلمانوں پر لے پناہ منظم ڈھا رہی تھی۔

اس بنیادی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے سرحد کے آزاد علاقے میں قیام کرنے کا عزم فرمایا۔ چنانچہ وہ ۱۲۴۱ھ (۱۷۱۷ء - جنوری ۱۸۲۶ء) کو سید احمد بریلوی کی معیت میں جہاد کی غرض سے مہاجر ہو کر علاقہ سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت صرف چھ سو کے قریب آدمی ان کے ہمراہ تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مرکز میں پہنچ کر حالات کا پورا جائزہ لیا جائے گا اور پھر مناسب موقع پر مجاہدین کی باقی جماعتوں کو بھی ہندوستان کے مختلف مقامات سے بلا لیا جائے گا۔ اس سلسلے کے تمام تنظیمی اور تبلیغی معاملات مولانا محمد اسماعیل مدوح کے سپرد تھے۔

مجاہدین و مہاجرین کا یہ قافلہ جو کم و بیش چھ سو افراد پر مشتمل تھا، رائے بریلی سے روانہ ہوا، اور بندھیل کھنڈ، گوالیار، ٹونک، اجمیر، صحرائے ماڑواڑ، عمرکوٹ، حیدرآباد سندھ، شکارپور، کوٹھ، قندھار، غزنی اور کابل ہوتا ہوا پشاور پہنچا۔ یہ تقریباً تین ہزار میل کا سفر تھا، جس میں تپتے ہوئے صحرا بھی تھے، جہاں میوں تک پانی کا ایک قطرہ نہ ملتا تھا۔ بڑے بڑے دریا بھی تھے، دشوار گزار پہاڑ اور برفستان بھی تھے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے دس مہینوں میں یہ مسافت طے کی۔

جہاد فی سبیل اللہ

اس کاروانِ حق نے ۲۰۔ جہادِ اولیٰ ۱۲۴۲ھ (۲۰۔ دسمبر ۱۸۲۶ء) کو جہادِ بالسیف کی طرح ڈالی۔ آغازِ جہاد میں جو خدمات مولانا محمد اسماعیل نے انجام دیں، ان کی نہایت مختصر کیفیت مندرجہ ذیل ہے :-

۱۔ باشندگانِ سرحد نے سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر امارتِ جہاد کی بیعت اپنی کی سعی و کوشش سے کی۔

۲۔ جہاد سے متعلق سرحد کے علما و اکابر سے جتنی دفعہ بھی گفتگو ہوئی مولانا شہید نے کی اور اس ضمن میں انہوں نے جو علمی، دینی اور سیاسی صلاحیتیں طلب کیں، ان سب کا جواب مولانا نے ہی دیا۔

۳۔ صلح ہزارہ میں تنظیمِ جہاد اپنی کی تنگ و دو سے ہوئی۔

۴۔ جنگِ شکاری میں صرف دس گیارہ مجاہدان کے ساتھ تھے، لیکن انہوں نے اس درجے بہادری اور استقامت کا ثبوت دیا کہ سکھوں کے ایک

بڑے لشکر کو شکست دی۔ اس جنگ میں مولانا کی قبا و دشمن کی گولیوں سے

چھلنی ہو گئی اور ایک انگلی پر گولی کا زخم لگا۔ بعد میں اس زخمی انگلی کی طرف اشارہ کر کے مزا اٹھا کہا کرتے تھے کہ یہ ہماری انگشتِ شہادت ہے۔

۵۔ سرحد میں اپنی کی کوششوں سے اقامتِ شریعت کی بیعت لی گئی اور

وہاں کے باشندے پہلی مرتبہ صحیح شرعی حکومت کی برکتوں سے

فیض یاب ہوئے۔

۶۔ امب، مردان، عشرہ اور مایار کی لڑائیوں میں جو فتوحات حاصل ہوئیں،

وہ اپنی کی جرات و بہادری کا نتیجہ تھا۔

۷۔ پشاور کی فتح کے بعد سلطان محمد خاں بابر زئی سے گفتگو کے لیے سید صاحب

نے اپنی کو نامزد فرمایا تھا۔

مولانا محمد اسماعیل نہایت ذکی، انتہائی ذہین اور بے حد معاملہ فہم تھے۔

نواب محمد صدیق حسن خان فرماتے ہیں :-

جو ہر ذکائے ادب و غایت عالی افتادہ بود..... حکایاتِ ذہانت و فطانت
وے مہوز نقل ہر مجلس و زیب ہر محفل اہل علم است^۳۔
ان کی ذکاوت کا جو بہ نسبت بلند تھا..... ان کی ذہانت و فطانت کی تیزی کے
قصے اب تک اہل علم کی ہر مجلس کے لیے باعثِ زینت سمجھے جاتے ہیں۔

سیرت و کردار

مولانا شہید بہت بڑے عالم، معقول و منقول کے ماہر، فروع و اصول
کے امام اور ہر فن میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ زندگی کا ہر لمحہ اعلیٰ کلمۃ اللہ،
احیائے سنت رسولؐ، جہاد فی سبیل اللہ اور ہدایت خلق اللہ میں گزرا۔ نہایت
جبری اور شجاع تھے۔ وعظ و تقریر میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، واضح اور مدلل
گفتگو کرتے، اللہ کے سوا کسی کا ڈراؤ اور خوف ان کے دل میں نہ تھا۔ خطرناک سے
خطرناک مواقع پر بلا جھجک تنہا جا کھڑے ہوتے۔ دُبلے پتلے اور لاغر اندام تھے، مگر
عزیمت و استقامت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ایک تجربہ کار جرنیل کی طرح
جنگ کی منصوبہ بندی کرتے اور دشمن کے ہر وار کا کامیابی سے دُناع کرتے۔
سادہ مزاج اور سادہ معیشت تھے۔ کھانے پینے اور لباس میں کسی قسم کا کلف
نہ تھا۔ ملنسار، بلند کردار اور سہر و خلعت تھے۔ فی مناظرہ کے ماہر تھے۔ خالص
علمی اور تحقیقی انداز میں گفتگو کرنے اور ہر اعتراض کا مسکت جواب دیتے۔

تصانیف

شاہ اسماعیل جہاں بہت بڑے عالم و مجاہد اور واعظ و مبلغ تھے، وہاں
بہترین مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ رد الاشراک :- (عربی) یہ ان کا ایک رسالہ ہے جو عربی زبان میں ہے۔

^۳ انکشاف النبلا، ص ۳۱۶

اس میں شرک کی باریک سے باریک اقسام بیان کی گئی ہیں اور غیر شرعی رسوم عوائد کی تردید فرمائی گئی ہے۔ ہر جگہ آیات قرآن اور احادیث نبویؐ سے استدلال کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ یہ رسالہ الگ سے شائع ہوا تھا دوسری مرتبہ نواب سید محمد صدیق حسن خاں نے اکادریک لتخريج احادیث رد الاشراک کے نام سے شائع کیا تھا۔ شروع میں نواب صاحب کا رسالہ قطف الشرفی بیان عقیدۃ اہل الاثر ہے۔

۲۔ تقویۃ الایمان (اردو) شاہ اسماعیل دہلوی کی یہ بہت ہی مشہور کتاب ہے اور اردو زبان میں ہے۔ بے شمار مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ ایک مختاط اندازے کے مطابق اس کی مجموعی تعداد اشاعت پچاس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اردو زبان کی کوئی کتاب اتنی زیادہ تعداد میں شائع نہیں ہوئی۔ یہ اس کی مقبولیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ سب سے زیادہ ہدف اعتراض بھی یہی کتاب ہی اور اس کے رد میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ شاہ اسماعیل پر کفر کے فتوے بھی اسی کتاب کی وجہ سے لگائے گئے۔ بعض لوگوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ جس گھر میں یہ کتاب ہو اس میں فرشتے نہیں آتے۔^{۳۲}

تقویۃ الایمان در حقیقت شاہ اسماعیل شہید کی عربی کتاب "رد الاشراک" کے پہلے حصے کا ترجمہ ہے جو خود انہی نے کیا تھا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے جو میر شہامت علی نے کیا تھا۔

تقویۃ الایمان آج سے کم و بیش پونے دو سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس زمانے میں نثری اردو بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی، نہ اس کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے تھے اور نہ کوئی گرامر معرض وجود میں آئی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کے اعتبار سے اپنے دور کا یہ ایک شاہ کار ہے سلاست اور روانی

- درجہ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اُردو کے بعض ادیبوں نے اس کو عمدہ ترین ادبی کتاب قرار دیا ہے۔ اس کی زبان قلعہ معالیٰ کی زبان ہے۔ اس زمانے کے ہندوستان بالخصوص دہلی کی تمام مروجہ رسوم اس میں بیان کی گئی ہیں اور اس عہد کے مسلمانوں کے عقائد و افکار کی وضاحت کی گئی ہے۔ اُردو کی یہ واحد کتاب ہے جس میں دو پونے دو سو سال کی ہندی رسوم و عوائد کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس دور کے دہلی کی تہذیب و ثقافت کے مختلف گوشوں کو معرض تحریر میں لایا گیا ہے۔ اُردو کی خدمت بھی سب سے زیادہ اسی کتاب کی وجہ سے ہوئی کیونکہ اس کی تائید اور ترمیم میں تمام کتابیں اُردو میں کبھی گنیں جو لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئیں اور لوگوں نے دلچسپی سے پڑھیں۔
- ۳۔ تذکیر الاخوان :- (اُردو) یہ شاہ شہید کی عربی تصنیف "رد الاشرار" کے دوسرے حصے کا ترجمہ ہے جو مولانا سلطان محمد خاں نے کیا۔
- ۴۔ منصب امامت :- (فارسی) یہ نہایت بلند پایہ اور انتہائی عمدہ کتاب ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔
- ۵۔ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین :- (عربی) اس میں شاہ صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ احادیث جمع کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنا سنت ہے۔
- ۶۔ صراط مستقیم :- (فارسی) یہ کتاب سید احمد شہید بریلوی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ شاہ اسماعیل شہید نے صرف اس کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا۔ مولانا عبدالحی بڑھانوی اس کی تدوین میں شریک تھے۔ اس کے چار باب ہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔
- ۷۔ العبقات :- (عربی) یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ہے اور بڑی ادق اور مشکل کتاب ہے۔ ان کی دوسری تصانیف کی طرح اس میں تصوف کے علاوہ بعض دیگر موضوعات بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ مولانا مناظر حسن گیلانی مرحوم نے کیا تھا جو حیدرآباد (دکن) سے چھپ چکا ہے ترجمہ بھی بہت مشکل ہے

۸۔ ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح :- (فارسی) شاہ صاحب کی یہ نہایت معرکہ الآراء تصنیف ہے۔ بدعت کیا ہے اور سنت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، اس موضوع میں یہ منفرد کتاب ہے۔ اردو ترجمے کے ساتھ یہ کتاب دو یا تین مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۹۔ رسالہ در علم منطق :- (فارسی) سر سید نے آثار الصنادید میں شاہ صاحب کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے جو علم منطق سے متعلق ہے۔ یہ رسالہ اپنے موضوع میں نہایت عالمانہ ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس علم پر بھی انہیں عبور حاصل تھا اور وہ انتہائی قابلیت اور فراست و فطانت کے مالک تھے۔

۱۰۔ اصول فقہ :- (عربی) مسائل فقہ سے متعلق یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ اس میں ضمناً حدیث متواترہ اور تقلید و اجتہاد کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اپنے موضوع کا یہ ایک بہترین رسالہ ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۵ء میں محبتیانی پریس دہلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ دائرۃ المعارف لاہور نے بھی اسے شائع کیا۔

۱۱۔ یک روزی :- (فارسی) یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اور اس میں تقویۃ الایمان پر مولانا فضل حق خیر آبادی کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ ایک دن شاہ اسماعیل ناز کے لیے مسجد کو جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص نے ان کو مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک رسالہ دیا، جس میں تقویۃ الایمان پر اعتراضات کیے گئے تھے اور مسئلہ امکانِ نظر سے متعلق شاہ صاحب کے نقطہ نظر کی تردید کی گئی تھی۔ شاہ صاحب ناز کے بعد مسجد میں بیٹھ گئے اور ایک ہی نشست میں اس کا جواب لکھ دیا۔ اسی لیے یہ رسالہ "یک روزی" کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ رسالہ کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔ اگرچہ مختصر ہے، تاہم بہت جامع اور مدلل ہے۔ اب تک اس کا کوئی شخص جواب

نہیں دے سکا۔

۱۲۔ حقیقت تصوف :- (فارسی) یہ کتاب اب نایاب ہے۔ اس کا ذکر "الحیات بعد الممات" میں کیا گیا ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے تصوف اور اس کی حقیقت بیان کی ہے اور سچے اور صحیح صوفی کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ تصوف کے نام پر جو غلط باتیں کی جاتی ہیں، ان کی مذمت کی ہے۔ اس کتاب سے طبقہ صوفیاء کی اصلاح ہوتی ہے۔

۱۳۔ اکلربعین فی احوال الہدیٰ میں :- شاہ شہید کی یہ وہ کتاب ہے، جس کا ذکر ان کے کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔ صرف "حیات اسماعیل شہید" میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ منقول ہے کہ یہ کتاب صرف ایک مرتبہ ۱۲۶۸ھ میں مصری گنج کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اب نایاب ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ اس کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، امام ہدیٰ کا نزول ہے اور اس میں مصنف شہیر نے وہ احادیث جمع کر دی ہیں، جن سے امام ہدیٰ کے نزول کا ثبوت ملتا ہے۔ کتاب کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور بہن السطور میں اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ آخر میں شاہ نعمت اللہ ولی کا فارسی قصیدہ ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قصیدہ کس شخص نے کتاب کے آخر میں درج کیا ہے۔

مکتوبات

شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ زندگی کے ہر قدم پر انتہائی سرگرم اور فعال رہے۔ مخالفین اسلام کے ساتھ جہاں ان کی مجاہدانہ تگ و تاز تاریخ کا ایک بہت بڑا باب ہے اور ان کی تصنیفی جدوجہد خاص اہمیت کی حامل ہے، وہاں ان کے مکتوبات

۳۳۳ الحیات بعد الممات ص ۱۹۹-

۳۳۴ حیات اسماعیل شہید ص ۱۹۲

کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے دوستوں، مخالفوں، معاصروں، مختلف علاقوں کے سرداروں اور اہل علم کو بہت سے مکتوبات تحریر کیے۔ فقہی اور علمی مسائل دریافت کرنے والوں کے نام بھی انھوں نے خطوط لکھے، پھر اپنے مرشد امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی کی خدمت میں بھی مکتوبات ارسال کیے۔ ان مکتوبات سے اس زمانے کے معاشرتی، دینی اور سیاسی کو الٹ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور بتا چلتا ہے کہ مجاہدین کن حالات سے دوچار تھے اور خدمتِ اسلام کا جذبہ ان کے اندر کس طرح کُٹ کُٹ کر بھرا ہوا تھا پھر صوبہ سرحد کے عوام و خواص کا ان کے بارے میں کیا نقطہ نظر تھا۔ شاہ شہید کے مکتوبات سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ان کے علم و فکر کے حدود کس درجہ وسیع تھے اور ان کی سیاسی بصیرت کتنی گہری تھی۔

شعر و شاعری

شاہ اسماعیل شہید جہاں بہت بڑے مصنف اور نثر نگار تھے وہاں ممتاز شاعر بھی تھے۔ نثر کے ساتھ ساتھ ان کی منظومات کو بھی اہل فن کے نزدیک ایک مقام حاصل ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو زبانوں میں طبع آزمائی کی اور اس میں کامیاب رہے۔ ان کے کلام کے حصّہ فارسی میں (۱) مثنوی سلک نور (۲) قصیدہ در مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (۳) قصیدہ در مدح سید احمد شہید اور حصّہ اردو میں (۱) مثنوی سلک نور (۲) رسالہ بے نمازاں اور (۳) نسخہ قوت ایمان شامل ہے۔ جس طرح ان کی نثر زور دار اور مؤثر ہے، اسی طرح ان کی فارسی اور اردو منظومات کا پایہ بھی بڑا اونچا ہے۔

شہادت

اس عالم نبیل، فاضل بے بدل، ماہر علوم معقول و منقول، مجاہدِ اعظم، مسلح وقت، مجددِ دوراں، بہادرِ جرنیل اور عظیم مصنف و شاعر نے اپنے متعدد رفقاء عالی قدر کے ساتھ ۲۴ — ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ — مئی ۱۸۳۱) کو

بالاکوٹ کے میدان میں کفار سے جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۳ سال تھی۔

بنا کر وند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

شاہ محمد عماد

جیسا کہ ابتدا میں بتایا گیا، شاہ محمد اسماعیل کی تعلیم و تربیت کی منزلیں ان کے چچا شاہ عبدالقادر کی آغوشِ محبت میں طے ہوئی تھیں شاہ عبدالقادر کی ایک ہی صاحبزادی تھیں جن کی شادی ان کے بھتیجے مولانا مصطفیٰ سے ہوئی تھی۔ ان کی بھی ایک ہی بیٹی تھیں، جو شاہ محمد اسماعیل کے عقد میں آئیں۔ شاہ اسماعیل کے ہاں بھی ایک ہی لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام محمد عمر رکھا گیا۔

شاہ محمد عمر مزاجاً و طبعاً دینا اور اہل دنیا سے اسی طرح بے نیاز اور مستغنی تھے، جس طرح ان کے جدِ امجد شاہ عبدالغنی تھے۔ تمام عمر گوشہ نشین اور لوگوں سے الگ تھلک رہے۔ اپنے فاندانی مدرسے میں تعلیم پائی۔ اساتذہ میں صرف شاہ محمد اسحاق دہلوی کے اسم گرامی کا پتا چل سکا ہے۔ بہت ہی متقی اور خدا رسیدہ عالم تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزرده کا بیان ہے کہ شاہ محمد عمر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کثرت سے ہوتی تھی۔^{۳۵}

شاہ محمد عمر اپنے دور کے درویش آدمی تھے اور بعض دفعہ ان پر جذب کا غلبہ ہو جاتا تھا۔

امورِ مشتبہ سے پرہیز کرتے اور ممنوعات سے دامن کشاں رہتے۔ کسی ایسی جگہ نہ جاتے جہاں کسی شکل میں بھی بُرائی کا ارتکاب ہوتا ہو۔ اس سلسلے میں نواب مصطفیٰ خاں کا بیان ہے کہ ہم چند احباب جن میں مرزا غالب بھی تھے،

اپنے بالاخانے میں بیٹھے ہوئے تھے اور بلا مزامیر کے گانا ہو رہا تھا۔ اتفاق سے مومن خاں مومن کہیں سے شاہ محمد عمر صاحب کو پکڑ کر وہاں لے آئے۔ وہ برابر یہ کہتے جلتے تھے کہ ”مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو“ مگر مومن خاں نہیں مانتے تھے۔ آخر ان کو لاکر اس مجلس میں بٹھا دیا۔ گانا برابر ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر میں شاہ محمد عمر صاحب نے جسم کو ایک بہت ہی معمولی سی حرکت دی، اس کے اثر سے سارا مکان ہل گیا۔ اس پر حاضرین مجلس کچھ پریشان سے ہوئے۔ یہ بھی خیال ہوا کہ شاید شاہ صاحب کی جنبش کا اثر ہو۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ ممکن ہے زلزلے کا جھٹکا ہو۔ مگر سب کی توجہ شاہ محمد عمر کی طرف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دوبارہ جسم کو حرکت دی جو پہلی حرکت سے زیادہ تھی۔ اس سے پھر مکان ہلا اور پہلے کی نسبت زور سے ہلا۔ اب سب کو یقین ہو گیا کہ یہ سب شاہ محمد عمر کی حرکت کا اثر ہے۔ تھوڑی دیر بعد ذرا اور زور سے جسم کو حرکت دی تو اس سے مکان کو اور زیادہ حرکت ہوئی، یہاں تک کہ کڑیاں بھی بول گئیں اور طاقتوں وغیرہ میں جوشیغے اور آلات وغیرہ پڑے تھے وہ کھن کھن کر کے گرنے لگے۔ اس پر کسی نے شاہ محمد عمر سے کہا ”یہ کیا ہے؟“ فرمایا ”میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے چھوڑ دو، مجھے مت بٹھاؤ۔“ یہ الفاظ کہے اور اٹھ کر چلے گئے۔^{۳۶}

شاہ محمد عمر نماز نہایت خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے، میاں سید نذیر حسین دہلوی فرماتے ہیں کہ مولوی محمد عمر کے زہد و عبادت کا یہ حال تھا اور نماز اس طرح اطمینان سے پڑھتے تھے کہ رکوع و سجود اس قدر طویل ہوتے کہ اس اثنا میں عام آدمی سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ ستائیس اٹھائیس مرتبہ پڑھ لیتا۔^{۳۷}

استغنا اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ دہلی کے مغل بادشاہ نے اکثر ان سے

^{۳۶} ارواحِ ثلاثہ ۱۷۵

^{۳۷} الحیات بعد الممات (عاشیہ) ص ۲۰۶

ملاقات کی تمنا کی اور ارکانِ دولت کو پیغامِ ملاقات دے کر ان کی خدمت میں بھیجا، مگر آپ نہیں گئے اور ہمیشہ جواب میں یہی کہا کہ جس باپ کی نسبت سے بادشاہ میری ملاقات کے خواہش مند ہیں، ان کی بزرگی مجھ میں نہیں ہے، اور اسی عذر پر کبھی ملاقات نہیں کی گئی۔

شاہ محمد عمر علم و عمل اور تقویٰ و تدبیر میں اپنے دور کی بے نظیر شخصیت تھے۔ ان کے اوصاف و کمالات کی وجہ سے لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ہر صلتے میں ان کو لائقِ تحکیم گردانا جاتا تھا۔ انہوں نے دو منغل بادشاہوں کا زمانہ پایا، اکبر شاہ ثانی کا اور بہادر شاہ ظفر کا۔ ان دونوں باپ بیٹے کے دل میں ان کی انتہائی عزت تھی۔ انہوں نے اپنے امرا کی وساطت سے ان کو بار بار اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی، مگر یہ نہیں گئے اور ہر دعوت کے جواب میں نہایت انحصاری سے کہلا بھیجا کہ نیکی اور پرہیزگاری میں میرا وہ مقام نہیں ہے جو میرے باپ یا میرے دیگر اسلاف کا تھا۔

شاہ محمد عمر نے ۲۲ — جمادی الاخریٰ ۱۲۶۸ھ کو وفات پائی۔ ”مرگ شیخ زمان“ سے ان کی تاریخ وفات نکالی گئی۔ شاہ محمد عمر کی کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ اپنے خاندانِ عالی قدر کے آخری فرد تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی دو دمان ولی اللہی کی صلیبی اولاد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ البتہ روحانی اولاد بے حد و حساب ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کا کوئی ایسا عالم دین نہیں جس کی سدا ان بزرگوں تک نہ پہنچتی ہو اور جس نے کسی نہ کسی صورت میں ان سے استفادہ اور استفاضہ نہ کیا ہو۔ خود صاحبِ ترجمہ مولانا محمد اسماعیل شہید کے علم و فضل، عمل و کردار، تصنیف و تالیف اور افکار و نظریات سے مستفید و متاثر ہونے والوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ لوگ انہیں ملتِ اسلامیہ کا محسنِ عظیم قرار دیتے ہیں اور اپنا رہنما و قائد مانتے

ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

۵۲ — مفتی محمد اصغر انصاری فرنگی محلّی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلّی علم و فضل اور درس و افتاء میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کو اس میدان میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور کسی کو قدرے کم۔ اور نہ خدمات علمی میں مجموعی لحاظ سے کوئی کسی سے پیچھے نہیں۔ ان حضراتِ علما میں ایک بزرگ مفتی محمد اصغر تھے جو مفتی احمد انصاری فرنگی محلّی کے لائق فرزند تھے اور اپنے عہد کے فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبہ کے حامل تھے۔ ان کا مولد و منشا لکھنؤ سے یعنی فرنگی محلّی کے اسی عہدِ علم میں تربیت حاصل کی جہاں ان کے آبا و اجداد نے حاصل کی تھی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور پھر اپنے والد ماجد مفتی احمد فرنگی محلّی سے علومِ مروجہ کی تحصیل کی۔ اس زمانے میں مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلّی کی مسند تدریس آراستہ تھی، محمد اصغر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔

فارع التحصیل ہونے کے بعد اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلے اور درس و تدریس میں انہی کا طریقہ اپنایا۔ اپنے بزرگوں کے مدرسے کو رونق بخشی اور علما و طلباء کی کثیر تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی افتاء کا سلسلہ شروع فرمایا جو خاندان میں ان کے آبا و اجداد سے چلا آ رہا تھا۔ فقہی مسائل میں لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتوے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

مفتی محمد اصغر انصاری نے متعدد درسی کتابوں پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے جو اہل علم میں مقبول ہوئے۔

اس ہندی عالم و فقیہ نے ہفتے کے دن ۱۴ — رجب ۱۲۵۵ھ کو اپنے شہر لکھنؤ میں وفات پائی ۳۹

۳۹ تذکرہ علمائے فرنگی محلّی ص ۳۹ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۰ (باقی حاشیہ لگے صفحہ پر لکھیں)

۵۳ — مفتی محمد افضل پھلواری

صوبہ بہار کے شہر پھلواری کی علمی تاریخ نہایت شان دار ہے۔ کئی صدیوں سے اُسے علماء و فقہاء کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس شہر میں صوفیا و اتقیا نے بھی جنم لیا اور درس و تدریس کے دلدادہ حضرات نے بھی اس میں بے حد خدمات انجام دیں۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس مرکز علم و تصوف میں جس بزرگ نے شہرت پائی ان کا اسم گرامی مفتی محمد افضل تھا۔ فقہائے حنفیہ میں ان کو عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی خدمات بوفلموں کی وجہ سے ان کو گاندوڑگا سمجھا جاتا تھا۔ اپنے دور میں یہ پھلواری کی مسند افتا پر فائز تھے اور اس نواح کے تمام لوگ مسائل فقہیہ کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتوے کو آخری قرار دیا جاتا تھا۔

مفتی محمد افضل پھلواری سلوک و طریقت میں بھی درک رکھتے تھے اور اس میں وہ شیخ مجیب اللہ ہاشمی جعفری کے حلقہ ارادت سے منسک تھے۔ یہ بھی پھلواری کے رہنے والے تھے اور علوم متداولہ کے ماہرین میں سے تھے۔ مفتی محمد افضل پھلواری نے ۱۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

۵۴ — مولانا محمد اکبر کشمیری

وادی کشمیر کی خوش گوار فضاؤں میں تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحاب علم اور ارباب فقہ نے ہوش سنبھالا ان میں مولانا محمد اکبر کشمیری کا ذکر خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ یہ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ کچھ بڑے ہوتے تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) احوال علمائے فرنگی محل ص ۱۶ — نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۲۲۸
۱۷ — نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۲۲۹ بحوالہ تذکرۃ الکملہ۔

علمائے عصر کی خدمت میں حاضری دی اور مروجہ علوم کی تکمیل کی فراغت کے بعد بیٹی کا عزم کیا اور وہاں کے مدرسہ محمدیہ میں جو جامع مسجد میں واقع تھا، درسِ تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ تیس سال یہ خدمت انجام دی اور اس طویل مدت میں بے شمار شاگردانِ علم نے ان سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ بلاشبہ مولانا محمد اکبر کشمیری اکابر علمائے وقت میں سے تھے۔ جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا، ان کی وسیع فرست میں سید عبدالفتاح، سید عماد الدین اور مفتی عبداللطیف کے اسمائے گرامی شامل ہیں جو اپنے عہد اور علاقوں کے جلیل القدر علما میں شمار ہوئے۔ بیٹی، صوبہ گجرات، دکن اور کوکن وغیرہ کے علاقوں میں ان کے شاگرد وسیع تعداد میں موجود تھے۔

مولانا محمد اکبر کشمیری نے ۱۲۷۲ھ کو بمبئی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔

۵۵ — مولانا محمد اکرم شاہ جہان پوری

ہندوستان کے صوبہ یوپی کا شہر شاہ جہان پور بڑا مردم خیز شہر ہے۔ اس شہر کو متعدد اہل فضل کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل ہے۔ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں اس شہر کی زرخیز مٹی سے جو حضرات ابھر کر سامنے آئے ان میں مولانا محمد اکرم اور ان کے والد مولانا محمد جان کے اسمائے گرامی تاریخ نے خصوصیت سے محفوظ کر لیے ہیں۔ باپ بیاد دونوں حنفی المسک بزرگ تھے اور اوراک و عرفان کے اعتبار سے اپنے عہد میں بہت نامور تھے۔

مولانا محمد اکرم کی ولادت شاہ جہان پور میں ہوئی اور وہیں پلے بڑھے۔ ان کے والد مولانا محمد جان جید عالم تھے، محمد اکرم نے ان کے اور بعض دیگر علمائے وقت کے سامنے زائوئے شاگردی شہہ کیا اور تمام علوم میں جو اس عہد میں پڑھائے جاتے تھے، مہارت حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا محمد اکرم نے اپنے آبائی شہر شاہ جہان پور

۱۱۱ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۲۹

میں درس و تدریس کا ہنگامہ بپا کیا اور سند افتا کو رونق بخشی۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۵۶۔ مفتی محمد برکت عظیم آبادی

ہندوستان کے صوبہ بہار کا دار الخلافہ ”پٹنہ“ ہے۔ اسے کسی زمانے میں عظیم آباد کہا جاتا تھا۔ اس شہر کے علما و فضلا کی ایک باقاعدہ اور مستقل تاریخ ہے۔ یہ حضرات درس و تدریس میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، فتویٰ نویسی میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا، تدین و تقویٰ میں بھی انھیں شہرت حاصل تھی، جہاد فی سبیل اللہ میں بھی انھوں نے بے پناہ قربانیاں دیں اور تفسیر و حدیث اور فقہ کی ترویج و اشاعت میں بھی ان کی تنگ و ناز کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ پٹنہ کے حضرات علما میں ایک بزرگ کا نام نامی مفتی محمد برکت تھا جو اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں گردانے جاتے تھے اور وقت کے شیخ اور فقیہ تھے۔ حنفی المسلك تھے۔ انھوں نے میر جمال الدین فاضل سے اخذ علم کیا۔ تجیل تعلیم کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور پھر عمر بھر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں میں اس دور کے بعض جلیل القدر علما کے نام ملتے ہیں، جن میں مولانا عبدالغنی پھلواری شامل ہیں۔ لا تعداد علما و طلبانے ان کی خدمت میں حاضری دی اور کسب علم کیا۔

مفتی محمد برکت عظیم آبادی نے ۱۲۲۰ھ کو وفات پائی۔

۵۷۔ سید محمد تقی لکھنوی

لکھنؤ کے شیعہ علما و فقہاء میں تیرھویں صدی ہجری میں سید محمد تقی بہت مشہور

۴۲۲ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۹ بحوالہ تاریخ فرخ آباد

۴۲۳ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۳۱ بحوالہ تاریخ اکملہ

شخصیت تھے۔ یہ سید حسین لکھنوی کے بیٹے اور سید دلدار علی حسینی کے پوتے تھے۔ شیعہ امامیہ مذہب میں مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے انھیں مجتہد کہا جاتا تھا۔

۱۶۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۲ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد گرامی سید حسین سے علم حاصل کیا۔ سید دلدار علی لکھنوی سے سند و اجازہ کا شرف حاصل ہوا، اور کبار علمائے شیعہ امامیہ میں گروانے گئے۔ لکھنؤ میں یہ نوابانِ اودھ کا دور تھا اور امجد علی شاہ برسر حکومت تھا۔ نواب امجد علی نے ان کو "ممتاز العلماء" کا خطاب عطا کیا اور شاہی مدرسے کی مسند تدریس ان کے سپرد کی۔

سید محمد تقی تصنیفی ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے :-

- ۱۔ نخبة الدعوات :- یہ کتاب ادعیہ ماثورہ سے متعلق ہے۔
- ۲۔ العباب :- یہ علم نحو کے بارے میں ہے۔
- ۳۔ کتاب الارشاد :- یہ ان لوگوں کے رد میں ہے جو تاثر و غلا سے انکار کرتے ہیں۔
- ۴۔ حدیقة الواعظین :-
- ۵۔ نزہة الموعظین :-
- ۶۔ لمعة الواعظین :- یہ تینوں کتابیں (نمبر ۳ تا ۶) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، وعظ و نصیحت کے بارے میں ہیں۔
- ۷۔ ایک رسالہ اس موضوع پر ہے کہ اگر کوئی شخص بذاتِ خود فاسق ہو، مگر مومنین کے حق میں عادل ہو تو اس کی امامت جائز ہے۔
- ۸۔ رسالہ فی فضائل الدعاء و آدابہ :- یہ رسالہ دُنا کے فضائل و آداب کے موضوع سے متعلق ہے۔
- ۹۔ مینا بیع الانوار فی تفسیر کلام اللہ الجبار :- یہ کتاب تفسیر قرآن کے سلسلے میں ہے۔

سید محمد تقی کو کتاہیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور مختلف موضوعات سے متعلق ان کے کتب خانے میں بہت سی کتابیں موجود تھیں۔
 انھوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور امام باڑہ بھی بنوایا تھا۔ اس
 امام باڑے میں بہت سے شیعہ حضرات آتے جاتے تھے۔ بالخصوص محرم کے
 عشرہ اول میں وہاں بہت ہجوم رہتا تھا اور مجالسِ عزائم منعقد ہوتی تھیں۔
 سید محمد تقی نے ۱۲۸۹ھ کو وفات پائی۔

۵۸ — قاضی محمد جمیل برہان پوری

قاضی محمد جمیل بن عبدالغفور برہان پوری جلیل القدر عالم اور بہت بڑے
 فقیہ تھے۔ مفتی اور پرمیٹر گار علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولد و منشا برہان پور
 ہے۔ ذرہ ہوش سنبھالا تو قرآن مجید حفظ کیا۔ بعد ازاں ابتدائی درسی کتابیں
 اپنے شہر (برہان پور) کے اساتذہ مولوی قدرت اللہ، مولوی صنیاء الدین عورت
 اللہ والے اور مولوی عوض علی سے پڑھیں۔ اس کے بعد حیدرآباد (دکن) کا عزم
 کیا، لیکن بہت کم عرصہ وہاں مقیم رہے اور مولوی محمد حفیظ سے کچھ استفادہ کیا۔
 معلوم ہوتا ہے حیدرآباد میں ان کا دل نہیں جما، اس لیے جلد ہی وہاں سے رخصت
 باندھا اور دہلی آگئے۔ دہلی اس زمانے میں فضل و کمال کا گہوارہ تھا اور بہت
 سے جید علما اور عالی مرتبت حضرات وہاں اقامت گزینے تھے، جن کے درس و
 تدریس کے ہنگامے جاری تھے۔ ان میں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، مفتی صدر الدین
 آزرہ اور سید محمد قندھاری کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں مولانا
 محمد جمیل نے ان سب کے سامنے زانوئے ادب نہتہ کیا اور خوب مستفید ہوئے۔
 شاہ ابوسعید مجددی سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی۔

دہلی سے لکھنؤ کا قصد کیا۔ لکھنؤ میں ممتاز شافعی المسک عالم مرزا حسن علی
 لکھنوی کی مسند تدریس آراستہ تھی، مولانا محمد جمیل اس میں شامل ہوئے اور حصولِ علم کیا۔

کھنڈ سے عازمِ حجازِ مقدس ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔
 حجاز سے مراجعت فرمائے سندھ ہوئے اور اپنے وطن بُرہان پور پہنچے۔
 چوں کہ حدیث و فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں عبور رکھتے تھے، لہذا بُرہان پور کے منصبِ قضا
 پر فائز کیے گئے اور کافی عرصہ یہاں خدمت انجام دیتے رہے۔
 بُرہان پور سے پھر حیدرآباد (دکن) گئے۔ اب تمام اصنافِ علم پر حاوی ہو
 چکے تھے اور تجربہ بھی وسیع ہو گیا تھا، اس لیے حیدرآباد کے مدرسہ عالیہ کی
 مسند تدریس ان کو تفویض کی گئی۔ تاحینِ حیات اس مسند پر متمکن رہے اور خلقِ کثیر
 نے ان سے استفادہ کیا۔

بلاشبہ قاضی محمد جمیل بُرہان پوری اپنے عہد کے نامور عالم اور ممتاز فقیہ
 تھے اور ان کی خدمات کا دائرہ دور و نزدیک پھیلا ہوا تھا۔

اس عالم کبیر اور فقیہ نامدار نے ۲۳ — جمادی الاولیٰ ۱۲۷۲ھ کو
 حیدرآباد (دکن) میں وفات پائی اور اسی شہر میں آسودۂ لحد ہوئے۔

۵۹ — سید محمد حسین حیدرآبادی

ہندوستان کے علاقہ دکن کے علمائے کرام اور فقہائے عظام میں سید محمد حسین
 حیدرآبادی معروف عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ والد کا اسم گرامی علی نور اور جد امجد
 کا نام نامی نور محمد تھا۔ تمام علوم میں دسترس رکھتے تھے، لیکن فقہ اور اصول فقہ
 میں بالخصوص شہرت حاصل تھی۔ درحقیقت ان کا خاندان خراسان سے تعلق رکھتا
 تھا۔ ان کی پیدائش بھی خراسان ہی میں ہوئی اور وہیں نشوونما پائی۔ اوائل عمر
 (۱۲۳۷ھ) میں ہندوستان آئے اور یہاں کے مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا۔

۵۲۴ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۲۳۲، ۲۳۳ — تاریخ بُرہان پور ص ۱۷۵-۱۷۷۔

تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۵؛

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۲۵۵ء میں حیدرآباد دکن گئے۔ حیدرآباد میں یہ ناصر الدولہ کا دور حکومت تھا۔ اس سے ملے تو وہ ان کے کثرت معلومات اور علوم پر مہارت سے بہت متاثر ہوا، اور انھیں اپنے بیٹے افضل الدولہ کا استاد مقرر کر دیا۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا جو انھیں حاصل ہوا۔ یہ خدمت انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے انجام دی۔ بعد ازاں اپنی قابلیت کی بنا پر محکمہ قضا میں نائب مقرر ہوئے۔ مدت تک یہ خدمت ان کے سپرد رہی۔ بے حد صالح اور متدین عالم دین تھے۔ گفتار اور کردار میں اپنی مثال آپ تھے۔ جس کام پر مامور کیے جاتے، اسے عمدگی سے انجام دیتے۔ بلند اخلاق اور نرم مزاج اہل علم تھے۔

سید محمد حسین نے غزوة رمضان ۱۲۷۴ھ کو حیدرآباد (دکن) میں وفات

پائی ۲۵

۶۔ شیخ محمد حسین انصاری سندھی

دیارِ سندھ کے شیخ محمد حسین بن محمد مراد بن یعقوب بن محمود انصاری خزر جی، اپنے عصر کے شیخ و فاضل اور عالم کبیر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوالایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ علاقہ سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ ان کے والد شیخ محمد مراد جلیل القدر عالم تھے، لائق بیٹے نے انہی سے علم حاصل کیا اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ پھر والد کے ساتھ ہی ہجرت کر کے دیارِ عرب کو اپنا مسکن بنا لیا۔ تفسیر و حدیث، صرف و نحو، بیان معانی، فقہ حنفیہ اور اس کے اصول پر انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ علم طب میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مرزبین عرب میں انھیں بہت شہرت حاصل تھی اور تمام علما و فضلا ان کے علم و کمال کے معترف تھے۔ ارباب حکومت میں بھی

۲۵ تزک محبوبی — نزہۃ الخواص، ج ۷، ص ۲۳۷

قدر و منزلت کے مالک تھے۔ ان کے والد محمد مراد بھی طبقہ علما اور امرا و وزرا میں تکریم و تعظیم کے حامل تھے۔ حکومت کے ایک وزیر نے شیخ محمد مراد کے لیے ایک رباط، ایک مسجد اور بہت اچھا مکان تعمیر کرا دیا تھا۔ ان کا عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں موجود تھیں۔

۶۱۔ مولانا محمد سالم دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا گھرانہ علمی اعتبار سے نہایت زرخیز گھرانہ تھا۔ ان کی اولاد و احفاد سے متعدد اہل علم نے جنم لیا اور بہترین خدمات انجام دیں۔ تصنیف و تالیف، شروح و حواشی اور درس و تدریس میں ان میں سے بعض حضرات کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس دو دمان عالی قدر کے ایک بزرگ مولانا محمد سالم تھے جو فضیلت علم اور شیخت میں خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کا مولد و منشا دہلی ہے۔ اپنے عصر کے جلیل القدر اساتذہ سے تحصیل علم کی اور پھر حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ یہ مولانا سلام اللہ کے لائق فرزند تھے اور اپنے دور کے جید علما میں گروانے جاتے تھے۔ حج بیت اللہ کے بعد واپس وطن تشریف لائے تو ہندوستان کے شہر دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علما و فضلاء کا مرجع قرار پا گئے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ اصول الایمان فی حب النبی والہ من اہل السعادة والايقان، یہ کتاب ایک مقدمے اور چار فصول پر مشتمل ہے۔ مصنف کی زندگی ہی میں ۱۲۵۹ھ کو دہلی میں طبع ہوئی۔

۲۔ نور الايمان،

۳۔ لطائف الاسرار، یہ کتاب توہیات اور دم جھاڑے سے متعلق ہے۔

۳۶ نزہۃ الخواطر ج ۱، ص ۲۳۸

۴- طریق السالم

۵- ترجمہ حزب البحر

بعض اور رسائل بھی تصنیف کیے۔

مولانا محمد سالم اپنے دور میں تیرھویں صدی ہجری کے معروف علما و فقہاء میں سے تھے۔ ان کے سن ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۶۲۔ مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی

ہندوستان کے شہر مدراس اور اس کے نواح میں جو اصحاب علم فقہی میدان میں سرگرم عمل ہوئے ان میں مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی کا نام نامی لائق تذکرہ ہے۔ ۱۱۹۴ھ کو مدراس میں ان کی ولادت ہوئی اور مختلف علمائے وقت سے حصول علم کے بعد کچھ عرصہ تو درس و افادہ میں مشغول رہے، پھر حکومت مدراس نے ان وظائف و عطیات کی تقسیم مامور کر دیا جو اہل حرمین کے لیے مقرر تھے۔ والی مدراس نے ان کو سراج العلماء حافظ محمد اسلم خاں بہادر کے لقب سے سرفراز کیا اور اسی لیے اسلمی کہلائے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد وہ حجاز تشریف لے گئے اور مکہ مکرمہ میں قیام کیا۔ طویل مدت تک وہاں اقامت گزیں رہے۔ قیام مکہ کے زمانے میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب تحفہ اثنا عشریہ کا عربی میں ترجمہ کیا تاکہ علمائے مکہ اور دیگر عرب اہل علم اس سے مستفید ہو سکیں۔

مکہ مکرمہ سے اپنے وطن مدراس آئے اور مدراس میں ایک ذاتی مکان بنایا، ایک باغ لگایا اور سعید آباد کے نواح میں قبرستان کے لیے بھی ایک جگہ وقف کی۔

مدراس سے حیدرآباد (دکن) گئے، پھر اوزنگ آباد کا عزم کیا اور ایک

۱۲۰۰ھ نزہۃ الخواطر ۷ ص ۲۲۰، ۲۲۱ بحوالہ مرآة المحققین۔

عرصے کے بعد دوبارہ مدراس آئے۔

اس عالم دین اور فقیہ نامدار نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام ”سفینۃ النجات“ ہے جو اختلافی مسائل سے متعلق ہے اور ضخیم کتاب ہے۔ آخر عمر میں فارسی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

مولانا محمد سعید اسلمی نے ۸۔ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ کو مدراس میں وفات پائی اور وہیں اپنے ذاتی قبرستان (محرّم) ۱۲۷۱ھ یا ۱۲۷۲ھ کو مدراس میں وفات پائی اور وہیں اپنے ذاتی قبرستان (رناج سعید آباد) میں دفن کیے گئے۔

۶۳۔ مولانا محمد سلیم جون پوری

جون پور (یوپی) کا ایک مشہور شہر ہے جو بے شمار علما و فقہا کا مولد و مرکز رہا ہے اور ان کا تذکرہ سلسلہ فقہائے ہند کی گزشتہ جلدوں میں کسی مقامات پر ہو چکا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس شہر میں جن بلند پایہ حضرات نے نوع بنوع علمی خدمات انجام دیں، ان میں مولانا محمد سلیم جعفری جون پوری کا اسم گرامی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں نمایاں طور سے مرقوم ہے۔

محمد سلیم جعفری ۱۲۲۲ھ کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک مقام مچھلی شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب قاضی ثناء اللہ مچھلی شہری سے ملتا ہے۔ محمد سلیم نے علوم عربیہ کی ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے نامور عالم مفتی علی کبیر بن علی محمد جعفری مچھلی شہری سے حاصل کی اور انتہائی کتابوں کا درس قاضی محمد شکور مچھلی شہری سے لیا۔ ملا رحمت اللہ کابلی سے بھی استفادہ کیا۔ محمد سلیم جعفری اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے، عربی ادبیات میں

ان کو خصوصیت سے درک حاصل تھا۔ فارسی اور عربی کے اچھے شاعر بھی تھے اور طبیعت موزوں رکھتے تھے۔ متقی، پرہیزگار، بلند اخلاق، بامروت، فہیم اور صاحبِ فراست تھے۔ ذہن بہت رسا پایا تھا۔ گفتار و کردار میں بے نظیر تھے۔ فصاحت و بلاغت میں یتیم اور سخن سنجی اور نکتہ آفرینی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی نظم و نثر میں کوئی اس علاقے میں ان کا حریف نہ تھا۔ مشکل ترین مضامین کی عقدہ کشائی میں بہت تیز تھے۔

نقہ میں عبور کی وجہ سے اپنے استاد محترم مفتی علی کبیر مچھلی شہری کی سفارش پر پہلے قاضی مقرر ہوئے، پھر صدر امین کا منصب پایا، بعد ازاں صدر الصدور کا عہدہ حاصل کیا۔ اپنے دور کے علمائے ہند میں ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اپنی قابلیت و صلاحیت کی بنا پر ملک کی انگریزی حکومت میں منائیت قدر و منزلت کے حامل قرار پائے تصنیف و تالیف میں میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تحریر فرمائیں :-

- ۱۔ رقیۃ سلیم : یہ کتاب علم حدیث سے متعلق ہے اور اس میں فقہی مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب عربی میں ہے۔
- ۲۔ حاشیہ علی شرح چغینی :- علم ہتیت کے بارے میں شرح چغینی پر عربی حاشیہ۔

۳۔ ہفتوات الالحاد :- عربی ادبیات کے بارے میں۔

۴۔ رسالہ الجبر والمقابلہ :- یہ بھی عربی میں ہے۔

۵۔ میزان الوافی فی علمی العروض والقوافی :- عروض و قوافی کے سلسلے میں

ایک اہم کتاب ہے۔

۶۔ رسالہ فی تحقیق الشہور :- سال کے بارہ مہینوں کے بارے میں۔

۷۔ رسالہ مصطلحات فارسی۔

۸۔ جون پور نامہ :- جون پور کی تاریخ سے متعلق۔

۹۔ دیوان فارسی :- تارسی اشعار کا مجموعہ ۔

۱۰۔ دیوان عربی :- عربی اشعار کا مجموعہ ۔

اس جید عالم و فقیہ نے صرف چوہا بیس سال عمر پائی اور مکیم جمادی الاولیٰ ۱۲۶۶ھ کو اعظم گڑھ (لویپی) میں فوت ہوئے، وہیں دفن کیے گئے۔

۶۴۔ سید محمد سیادت امر وہوی

امروہہ (لویپی) کے شیعہ علما و فضلا میں سید محمد سیادت بن محمد عبادت حسینی امر وہوی نے بڑا نام پایا۔ امر وہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ ان کے والد سید محمد عبادت شیعہ کے معروف علما میں سے تھے، بیٹے نے انہی سے اکتساب علم کیا اور علم فقہ اور دیگر علوم میں عبور حاصل کیا۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں ایک ممتاز شیعہ عالم و مجتہد سید محمد بن ولد ار علی لکھنوی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور فقہ، کلام، اصول فقہ اور باقی علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت پیدا کی۔ اب وہ فقہ و اصول میں اپنے عصر کے بہت بڑے شیعہ عالم شمار ہونے لگے۔ فارغ التحصیل ہو کر واپس امر وہہ گئے تو انہیں اپنے والد گرامی سید محمد عبادت کی جگہ فرض نمازوں کا امام مقرر کر دیا گیا اور تحقیق مسائل میں امر وہہ اور اس کے گرد و نواح کے حضرات انہی سے رجوع کرنے لگے۔ اپنے شہر کا منصب اکتفا اور عہدہ تدریس بھی ان کے سپرد کیا گیا اور اس سلسلے میں دور دور تک ان کا نام پہنچا۔

امروہہ کے اس شیعہ عالم و فقیہ نے ۱۲۶۵ھ کو امر وہہ میں وفات پائی ہے۔

۱۳۹۔ تنجلی نوریج ۲ ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ تاریخ شیراز مہند جون پور ص ۷۷۳، ۷۷۴۔

نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

۱۴۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۳۔ بحوالہ تاریخ اصغری۔

۶۵ — محمد شاکر سورتی

ہندوستان کے علاقہ گجرات کے شہر سورت میں بے شمار علما اور فقہا پیدا ہوئے جن کا ذکر فقہائے ہند کی تمام جلدوں میں متعدد مقامات پر آچکا ہے۔ ان حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد شاکر تھے جو حنفی المسک تھے اور سورت کے اونچے مرتبے کے فقہا میں گروانے جاتے تھے۔ ان کے زمانے میں سورت میں لاہور کے ایک عالم و فقیہ سید عبداللہ حسنی لاہوری فرودکش تھے، محمد شاکر نے انہی سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا اور مرتبہ عالی کو پہنچے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شہر ہی میں سکونت اختیار کیے رکھی اور تمام عمر درس و افادہ میں مشغول رہے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اپنے عصر میں ان کو آتشگانِ علوم کے مرکز و مرجع کی حیثیت حاصل تھی فقہی مسائل کی تحقیق و دریافت میں لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کی بات کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ مولانا محمد شاکر سورتی نے ۱۱۰۰ھ و قیعدہ ۱۲۴۰ھ کو سورت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

۶۶ — مولانا محمد شکور ہاشمی مچھلی شہری

صوبہ بونپہ کا "مچھلی شہر" کسی زمانے میں اہل علم کا گہوارہ تھا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس کے لائق تذکرہ حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد شکور جعفری ہاشمی مچھلی شہری گزسے ہیں جن کے والد کا نام نامی مولانا امانت علی جعفری ہاشمی تھا اور وہ اپنے دور کے فاضل آدمی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ محمد شکور کی ولادت ۱۲۱۱ھ کو مچھلی شہر میں ہوئی اور اپنے والد ماجد کے

لے نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۳، ۲۲۴، بحوالہ عدلیقہ احمدیہ۔

سایہ عاطفت میں تربیت پائی۔ حصول علم کا آغاز اپنے نانا مولوی علی محمد سے کیا جو علم و عمل اور فضل و کمال میں اُونچے مرتبے کے مالک تھے۔ کتبِ درسیہ کی تکمیل امنی سے کی۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا رشید الدین خاں، مولانا عبدالرحمن بکری برہان پوری اور مولانا فضل آبادی کے سلسلہ ہائے درس جاری تھے، محمد شکور ان میں شامل ہوئے، تین سال دہلی رہے اور ان سب علمائے مشاہیر سے استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہوئے تو ان کا شمار اپنے دور کے معروف ترین علما میں ہونے لگا اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں ممتاز گردانے گئے۔ حدیث و فقہ میں بالخصوص عبور حاصل تھا۔ ان کی شہرت علمی اس زمانے کے ہندوستان کی انگریزی حکومت کے سرکردہ افراد تک پہنچی تو انھیں منصبِ افتا پر متمکن کر دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ پھر فتح پور ہسپتال میں صدر الصدور کا عہدہ جلیلہ ان کے سپرد ہوا۔ پچیس سال یہ خدمت انجام دی۔ ۱۲۶۰ھ میں اس منصب سے علیحدہ ہوئے۔ ملازمت کے دوران اور اس کے بعد تدریس کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا۔ ان کے معروف شاگردوں میں تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی بھی شامل ہیں۔ مولوی رحمان علی نے فتح پور ہسپتال میں بھی ان سے تعلیم پائی اور پھر جب وہ ملازمت سے علیحدہ ہو کر اپنے وطن پھلی شہر چلے گئے تو اس وقت بھی یہ ان کی خدمت میں حاضر تھے اور ان کے عزیز اور لائق شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

دومرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا۔ مکہ مکرمہ کے دوران قیام میں مفتی مکہ سید محمد حسین سے بھی استفادہ کیا۔

مولانا محمد شکور نے ترک ملازمت کے بعد مستقل طور پر اپنے وطن میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۶۰ھ میں ملازمت چھوڑی تو گھر میں بیٹھ گئے اور درس و تدریس کا

سلسلہ شروع کر دیا۔ وفات کے وقت تک کل چالیس سال گھر میں رہے اور اس دوران میں حکومت انگریزی کی طرف سے باقاعدہ پنشن ملتی رہی۔ چالیس سال میں نوے ہزار روپے پنشن کے ملے جو اس دور میں بہت بڑی رقم تھی۔
مندرجہ ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں :-

۱۔ شرح مقامات ہندی۔

۲۔ حل ابجاث القرآنہ۔

۳۔ شرح کنز الدقائق : فقہ کی مشہور روسی کتاب کنز الدقائق کی شرح۔

۴۔ ترجمہ طوطی نامہ (راذ نخستی)

یہ تمام کتابیں عربی میں ہیں۔

اس عالم و نقیب نے ۲۹۔ شوال ۱۳۰۰ھ کو مچھلی شہر میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

۶۷۔ سید محمد ظاہر حسنی بریلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مقامات علم و کمال اور ورع و تقویٰ میں رائے بریلی کو ایک عرصے سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شاہ علم اللہ کے اخلاف میں سے ایک عابد و زاہد بزرگ سید محمد ظاہر حسنی تھے جو سید غلام جیلانی کے فرزند ارجمند تھے۔ ۱۱۹۸ھ کو اپنے آبائی وطن رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے عم محترم سید قطب الہدیٰ سے جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلمیذ تھے حصول علم کا آغاز کیا اور طویل مدت تک ان سے مشغول استفادہ رہے۔ علوم مروجہ

۲۔ نخل نوزج ۲ ص ۱۲۵ تا ۱۲۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ۱۹۹۰ء۔ ۱۔ تذکرہ

علمائے ہند ص ۱۹۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۲۔

کی کچھ کتابیں مولانا ذوالفقار علی دیوبند سے بھی پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے عازم لکھنؤ ہوئے اور مولانا عبدالجامع سیدن پوری کے حلقہٴ درس میں شرکت کی تاریخ تکمیل ہونے کے بعد علم طب کو مرکز التفتات ٹھہرایا اور لکھنؤ کے بعض مشاہیر اطباء سے کتب طب پڑھیں اور اس میں مہارت پیدا کی۔ حصول علم سے فراغت کے بعد اپنے شہر رائے بریلی تشریف لے گئے اور سید احمد شہید بریلی سے اخذِ طریقت کیا۔ پھر حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حج کے بعد وطن واپس آئے اور دعوتِ ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ ریاست دلیوں میں مقیم رہے، وہاں ریاست کے دلیوں، پانڈے دین بندہ بہادر کے بیٹوں کو تعلیم دینے پر مامور ہوئے۔ اس زمانے میں تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور وہ ان کے علم و فضل اور زہد و اتقا سے متاثر ہوئے۔ سید محمد ظاہر بے شک جید عالم، فقیہ کامل اور مرد صالح تھے۔ بارعب بلند اخلاق، متواضع، نصیح اللسان، سلیم العقل اور صحیح الفکر اہل علم تھے۔ لہذا ان کو حسن صورت، عذوبت زبان اور اخلاقِ حسنہ کی دولت سے نوازا تھا۔ وعظ و خطابت، درس و تدریس، فتویٰ نویسی اور فصلِ خصومات ان کا مشغلہ تھا۔ ان کے اوصافِ گوناگوں کی بنا پر سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے اور وہ سب سے احترام کے ساتھ پیش آتے تھے، اپنے شہر اور قریب جوار میں نہیں قبولیت عامہ حاصل تھی۔ اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی تھا۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں :-

۱۔ تحریم الحرام :- یہ قرآن مجید کی آیت وَمَا أَهْلَ لِنَبِيِّ اللَّهِ کی تفسیر ہے۔

۲۔ قاطع البدعہ :- بدعات و رسوم کی تردید میں۔

۳۔ خیر المسالک :- سلوک و تصوف کے بارے میں۔

۴۔ رسالہ در بیان وحدت الوجود و وحدت الشہود :- اس میں وحدت الوجود کا

رُو کیا گیا ہے۔

۵۔ رسالہ در بیان فتوحاتِ شام۔

۶۔ دیوانِ شعری، اردو۔

اوپر کی پانچوں کتابیں فارسی میں ہیں۔

ان کے شاگردوں میں مولانا محمد صادق غازی پوری، مشہور مناظر اور تفسیر
منظر العجائب کے مصنف مولانا لطف اللہ کھنوی اور ان (سید محمد ظاہر) کے بھانجے

سید فخر الدین حسنی (صاحبِ نزہۃ الخواطر کے والد) شامل ہیں۔

سید محمد ظاہر نے ۱۲۷۸ھ کو راتے برہی میں بجا روضۃ فالج و فوات

پانی پھی

۶۸۔ علامہ محمد عابد سندھی

تیرھویں صدی ہجری کے دیارِ سندھ کے علمائے مشاہیر میں علامہ محمد عابد
بن احمد علی بن محمد مراد بن یعقوب حافظ بن محمود انصاری خزرہی سندھی کا اسم گرامی
بہت مشہور ہے۔ وہ اپنے دور کے عالمِ اجل، محدثِ نامدار اور فقیہِ کامل تھے۔
معقول و منقول کے جامع اور فقہِ حنفیہ کے ماہر تھے۔ نسباً مدینہ منورہ کے قبیلہِ خزرج
سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت ابو الیوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے،
جیسا کہ شجرہ نسب سے ظاہر ہے، والد کا اسم گرامی شیخ احمد علی اور دادا کا
محمد مراد تھا۔

محمد عابد سندھی کی ولادت ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ صوبہ سندھ کے ایک
مشہور مقام ”سپون“ میں ہوئی۔ ان کے جدِ امجد شیخ محمد مراد اپنے اہل و عیال
کے پورے قافلے کے ساتھ ارضِ سندھ سے ہجرت کر کے سرزمینِ عرب میں چلے

۵۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۶، ۱۹۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۵، ۲۲۶۔

گئے تھے اور وہیں اقامت اختیار کر لی تھی۔ اصحاب علم و صلاح میں ان کا شمار ہوتا تھا اور شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب تھے۔

محمد عابد سندھی نے علوم مروجہ کی اکثر کتابیں علاقہ عرب میں اپنے علم محترم شیخ محمد حسین سے پڑھیں۔ پھر علمائے یمن و حجاز کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن میں علامہ سید عبدالرحمن بن سلیمان اہل شیخ یوسف بن محمد زہابی شیخ محمد طاهر سنبل، مفتی عبدالملک قلعی اور شیخ صالح بن محمد عمری زیادہ مشہور ہیں اور ان کا شمار اس عہد کے اجل علمائے عرب میں ہوتا تھا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد علامہ محمد عابد سندھی نے یمن کے مقام ”زبید“ کو اپنا مسکن قرار دیا اور زیادہ عرصہ وہیں رہے، یہاں تک کہ وہیں کے ساکنین میں سے گردانے گئے۔ بعد ازاں ”صنعا“ تشریف لے گئے اور وہاں اقامت اختیار کر لی، زندگی کا بہت بڑا حصہ وہیں گزارا، اور وہاں کے امیر کے طبیب مقرر ہو گئے۔ شادی بھی وہاں کے ایک وزیر کی بیٹی سے ہوئی۔ وہاں کے عوام و خواص ان کی بوقلموں علمی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ امیر صنعا نے ایک مرتبہ ان کو بہت سے ہدایا و تحائف دے کر حاکم مصر کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا۔ دربار مصر میں ان کی یہ سفارت آگے چل کر ان کی عظمت و شہرت کا باعث بنی اور وہ ایک اونچے مقام پر ناز ہوئے۔ مصر میں طابہ کے محلات اور باغات ان کے لیے بالخصوص وجہ کشش تھے اور ان کی خوشبو اور مہک انہیں اپنی طرف کھینچتی تھی۔ چنانچہ ایک دن وہاں گئے تاکہ اس کے قریب جوار میں اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کریں اور وہاں سکونت اختیار کر کے علم و حکمت کے موتی بکھیریں۔

اس نواح میں وہ ایک عرصے تک اقامت گزریں رہے اور درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے ذریعے وہاں کے لوگوں کی اصلاح کو اپنا مطمح نظر ٹھہرائے رکھا۔ لیکن وہاں کے لوگ ان کی مخالفت پر اتر آئے اور ان کی تبلیغ دین

اور اشاعتِ اسلام کی کوششوں کے خلاف کمر بستہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مجبوراً اپنے اس پسندیدہ مقام سے خیمہ اکھاڑنا پڑا۔ اب وہ وہاں سے کوچ کر کے "حدیدہ" میں آئے۔ حدیدہ میں انھیں ایک اور دورِ ابتلا سے گزرنا پڑا۔

۱۲۲۴ھ کا واقعہ ہے کہ حسین بن علی حازمی جو کہ زیدی شیعہ تھے، حدیدہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ وہ اہل نجد کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے حکم دیا کہ اذان میں حمیٰ خیر العسل کے الفاظ پڑھائے جائیں اور وہ الفاظ جو مسلمانوں کو ان کے اختلاف سے ورثے میں ملے ہیں، یعنی المصلوٰۃ خیر من النوم ترک کر دیے جائیں۔ وہ ان الفاظ کو بدعت قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ الفاظ حضرت عمر بن خطاب نے اپنے دورِ خلافت میں ایجاد کیے ہیں۔ لیکن لوگوں نے قاضی حسین بن علی کے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔

جب قاضی نے دیکھا کہ لوگ ان کا حکم ماننے کو تیار نہیں اور وہ اس کو غلط قرار دیتے ہیں تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئے اور سختی پر اتر آئے۔ انھوں نے چالیس آدمیوں کو جنھیں وہ خطرناک سمجھتے تھے، گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ علامہ محمد عابد سندھی کو بھی ان کے ساتھ حوالہ زندان کر دیا گیا۔ علامہ سندھی اور ان کے ساتھیوں پر اس قدر مظالم ڈھائے کہ ان کی گردنوں میں لوہے کے طوق ڈال دیے اور ان کے لیے بیٹھنا اٹھنا اور چلتا پھرتا مشکل ہو گیا۔ متواتر چھ دن ان کو اسی حالت میں رکھا گیا۔ پھر سب کو چھوڑ دیا، لیکن علامہ محمد عابد کو نہیں چھوڑا، ان کو قاضی حسین بن علی کے حکم کے مطابق شدید مارا پیٹا گیا۔ بالآخر انھیں حدیدہ سے نکال دیا گیا۔

اس کے بعد وہ اپنے آبائی وطن سندھ آئے اور وہاں کے ایک مقام "ناری" میں قیام پذیر ہوئے، چند روز وہاں رہے، پھر ذہن میں بلادِ عرب کا شوق موجزن ہوا، اور ادھر کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اب مدینہ منورہ

میں اقامت اختیار کی اور نہایت اکرام و احترام کے ساتھ اس بلدہ طیبہ میں مقیم ہوئے۔ والی مصر کی طرف سے علمائے ملک کی صدارت کے منصب پر فائز کیے گئے اور انتہائی عزت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اب اللہ کی عبادت، اتباع سنت، صبر و استقامت، نصیح امت، اشاعت دین، لوگوں سے رانت و شفقت کا بتاؤ کرنے اور نشرِ علوم کے سوا ان کا کوئی مشغولہ نہ تھا، ہر لمحہ اسی میں مشغول رہتے اور یہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

علامہ محمد عابد سندھی کا تذکرہ البدر الطالع میں قاضی محمد بن علی شوکانی نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ محمد عابد سندھی اپنے چچا کی معیت میں بندرگاہ حدیدہ پہنچے، ان کے چچا علم طب میں بہت مشہور تھے۔ شیخ محمد عابد بھی طبابت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں صرف و نحو، فقہ حنفیہ، اصول فقہ اور دیگر علوم میں جہارت حاصل تھی۔ علم طب میں شہرت و ناموری کی وجہ سے حاکم وقت امیر منصور نے ان کو حدیدہ سے خاص طور پر بلا یا اور بہت سے لوگوں نے ان سے علاج کرایا اور صحت یاب ہوئے۔

قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۳ھ میں محمد عابد حدیدہ سے ان کے پاس صنعائے او ان سے ہدایتہ الا بہری اور اس کی شرح میبذی پڑھی۔ باوجود اس کے کہ کتاب کے مباحث بہت مشکل اور دقیق ہیں، جو بڑے بڑے علما کی سمجھ میں بھی نہیں آتے، لیکن وہ ہر بحث کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

پھر اسی سال شوال ۱۲۱۳ھ میں ذہ حدیدہ واپس ہوئے اور امیر حدیدہ نے ان کو نہایت اعزاز و اکرام کا مستحق گردانا۔ ان کے لیے خاص وظیفہ مقرر کیا اور خلعت عطا کی۔ بہت سے عطیات و تحائف بھی دیے۔ پھر ان کی آمدِ صناع میں بھی رہی۔ زمانہ منصور میں بھی وہ کئی دفعہ صنعائے متوکل باللہ کے عہد میں بھی ان کا وہاں آنا جانا رہا۔ امیر مہدی کے دور میں بھی وہ متعدد مرتبہ واردِ صنع ہوئے۔

مہدی کے نزدیک تو وہ اس قدر لائق اعتماد تھے کہ ۱۲۳۲ھ کو اس نے ان کو محمد علی پاشا کے دربار میں اپنے خاص نمائندے کی حیثیت سے تحائف دے کر مصر بھیجا۔ جب مصر سے واپس آئے تو کہا کہ مصر میں علم ختم ہو چکا ہے، صرف تقلید اور تصوف کی باتیں باقی رہ گئی ہیں، لوگ فکر اور اجتہاد کی دولت سے محروم ہو گئے ہیں۔

الیانح الجنی میں شیخ محسن بن یحییٰ ترمذی رقم طراز ہیں کہ عادات و اطوار اور اخلاق و کردار کی بلندی میں شیخ محمد عابد اپنے زمانے کے معروف ترین لوگوں میں سے تھے۔

علامہ محمد عابد سندھی تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور کئی مبسوط اور مختصر کتابیں ان سے یادگار ہیں جو درج ذیل ہیں :-

۱۔ المواہب اللطیفہ علی مسند الامام ابی حنیفہ :- یہ صرف حنفی کی روایت پر مشتمل ہے۔

۲۔ طوابع الانوار علی الدر المختار :- یہ اپنے موضوع کی نہایت جامع کتاب ہے، جس میں مذہب امام ابو حنیفہ کے فروعی مسائل اور فتوے بیان کیے گئے ہیں۔

۳۔ شرح تیسیر الوصول الی احادیث الرسول :- یہ ابن الزبیر حنفی ثیبانی کی کتاب کی شرح ہے، جو کتاب الحدود تک ہے۔

۴۔ حصر الشارد فی اسانید محمد عابد :- یہ اسانید کے بارے میں ایک مبسوط و مفصل کتاب ہے جو بندرگاہِ محمدا میں، ماہِ رجب ۱۲۴۰ھ کو مکمل ہوئی۔

۵۔ شرح بلوغ المرام :- منقول ہے کہ علامہ سندھی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب ”بلوغ المرام“ کی شرح لکھنی شروع کی تھی، لیکن اسے مکمل نہ کر پائے۔ ان کتابوں کے علاوہ مختلف علوم و فنون سے متعلق کئی اور بھی

کئی کتابیں تصنیف کیں۔

وہ عربی کے بہت بڑے شاعر بھی تھے۔

علامہ محمد عابد سندھی نے پیر کے دن ۱۷ — ربيع الاول ۱۲۵۷ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں باب عثمان کے سامنے دفن کیے گئے۔

۶۹ — سید محمد عسکری امر وہوی

امروہہ، ہندوستان کے صوبہ یوپی کا وہ شہر ہے جس میں بہت سے شیعہ علما و فقہا نے جنم لیا اور علم و ادراک میں شہرت حاصل کی تیرھویں صدی ہجری میں جو شیعہ اہل علم امر وہہ میں پیدا ہوئے، ان میں ایک بزرگ سید محمد عسکری حسینی نقوی ہیں جن کے والد کا اسم گرامی سید محمد سیادت اور دادا کا محمد عبادت تھا۔ اپنے دور اور علاقے کے عالم اور فاضل شخص تھے۔

سید محمد عسکری کی ولادت امر وہہ میں ہوئی اور وہیں نشوونما پائی۔ ان کے والد سید محمد سیادت اس عہد کے نامور علما میں سے تھے، محمد عسکری نے ابتدائی تعلیم والد ہی سے حاصل کی اور شیعہ فقہ کا حصول بھی انہی سے کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے عازم لکھنؤ ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ کے شیعہ علما میں سے سید محمد بن دلدار علی مجتہد لکھنوی اور ان کے بڑے بھائی سید حسین کا بہت شہرہ تھا اور ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ سید محمد عسکری ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں بھائیوں سے خوب استفادہ کیا۔

جب فارغ التحصیل ہو گئے تو واپس اپنے وطن امر وہہ آئے اور والد کی وفات کے بعد وہاں کے شیعہ حضرات کی نماز پنجگانہ کی امامت ان کے سپرد ہوئی تدریس و

۵۳۱ بدر الطالع ج ۲ ص ۲۲۷ — الیوم الجئی — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۲ — نزہۃ الخواطر

ج ۷ ص ۲۲۶ تا ۲۲۹ — الجداول ج ۳ ص ۱۷۰ — صدائق الحنفیہ ص ۲۷۳

کی ذمے داریاں بھی انھیں سونپی گئیں۔ چونکہ مروجہ علوم میں دسترس رکھتے تھے اور بالخصوص فقہ شیعہ میں ادراک حاصل تھا، علاوہ ازیں آبا و اجداد سے ایک مذہبی منصب پر فائز چلے آ رہے تھے، لہذا بہت جلد امر وہ اور اس کے گرد و نواح کے شیعہ حضرات کا مزاج قرار پا گئے۔ وہاں کے اصحاب تشیع کے امام بھی تھے، فتویٰ نویسی بھی کرتے تھے اور طلباء کو درس بھی دیتے تھے۔ اپنے حلقے میں بڑی عزت و تکریم کے حامل تھے اور ہر اعتبار سے قدر و منزلت رکھتے تھے۔

سید محمد عسکری حسینی نقوی نے ۱۲۸۹ھ کو امر وہ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

۷۔ حافظ محمد عظیم پشاوری

تیرھویں صدی ہجری کے علمائے پشاور میں حافظ محمد عظیم کا نام نامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ اپنے عہد اور علاقہ پشاور کے علم نبیل، فاضل جلیل اور واعظ بے عدل تھے۔ ظاہری و باطنی کمالات کے جامع اور صاحب کثوف و کرامات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدائے عمر میں بہت غنی اور کن ذہن تھے۔ کوئی چیز یاد نہ رہتی تھی اور مکتب سے بھاگ آتے تھے۔ ایک روز حسب معمول مکتب سے بھاگ کر آئے تو والدین کے خوفِ عتاب سے گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوتی اور زرات بھر مکان کی دیوار کے بیرونی حصے کے پاس کھڑے روتے رہے۔ منقول ہے کہ اسی حالت میں کھڑے تھے کہ حضرت خضر کی زیارت ہوئی اور انھوں نے آپ کے لیے دعا کی۔ اس کے بعد ذہن کھل گیا اور تھوڑی ہی مدت میں علوم نقلیہ و عقلیہ سے فارغ ہو گئے۔

حافظ محمد عظیم اپنے دور کے بہت بڑے فقیہ، جلیل لہت در عالم اور

بے مثال واعظ تھے۔ پشاور اور اس کے نواح کے لوگ مسائل فقہی وغیرہ میں انہی سے رجوع کرتے تھے۔ عربی، فارسی، پشتو اور پنجابی کے ماہر تھے اور ان تمام زبانوں میں نہایت موثر وعظ کہتے تھے۔ جو شخص ان زبانوں میں سے کوئی زبان بولتا، اسی زبان میں اس سے بات کرتے اور مسائل سمجھاتے۔

حافظ محمد عظیم پشاوری بصارت سے محروم تھے، لیکن اللہ نے ان کو بے پناہ بصیرت سے نوازا تھا اور ان کے ہم و فرست اور علم و عرفان کی وجہ سے لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ علمائے وقت میں بھی انتہائی قدر و منزلت کے مالک تھے۔

پشاور کے اس ممتاز عالم اور فقیہ نے ۱۲۷۵ھ کو وفات پائی اور بے شمار لوگ ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ جنازے میں اس بے پناہ ہجوم کو دیکھ کر پشاور کے لوگ حیران ہوتے تھے کہ اتنے آدمی کہاں سے آئے اور انہیں حافظ محمد عظیم کی وفات کا کیسے علم ہوا۔ جنازے میں ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس کی اچھی خاصی نفری وہاں موجود تھی۔

۷۱۔ مولانا محمد علی بھیروی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں بہت سے دیہات اور قصبات کو علما و فقہا کے مراکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان دیہات میں ایک مقام ”بھیرہ“ ہے جو اس نواح میں اچھا خاصا گاؤں تھا۔ بھیرہ میں تیرھویں صدی ہجری میں جو اہل علم نمایاں ہو کر ابھرے، ان میں ایک بزرگ مولانا محمد علی تھے، جن کے والد کا اسم گرامی عبدالحکیم اور دادا کا ابوالنوث

۷۱۔ حدائق الحنفیہ ص ۲۷۸، ۲۷۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

نزهة الخواطر، ج ۱، ص ۲۵۱؛

تھا۔ محمد علی بھیروی اپنے دور کے صوفی اور عبادت گزار عالم تھے فضل و صلاح کے اوصاف سے بہرہ مند تھے اور اعمالِ اعظم گڑھ کے معروف فقہا میں گروانے جاتے تھے۔

محمد علی کا مولد و منشا بھیرہ ہے اور یہیں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور اپنے گرو و نواح کے اساتذہ سے تحصیل کی۔ اس زمانے میں مدراس میں بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محسلی کا غلبہ درس بلند تھا اور بہت سے علما و طلباء ان سے فیض حاصل کر رہے تھے۔ محمد علی نے مدراس کا رخ کیا اور بحر العلوم کے حلقہ شاگردی میں داخل ہو گئے۔ ان سے خوب استفادہ کیا۔

اس کے بعد عازمِ حرمین شریفین ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا، تین سال مدینہ منورہ میں مقیم رہنے اور حرمین کے اساتذہ و مشائخ سے علمِ حدیث پڑھا۔ بعد ازاں واپس وطن آئے اور پوچھے تئیس سال بعد اپنے گاؤں بھیرہ میں داخل ہوئے۔ پھر گھر سے باہر نہیں نکلے اور تمام عمر بھیرہ ہی میں رہے امیر مدراس ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ جب مستقل طور پر بھیرہ میں سکونت اختیار کر لی تو امیر مذکور نے ان کو باقاعدہ ماہانہ وظیفہ دینا شروع کر دیا تھا اور وہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ بلاشبہ مولانا محمد علی بھیروی اپنے عصر اور علاقے کے جلیل القدر عالم اور بلند مرتبہ فقیہ تھے۔

۷۲۔ مولانا محمد علی صدر پوری

مولانا محمد علی بن رمضان علی صدر پوری اپنے دور کے شیخ و فاضل اور نہایت صالح و متدین عالم تھے۔ طبیعت موزوں پائی تھی اور اچھے شاعر تھے۔

۷۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۵۲، ۲۵۳۔

صدر پور ایک گاؤں ہے جو ملج آباد سے متصل مضافاتِ لکنؤ میں واقع ہے، وہی تیرھویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں محمد علی پیدا ہوئے حصولِ علم کے لیے لکنؤ کا عزم کیا، اس زمانے میں لکنؤ میں مرزا حسن علی شافعی لکنؤی کا سلسلہ درس جاری تھا، محمد علی نے ان کے اور دیگر اساتذہ عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مرزا حسن علی سے کتبِ حدیث و تفسیر سماعت و قراءت پڑھیں۔ مولانا بشارت اللہ بہرائچی مجددی سے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت ہوئے۔

مولانا محمد علی صدر پوری نہایت متقی اور پرہیزگار عالم تھے، علومِ فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اشاعتِ سنت اور ردِ بدعت میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ ۱۲۵۸ھ میں ٹونک تشریف لے گئے اور اس نواح کے امیر نواب وزیر محمد خاں بہادر نصرت جنگ کے ملازمین و مصاحبین میں شمولیت اختیار کی۔ امیر موصوف نے ان کو اپنے بیٹوں کی مجالست و مصاحبت پر مقرر کر دیا۔ پھر آخر عمر تک وزیر الملک نواب محمد علی خان بہادر صولت جنگ کے حلقہ ملازمت میں رہے۔

اس نامور عالم دین نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں :-

- ۱ - آثارِ محشر :- یہ کتاب منظوم ہے اور آثار و احوال قیامت سے متعلق ہے۔
- ۲ - وقائع احمدی :- سید احمد شہید بریلوی کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔
- ۳ - ترجمہ حقیقۃ الاسلام :- قاضی شہار اللہ پانی پتی کی کتاب کا ترجمہ۔

۴ - نصاب گوہر :- منظوم

۵ - نصابِ سدا گوہر -

۶ - مصدر الفیوض -

۷ - مفتاح المخازن -

۸ - کنز المصادر -

۹ - رکاز المداہیت - مسائل فقہ پر محیط ہے۔

۱۰۔ مثنوی تحفۃ الاخبار۔

۱۱۔ مثنوی تحفۃ الاصحاب۔

۱۲۔ قصائد در حمد و نعت۔

۱۳۔ مثنوی عبرت افزا۔ یہ ایک دین دار اور نیک نحت بیوی کا قصہ ہے۔

۱۴۔ عنایۃ الاشرار۔

ان رسائل و کتب کے علاوہ بھی کچھ رسائل ان سے یادگار ہیں۔

مولانا محمد علی صدر پوری نے ۱۵۔ رجب ۱۲۸۹ھ کو نصف شب

کے وقت وفات پائی^{۵۸}۔

۳۔ مفتی محمد عوض بریلوی

رائے بریلی صوبہ یوپی (ہندوستان) کا ایک مشہور شہر ہے جو صدیوں سے
علماء و فضلا کا مرکز اور صوفیاء و اقلیاء اور فقہاء و صلحا کا مسکن چلا آ رہا ہے۔ اس شہر
میں بے شمار اہل کمال پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف ہندوستان ہی میں
علم و فضل کی روشنی پھیلائی بلکہ اس برصغیر سے باہر کے لوگوں کو بھی متاثر کیا۔ یہی
وہ شہر ہے جس کی خاک سے امیر المجاہدین سید احمد شہید اٹھے اور اس برصغیر
کے لوگوں کے دلوں میں جہاد کی شمع روشن کی۔ ان کا دور تیرھویں صدی ہجری
کا ہے۔

تیرھویں صدی ہی میں یہاں ایک بزرگ مفتی محمد عوض بریلوی پیدا ہوئے۔
جو اپنے دور کے عالم و شیخ اور فقیہ نامدار تھے اور اس عہد کے مشاہیر علماء میں
ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے والد مفتی درویش محمد تھے جو اپنے علم و ادراک کی
بنا پر رائے بریلی کے منصب افتا پر فائز تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے

^{۵۸} تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۳، ۲۰۴۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۵۷، ۲۵۸۔

بیٹے مفتی محمد عوض نے باپ کی جگہ سنبھالی اور منصب افتا پر فائز ہوئے۔
مفتی محمد عوض جہاں افتا اور علم و فضل میں یکساں تھے، وہاں زہد و عبادت
اور صلاح و تقویٰ میں بھی اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ مسائل میں مرجع خلافت تھے۔
اور دین کو سمجھنے کے لیے کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔
مفتی صاحب مدوح نے ۱۲۲۰ھ کو وفات پائی ۱۵۹

۷۷۔ مولانا محمد غفران رام پوری

مولانا محمد غفران بن ملا تائب آخون بن حافظ سعد اللہ خاں رام پوری۔
مولانا محمد غفران رام پوری جنھیں ان کے علم و فضل کی وجہ سے ملا محمد غفران
کہا جاتا تھا، اپنے دور کے بہت بڑے فقیہ اور عالم اجل تھے۔ یوپی (سہدوان)
کے مشہور شہر رام پور میں سکونت پذیر تھے اور نسلی اعتبار سے "ترانس خیل"
افغانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۶۰ھ کے لگ بھگ رام پور میں پیدا ہوئے
اور اپنے عہد کے بعض ممتاز علما سے استفادہ کیا۔ ملا فقیر آخون افغانی کے
شاگرد اور مرید تھے۔ ان سے علم فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ فقہ میں ان
کے عبور و مہارت کا یہ عالم تھا کہ پورے ایک سو جزیں فقہی فتاویٰ تحریر کیے۔
یہ فتاویٰ "جنگ" کے نام سے موسوم ہیں اور قلمی صورت میں رام پور کی رضا
لائبریری میں محفوظ ہیں۔ لفظ "جنگ" کا اطلاق ایک بڑی اور مبسوط بیاض پر
ہوتا ہے۔

ان کے والد ملا تائب آخون بہت متقی اور پرہیزگار عالم تھے متعدد لوگوں
نے ان سے علم حاصل کیا اور ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے۔ تائب کے
معنی تو بہ کرنے والا اور آخون کے معنی معلم اور استاد کے ہیں اور واقعہً

۱۵۹ نزہۃ الخواطر ج ۱، ص ۲۵۹ بحوالہ تاریخ فرخ آباد۔

علا تائب آخون اسم بامستی تھے۔

مولانا محمد غفران رام پوری کا وسیع حلقہ درس تھا، بہت سے مشہور اور نامور طلباء و علمائے ان کے دامن تربیت میں رہنے کی سعادت حاصل کی اور ان سے فیض پایا۔

اس زمانے کا ہندوستان تحقیق و تدقیق اور درس و تدریس کے میدان میں خاص شہرت رکھتا تھا اور جگہ جگہ علمائے ہند کے مدارس جاری تھے، جن میں دور دور سے آکر لوگ مستفید ہوتے تھے۔ مولانا محمد غفران رام پوری کا اسم گرامی بھی اپنی بلند مرتبت اساتذہ و معلمین میں شامل ہے، جنہوں نے ہر حال میں علم کی شمع جلائے رکھی اور جو فضل و کمال میں یگانہ دہر ہوتے یسدا حنفی تھے۔

نواب صدیق حسن خاں نے مولانا محمد غفران رام پوری کا تذکرہ اپنی مشہور تصنیف "ابجد العلوم میں کیا ہے اور انہیں المعروف بروایت کش" لکھا ہے۔

مولانا محمد غفران نے سو سال کی عمر پائی اور ۱۲۶۰ھ میں حنبت کی راہ لی۔

۵۔ مولانا محمد غوث مدراسی

مولانا محمد غوث بن ناصر الدین بن نظام الدین بن عبداللہ مدراسی فقہی مسک کے اعتبار سے شافعی تھے اور اپنے دور کے مشہور شیخ اور عالم تھے اور ممتاز فقہائے ہند میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا محمد غوث مدراسی ۱۱۶۶ھ کو علاقہ آرکاٹ کے ایک مقام محمد پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد علم و فضل کی دولت سے آراستہ اور زہد و تقویٰ کی نعمت سے مالا مال تھے۔ محمد غوث نے ہوش سنبھالا تو اپنے جد امجد مولانا نظام الدین سے تحصیل علم کا آغاز کیا اور کافی عرصہ ان سے اخذ فیض

۵۔ کہتے ہیں ص ۲۰۵، ۲۰۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۲۵۔ ابجد العلوم ج ۳ ص ۲۵۹

کرتے رہے۔ حدیث کی سند اپنی سے لی۔

مولانا نظام الدین کی وفات کے بعد مولانا امین الدین صدیقی اہوری کی خدمت میں گئے اور ان سے اکتسابِ علم میں مشغول ہوئے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں مولانا امین الدین صدیقی محمدپور میں فروکش تھے۔ پھر جب انھوں نے صوبہ مدراس کے ایک اور شہر امانات کا عزم کیا تو محمد غوث ان کے ساتھ روانہ ہو گئے اور ان سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں۔

پھر جب مولانا امین الدین صدیقی اہوری انتقال کر گئے تو محمد غوث مدراس کو روانہ ہوئے۔ مدراس میں ان دنوں بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلّی کا سلسلہ درس جاری تھا اور بہت سے طلبان سے حصولِ علم میں مشغول تھے۔ محمد غوث بھی بحر العلوم سے وابستہ ہو گئے اور ان سے اخذِ علم کرنے لگے اور پھر انہی سے سند فراغت حاصل کی۔

اسی زمانے میں انھوں نے مدراس کے نواب والا جاہ کے بیٹے امیر الامرا سے تقرب پیدا کیا اور اس کے لڑکے عظیم الدولہ کے استاد مقرر ہوئے امیر الامرا کی وفات کے بعد عدل و قضا کا محکمہ ان کے سپرد ہوا، اور انھیں احکام شریعی کی تنفیذ پر مامور کیا گیا۔ پھر جب والا جاہ کے بیٹے عمدۃ الامرا کا عہد آیا تو یہ اس خدمت سے معزول ہو گئے اور حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ یہ ۱۲۱۳ھ کا واقعہ ہے۔

بعد ازاں جب عظیم الدولہ برسرِ اقتدار آیا تو مولانا محمد غوث پھر واپس مدراس آ گئے اور عظیم الدولہ نے انھیں منصبِ وزارت پر فائز کیا اور شرف الدولہ، شرف الملک غالب جنگ کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ یہ ۱۲۱۶ھ کا واقعہ ہے۔ ۱۲۲۳ھ تک اس عہدے پر متمکن رہے۔ اس کے بعد معزول کر دیے گئے۔ مولانا محمد غوث مدراسی شافعی نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام درج ذیل ہیں :-

۱۔ نثر المرجان فی رسم نظم القرآن :- دو جلدوں میں۔

۲۔ الفوائد الصغیہ فی شرح الفرائض السراجیہ۔

۳۔ سواطع الانوار فی معرفۃ اوقات الصلوٰۃ والاسحار۔

۴۔ بسط الیٰدین لاکرام الالبون۔

۵۔ رجوزۃ فی القاب سیّدنا علی رضی اللہ عنہ۔

۶۔ کفایۃ المبتدی فی الفقہ الشافعی :- شافعی فقہ سے متعلق۔

۷۔ زواج الارشاد الی اهل دارالجمہاد۔

۸۔ تعلیقات علی مختصر ای شجاع۔

۹۔ تعلیقات علی نظر الندی۔

۱۰۔ مسائل فی الفقہ الشافعی۔

۱۱۔ النصف الاخر من الکافی :- کافیہ کا اختصار۔

۱۲۔ حواشی علی القاموس :-

۱۳۔ الشافی شرح الکافی :- علم نحو کی مشہور کتاب کا فنیہ کی شرح جو نامکمل رہی۔

۱۴۔ النجم الوقاد شرح قصیدۃ بانم سعاد۔

۱۵۔ وسائل البرکات شرح دلائل الخیرات :- نامکمل رہی۔

۱۶۔ نخبور النوائد :- میراث کے بارے میں۔

یہ سولہ کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ اب ذیل میں بارہ کتابوں کے نام

درج کیے جا رہے ہیں جو فارسی زبان میں ہیں :-

۱۔ انہار المفاخر فی مناقب السید عبد القادر۔

۲۔ البواقیت المنشورہ فی الاذکار الماثورہ۔

۳۔ بسائم الاذہار فی الصلوٰۃ علی سید الابرار۔

۴۔ ہدایۃ الغوی الی المنہج السوی :- یہ کتاب طب نبوی کے موضوع

پر ہے۔

- ۵ - خواص الحيوان -
- ۶ - رثعات الاعمى في تحقيق الحقيقة والمجاز -
- ۷ - رساله در رد خواجہ کمال الدین -
- ۸ - آمدن -
- ۹ - برهان الحکمہ توجیہ ہدایۃ الحکمہ -
- ۱۰ - الفتاویٰ النا صریہ فی فقہ الحنفیہ -
- ۱۱ - خلاصۃ البیان فی شرح عقیدۃ عبد الرحمن (عبدالرحمن جامی مراد ہیں)
- ۱۲ - زبدۃ العقائد -

فقہ احناف کے بارے میں ایک رسالہ اردو زبان میں تحریر فرمایا۔
مولانا محمد غوث مدرا سی بہت بڑے شافعی عالم و فقہ اور مصنف تھے۔
انھوں نے انوار کے روز ۱۱ - صفر ۱۲۳۸ھ کو وفات پائی۔

۷۶ - مولانا محمد قاسم نانوتوی

تیسویں صدی ہجری کے ہندوستان کے اعظم رجال میں حضرت مولانا
محمد قاسم نانوتوی کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کا شمار اپنے دور کے فحول
علماء میں ہوتا ہے۔ مروجہ علوم کے تمام گوشوں پر ان کو عبور حاصل تھا اور
منقول و منقول میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادبیات، بیان
معانی، منطق و فلسفہ اور حساب و ریاضی وغیرہ سہرہ پران کی نگری اور
عمیق نظر تھی۔

اللہ اس سے خواجہ کمال الدین قادیانی مراد نہیں ہے۔ ایک اور خواجہ کمال الدین مراد ہے۔

اللہ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۵۹، ۲۶۰۔

ولادت اور ابتدائی حالات

مولانا ممدوح صوبہ یونی کے ضلع سہارن پور کے مردم خیز علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں کے ایک قصبہ نانوتہ کے باشندے تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ اسد علی اور دادا کا غلام شاہ تھا۔

آپ ماہ شعبان (یا رمضان) ۱۲۴۸ھ میں بمقام نانوتہ پیدا ہوئے۔ ان کا تارکھی نام خورشید حسین ہے۔ ان کے والد شیخ اسد علی مولانا مملوک علی نانوتوی کے ہم عمر تھے اور حصول علم کے لیے ان کے ساتھ دہلی بھی گئے تھے، لیکن ذہنی طور پر علم سے لگاؤ نہ تھا، اس لیے فارسی کی چند کتابوں کے علاوہ اور کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ دہلی سے واپس نانوتہ آگئے اور کاشت کاری میں مشغول ہو گئے۔ علم سے اس بیگانہ شخص کو اللہ تعالیٰ نے محمد ناسم کی صورت میں ایک ایسے گوہر شب چراغ سے نوازا جس کی صنیا پاشیوں سے ایک عالم مستنیر ہوا۔

حصولِ علم کا دور

اس بلند بخت عالم دین نے حصول علم کا آغاز اپنے مولد و مسکن نانوتہ میں کیا اور وہیں قرآن مجید پڑھا اور وہیں ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد انھیں دیوبند بھیج دیا گیا۔ دیوبند میں اس زمانے میں دو بزرگوں کی شہرت تھی، ایک مولوی منتاب علی کی اور دوسرے شیخ نہال احمد کی۔ مولانا محمد ناسم نے ان دونوں حضرات سے حصول علم کیا۔ مولانا ممدوح کے نانا سہارن پور میں مقیم تھے اور وہاں وکالت کرتے تھے۔ مولانا دیوبند سے نانا کے پاس سہارن پور چلے گئے۔ وہاں مولوی محمد نواز سے عربی کی بعض ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۵۹ھ میں جب کہ محمد ناسم کی عمر صرف گیارہ بارہ برس تھی، نانا کا انتقال ہو گیا۔ یہ ان کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ تھا، لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور دیوبند اور سہارن پور کے بعض اساتذہ سے مسرور استفادہ رہے۔

اس زمانے میں دیار ہند کے معروف عالم مولانا مملوک علی دہلی کالج کے شعبہ عربی کے صدر مدرس تھے۔ وہ ۲۰- محرم ۱۲۶۰ھ کو محمد قاسم اور اپنے بیٹے محمد یعقوب کو دہلی لے گئے اور ۳- محرم کو مولانا نانوتوی نے علم نحو کی مشہور کتاب "کافیہ" پڑھنا شروع کی۔ قیام دہلی کے دور میں انہوں نے علوم متداولہ کی تکمیل مولانا مملوک علی اور مفتی صدر الدین سے کی اور علم حدیث کی تحصیل مولانا احمد علی سہارن پوری اور شاہ عبدالغنی مجددی سے کی۔ بعض اساتذہ سے حساب و ریاضی اور اقلیدس کی کتابیں پڑھیں۔ غرض علوم مرتوجہ میں خوب مہارت پیدا کی اور ہر گوشہٴ فن سے بہرہ ور ہوئے۔

مطبع احمدی سے تعلق ملازمت

مولانا احمد علی سہارن پوری ۱۲۶۲ھ میں حج کے بعد حجاز سے واپس آئے تو دہلی میں مطبع احمدی قائم کیا۔ مولانا نانوتوی نے طالب علمی کے زمانے میں مطبع احمدی سے تعلق ملازمت اختیار کر لیا تھا اور کتب حدیث کی تصحیح کا کام ان کے سپرد تھا۔ غالباً اسی زمانے میں انہوں نے مولانا احمد علی سے سنن ابوداؤد پڑھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اس زمانے میں مولانا نانوتوی کے ہم درس تھے جو چار سال حصول تعلیم کے لیے دہلی میں مقیم رہے اور ۱۲۶۵ھ میں فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن گنگوہ واپس تشریف لے گئے۔ ۱۲۶۵ھ کے لگ بھگ مولانا نانوتوی نے بھی مرتوجہ تعلیم مکمل کر لی تھی۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

۶۳ھ دہلی کالج دراصل "مدرسہ غازی الدین" کا نام ہے۔ یہ مدرسہ نظام الملک آصف جاہ اول کے والد غازی الدین فیروز جنگ (متوفی ۱۲۱۲ھ) نے دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر قائم کیا تھا۔ دسے کی عمارت کے ساتھ ایک خوب صورت مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور قریب ہی مقبرہ بنو ایاجاں وہ غرودفن ہوئے۔ اس مدرسے کا دوسرا دور ۱۲۹۲ھ میں شروع ہوا۔ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا جسے جنگ زادی ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کی مشہور درس گاہ سمجھا جاتا تھا۔

مطبع احمدی سے مولانا ناتو توی کا تعلق ملازمت کب تک قائم رہا؟ اس کے متعلق یقینی طور سے تو کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ۱۸۵۶ء (۱۲۷۳ھ) کے انقلاب تک یہ مطبع دہلی میں قائم رہا، غالب گمان یہ ہے کہ اسی وقت تک مولانا ناتو توی اس سے منسلک رہے۔

دہلی میں سلسلہ تدریس

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا ناتو توی نے دہلی میں کچھ عرصہ تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ مفتی صدر الدین آزادہ ان کے استاد تھے اور مدرسہ دارالبقا میں پڑھاتے تھے۔ مولانا ناتو توی کی خدمات بھی انہوں نے اس مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے حاصل کر لی تھیں لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مولانا ممدوح کا تعلق تدریس اس مدرسے سے کتنا عرصہ قائم رہا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ٹھوڑی مدت ہی مدرسہ دارالبقا میں مدرس رہے۔ اس زمانے میں تدریس کے ساتھ ساتھ وہ مطبع احمدی میں بھی کتب حدیث کی تصحیح کے فرائض سرانجام دیتے تھے یعنی ایک ہی وقت میں تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا اور تصحیح کا بھی۔

صحیح بخاری کا تشبیہ

مولانا احمد علی سہارن پوری نے دہلی میں جو مطبع احمدی قائم کیا تھا، اس کے ذریعے انہوں نے کتب حدیث کی نہایت قابل قدر خدمات انجام دیں۔^{۶۲} جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، مولانا محمد قاسم ناتو توی مطبع احمدی سے منسلک تھے اور مولانا احمد علی کے لائق تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ استاذ محترم کے فرمان کے مطابق وہ کتب حدیث کی تصحیح پر مامور تھے۔ استاد اپنے اس شاگرد کی قابلیت اور حدیث سے متعلق ان کی ژرف نگاہی سے بخوبی آگاہ تھے، چنانچہ صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کی تشبیہ نویسی کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔

^{۶۲} مولانا احمد علی سہارن پوری کے حالات کو یہ ملاحظہ ہو فقہائے پاک و ہند تیسویں صدی ہجری جلد اول ص ۸۴۲۔

بعض حضراتِ علمائے جو مولانا ناتوتوی کی صلاحیتوں سے واقف نہ تھے، اس پر اعتراض کیا اور مولانا احمد علی سے کہا کہ ان پانچ پاروں کے بعض مباحث نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور نوجوان محمد قاسم بطریق احسن اس سے عمدہ برآء ہو سکیں گے، لیکن مولانا احمد علی اپنی رائے پر قائم رہے اور یہ کام اپنے اسی شاگرد سے کرایا۔ جب تحشیہ مکمل ہو گیا تو ان حضرات کو دکھایا گیا اور انھوں نے اس کی بے حد تحسین کی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا احمد علی صاحب نے تحشیہ بخاری میں ابتدا ہی سے مسائل میں مذہبِ حنفیہ کی تائید کا التزام کیا تھا اور آخری پانچ پاروں میں جو مولانا ناتوتوی کے سپرد کیے گئے تھے، اس قسم کے مقامات آتے ہیں، جہاں امام بخاری نے مذہبِ حنفیہ کے بعض مسائل کو حدیث کی رو سے محلِ اعتراض ٹھہرایا ہے۔ جو حضرات مولانا ناتوتوی کو یہ کام تفویض کرنے پر معترض تھے، ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مولانا ناتوتوی اس انداز سے یہ فریضہ انجام نہیں دے سکیں گے، جس انداز سے مولانا احمد علی آغاز سے دیتے آئے ہیں۔ لیکن مولانا ناتوتوی اس باب میں استاد کے نقشِ قدم پر چلے اور اسی اسلوب سے تحشیہ لکھا جس اسلوب سے استاد مکرم شروع سے لکھتے آئے تھے، اور بلاشبہ ایک نوجوان اور اس میدان میں بظاہر نووارد کے لیے یہ بہت مشکل مرحلہ تھا جو انھوں نے استاد محترم کے حسبِ منشا بطریق احسن طے کیا اور اس میں اپنے مسک کی پوری ترجمانی کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اسی کو شروع ہوئی تھی۔ اس سے تین چار

ماہ بعد سہارن پور کے ایک انگریز حاکم مسٹر سپنکی (SPANKIE) نے سہارن پور اور اس کے نواح میں مسلمانوں پر شدید مظالم ڈھائے، جس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ اشتعال کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تھانہ بھون (ضلع مظفرنگر) کے رئیس قاضی عنایت علی کے بھائی قاضی عبدالرحیم اپنے چند احباب کی معیت میں کسی کام سے سہارن پور گئے تو وہاں کے ایک ہندو نے جو کانتھ تھا، مسٹر سپنکی

کے ہاں جا کر کہا کہ یہ لوگ ہاتھی خریدنے کے لیے آئے ہیں، ہاتھی خرید کر دہلی جاتیں گے اور وہاں انگریزوں کے خلاف جہاد کریں گے۔ مسٹر سپنکی نے ان کو بلایا اور سہارن پور میں ان کی آمد کے بارے میں حقیقت حال معلوم کرنا چاہی، لیکن ان لوگوں کے جواب اس کے نزدیک قابل اطمینان نہ تھے۔ اس پر قاضی عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس سے تھانہ بھون، دیوبند اور دیگر قصبات و دیہات میں انگریزوں کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی امداد اللہ مہاجر کی، حافظ محمد صنمان، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد تقم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ حضرات نے تھانہ بھون میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی، اس مجلس میں مولانا محمد حسن نانوتوی بھی شامل تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ کو جہاد نہیں سمجھتے تھے اور انگریزوں کے نقطہ نظر کے حامی تھے۔ اس مجلس کے شرکاء میں سے مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف اظہار رائے کیا اور فرمایا کہ جب قاضی عنایت علی عام جنگ کے دوران خاموش رہے

۶۵ مولانا شیخ محمد، تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر، یوپی) میں ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام ظہور احسن ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن تھانہ بھون میں پائی، قرآن مجید بھی وہیں حفظ کیا۔ اس کے بعد دہلی گئے اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم دینیہ کی تحصیل کی اور سند سے مفتخر ہوئے۔ حضرت میاں جیونور محمد جھنجھانوی کے حلقہ بیعت میں شمولیت کی۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں وفات پائی۔ مولانا مدوح کے مفصل حالات ان کے رسالہ "تحقیق و خدمت الوجود والشہود" کے ساتھ مولوی ثناء الحق (ایم، اے) نے شائع کیے ہیں۔ مولانا شیخ محمد تھانوی کی تصنیفات میں ارشاد محمدی، بیاض محمدی، انوار محمدی اور دفتر ہفتہ مشنوی مولانا ناروم شامل ہیں۔

اور اس مجلس حاضرین میں سے بھی کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جب کہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جاسکتا ہے۔^{۶۶}

مولانا محمد احسن نے مولانا شیخ محمد تھانوی کی تائید کی۔ اس پر ان کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی نے مولانا محمد احسن کو ڈانٹا۔ آخر فیصلہ جہاد کے حق میں ہوا، مولانا محمد احسن نانوتوی آگے۔^{۶۷}

تھانہ بھون کی مجلس مشاورت کے بعد ان حضرات نے حاجی امداد اللہ صاحب کو امیر جہاد مقرر کیا اور شاملی (ضلع مظفرنگر) میں انگریزوں کے خلاف میدان جہاد میں اترے۔ حافظ محمد ضامن، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی نے خوب داد و شجاعت دی۔ حافظ محمد ضامن نے شاملی کے میدان جنگ میں مرتبہ شہادت پایا اور دیگر حضرات شدید مقابلے کے بعد واپس آگئے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد حالات نے انگریزوں کے حق میں پلٹا کھایا تو انھوں نے مسلمانوں سے سخت انتقام لیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) کو ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے، مولانا رشید احمد گنگوہی چھ مہینے جیل میں بند رہے، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے، مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولانا محمد مظہر نانوتوی روپوش ہو گئے (میدان جنگ میں مولانا محمد مظہر نانوتوی کے تختے میں گولی لگی تھی، اور وہ زخمی ہو گئے تھے) قاضی عنایت علی پہاڑوں میں جا کر چھپ گئے۔

^{۶۶} وحدت الوجود والشہود (ص، ۵۱) میں مولانا شیخ محمد تھانوی کا یہ ارشاد منقول ہے۔ نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے بظاہر تو اس کو جہاد کا درجہ نہیں درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

^{۶۷} مولانا محمد احسن نانوتوی "راز ڈاکٹر محمد ایوب قادری" صفحہ ۴۵

روپوشی اور حج بیت اللہ

یہ زمانہ نہایت خطرناک تھا اور ہر شخص آزمائش و ابتلا کا شکار تھا۔ اس دور پر خطر میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مولانا نالوتوی نے وارنٹ گرفتاری کے بعد انتہائی احتیاط سے کام لیا، تین دن تو وہ ایک گھر میں بند رہے، اس کے بعد مختلف علاقوں اور قصبات و دیہات میں گھومتے رہے، اس لیے کہ دشمن تعاقب میں تھا اور اس کے ذرائع تلاش جستجو بہت وسیع تھے۔ ہر مقام پر مجرب بیٹھے تھے اور کسی ایک جگہ پر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنا ہی قرین مصلحت تھا۔ بعض مقامات پر خود انگریزی پولیس کے افسروں سے جو مولانا کی تلاش میں تھے، مولانا کی گفتگو بھی ہوئی، بلکہ دیوبند کی مسجد چھتہ میں آکر تو خود انہوں نے مولانا سے پوچھا کہ ”مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟“ انہوں نے دو قدم آگے بڑھا کر اس جگہ کی طرف جہاں وہ پہلے کھڑے تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”ابھی یہیں تھے۔ دیکھ لیجیے۔“ یہ ایک بہت بڑے حاضر دماغ اور حاضر جواب سیاست دان ہی کا جواب ہو سکتا ہے، ورنہ عام لوگ تو ایسے مواقع پر ہوش کھو بیٹھتے ہیں اور تلاش کنندگان ان کے چہرے کے آثار ہی سے سمجھ لیتے ہیں کہ اصل شخص یہی ہے اور اسے بکڑ لیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ان کے برادر نسبتی شیخ نہال احمد انہیں اپنے گاؤں چکوالی لے گئے جو نالوتہ اور دیوبند کے درمیان واقع ہے۔ پولیس کے لوگ ان کی تلاش میں وہاں پہنچے تو ان کے لیے خود ہی چائے تیار کی اور پھر خود ہی مولانا محمد قاسم کی ”تلاش“ میں نکل کھڑے ہوئے اور گرفتاری سے بچ گئے۔ یہ ان کی فہم و فراست کی انتہا تھی، بروقت کوئی بات سمجھ جانا اور اپنے آپ کو چاروں طرف پھیلے ہوئے خطرے سے بچا لینا، بہت بڑی بات ہے۔ ان کی اس قسم کی باتیں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے بھی تحریر فرمائی

ہیں۔ مولانا گیلانی مرحوم طویل الذیل عالم تھے اور ان کا انداز نگارش کچھ اور ہی قسم کا ہے۔

مولانا نانوتوی بہر حال انسان تھے اور اپنے دور کے بہت بڑے انسان تھے اور ہر انسان اپنے آپ کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، مولانا نے بھی یہ کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نانوتوی کم و بیش ساڑھے تین سال روپوش ہے اور یہ ان کے لیے انتہائی آزمائش کا زمانہ تھا جو انہوں نے مختلف مقامات میں گزارا۔ ان مقامات میں بوڑیہ، گنڈلہ، لاڈوہ، نچلا سہ، دیوبند، نالوتہ اور چکوالی وغیرہ مقامات شامل ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ کتنی تکلیفوں سے دوچار ہوتے ہوں گے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھاگ دوڑیں انہیں کس قدر ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچی ہوگی۔ لیکن یہ سب تکلیفیں اور اذیتیں انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ یہ ان کی عظمت و عزیمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

روپوشی ہی کے دور میں ۱۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء) کو وہ اپنے وطن نالوتہ سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے رفیق سفر تھے۔ نالوتہ سے کراچی تک کا سفر انہوں نے مختلف ذرائع سے طے کیا اور پھر ساحل کراچی سے سرزمین حجاز کو روانہ ہوئے۔ یہ اس عظیم المرتبت عالم دین کا پہلا سفر حج تھا۔

اعلان معافی

۲۔ اگست ۱۸۵۸ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست ہندوستان پر ملکہ وکٹوریہ کے قبضے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے دو مہینے

بعد یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء کو الہ آباد میں لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کا وہ معافی نامہ پڑھ کر سنایا جس کی رُو سے ۱۸۵۷ء کے ”غدر“ میں حصہ لینے والے ”مجرموں“ کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ جو لوگ اس منہگامے میں شریک ہوئے تھے، حکومت انگریزی کی طرف سے ان کی گرفتاری کا اب کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا لیکن اس میں یہ استثنا بھی تھا کہ ”جو لوگ انگریزی رعایا کے قتل میں شریک ہوئے انھیں رحم کا مستحق نہیں سمجھا جاتے گا“

علاوہ ازیں اس اعلان میں مرقوم تھا کہ :

- ۱۔ جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو۔
- ۲۔ یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں۔
- ۳۔ یا جنھوں نے ترغیب لیاوت دی ہو۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اعلان معافی نامہ میں یہ الفاظ درج تھے کہ ”ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی، لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر، جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے، کامل عذر کیا جائے گا“

بہر حال اس معافی نامہ کے مشتہر ہونے کے دو سال بعد ۲ نومبر ۱۸۶۰ء کو مولانا ناتوتوی اپنے وطن نانوتہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے۔

حج سے واپسی

۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو مولانا ناتوتوی حج بیت اللہ سے واپس وطن تشریف لائے۔ اب حالات کسی حد تک سازگار ہو چکے تھے اور ملک کی سیاسی فضا میں وہ تلخی باقی نہ رہی تھی جو پچھلے عرصہ پہلے تھی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ قمری حساب سے ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ کو وہ حج کے لیے نانوتہ سے روانہ ہوئے تھے اور کراچی کی بندرگاہ سے عزم حجاز کیا تھا، تقریباً ایک سال بعد ربیع الاول ۱۲۷۸ھ کے آخر میں واپسی ہوئی اور بمبئی کے

سامل پر جہاز سے اترے اور وہاں سے چل کر حبسادی الاخریٰ تک نانوہ پہنچے۔
حفظِ قرآن مجید

زمانہ روپوشی اور ایام حج میں ایک بہت بڑا کام یہ ہوا کہ قرآن مجید حفظ کر لیا۔ روپوشی کا دور نہایت پریشانی کا دور تھا اور مستقل طور سے کسی ایک جگہ پر قیام کرنا ممکن نہیں تھا، حج کے دنوں میں بھی کسی ایک مقام پر بیٹھنا مشکل ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس زمانے میں مولانا کو حفظِ قرآن کی نعمت حاصل ہو گئی۔

مطبعِ مجتہبائی میرٹھ کی ملازمت

حج بیت اللہ سے واپس آنے کے بعد مولانا نانوتوی نے مطبعِ مجتہبائی میرٹھ میں ملازمت کر لی۔ یہ مطبع منشی ممتاز علی نے قائم کیا تھا جو شیخ امجد علی کے بیٹے تھے اور اپنے عہد کے مشہور خطاط تھے۔ منقول ہے کہ وہ فنِ خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے اور "نہت رستم" ان کا لقب تھا۔ مولانا نانوتوی سے ان کے تعلقات پہلے ہی سے قائم تھے اور وہ مولانا کی علمی صلاحیتوں سے آگاہ تھے، اسی لیے ان کو اپنے اس مطبع میں ملازم رکھا اور کتابوں کی تصحیح وغیرہ کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اس سے قبل مولانا احمد علی سہارن پوری کے مطبع احمدی میں بھی مولانا نانوتوی یہ خدمت انجام دے چکے تھے اور اس فن کی نزاکتوں کا انہیں بخوبی علم تھا۔

دوسری مرتبہ حج کو روانگی

۱۲۷۸ھ سے ۱۲۸۵ھ تک سات سال مولانا نانوتوی مطبعِ مجتہبائی میرٹھ سے بلسلہ تصحیح کتب والبتہ رہے۔ اس اثنا میں ان کی تمام تر توجہ اسی طرف منتقل رہی اور نہایت اہتمام اور ذمے داری سے اپنے مفوضہ فرائض انجام دیے۔ ۱۲۸۵ھ میں مولانا نانوتوی اور مطبعِ مجتہبائی کے مالک منشی ممتاز علی حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا نانوتوی کا یہ دوسرا حج تھا۔ منشی ممتاز علی

یہ ادارہ ہجرت ہندوستان سے حجاز گئے تھے، اس لیے انہوں نے مطبع مجتہبائی ختم کر دیا تھا۔ لیکن مولانا نانوتوی حج کے بعد واپس وطن آگئے۔

مطبع ہاشمی میرٹھ سے وابستگی

تصحیح وغیرہ کے کام میں مولانا نانوتوی نے پوری طرح مہارت پیدا کر لی تھی اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مطابع کے مالک ان کے کام سے متاثر تھے، لہذا دوسرے حج سے واپس آتے ہی میرٹھ پہنچے تو وہاں کے مطبع ہاشمی سے وابستگی اختیار کر لی اور کچھ عرصہ اس میں مصروف عمل رہے۔

علی گڑھ میں قیام

اسی اثنا میں مولانا عبد الجلیل علی گڑھی (جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف داد شجاعت دیتے ہوئے علی گڑھ میں شہید ہو گئے تھے) کے فرزند گرامی قدر مولانا محمد اسماعیل (متوفی شوال ۱۳۱۱ھ) کو حدیث پڑھانے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں نو مہینے ان کا قیام علی گڑھ میں رہا۔ تراجم علمائے حدیث ہند (صفحہ ۲۲۵) میں مولانا ابویحییٰ امام خان نو شہروی لکھتے ہیں: مولانا (نانوتوی) علی گڑھ تشریف لاتے اور مولانا عبد الجلیل کے بیٹے (مولانا محمد اسماعیل) کو نو مہینے میں صحاح سنہ کا دورہ ختم کر کے واپس چلے گئے، اس مدت کی اجرت بجز نان جوئی کے کچھ قبول نہ فرمائی۔

پھر طبع مجتہبائی میں

منشی ممتاز علی (جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا) ۱۲۸۵ھ میں ہجرت کے ارادے سے حجاز گئے تھے، لیکن انہوں نے وہاں اقامت اختیار نہیں کی۔ دوسرے سال ہی ہندوستان واپس آگئے اور مطبع مجتہبائی دہلی میں قائم کر لیا جو

۶۹ مولانا عبد الجلیل علی گڑھی شہید کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری جلد دوم ص ۵۷ تا ۵۹

”مطبع مجتبیٰ دہلی کے نام سے مشہور ہوا، اس میں تصحیح کتب کے سلسلے میں انہوں نے مولانا نانوتوی کو بھی دہلی بلا لیا۔ اسی اثنا میں انہوں نے یہ مطبع پانچ سو روپے میں مولوی عبدالاحد کو فروخت کر دیا۔ مولانا نانوتوی کچھ عرصہ اس میں کام کرتے رہے۔ اس مطبع سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم سے متعلق بے شمار کتابیں شائع ہوئیں اور کاغذ، کتابت، طباعت، صحت وغیرہ کے سلسلے میں ان کتابوں نے نہایت اہمیت حاصل کی۔

حمائل شریف کی اشاعت

۱۲۸۶ھ میں مطبع مجتبیٰ دہلی میں ایک حمائل شریف شائع ہوئی جس کی کتابت منشی ممتاز علی نے اور تصحیح مولانا نانوتوی نے کی۔ اس حمائل کے بارے میں مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبیٰ دہلی لکھتے ہیں۔

”خداوند! آپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ حمائل شریف اب تیسری دفعہ اس مطبع مجتبیٰ دہلی میں چھپی۔ ایک دفعہ تو منشی ممتاز علی نہایت رقم مہاجر کی گئی تھی اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھی اور قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند نے اس کی تصحیح فرمائی۔“

مولانا نانوتوی نے اس حمائل کی طباعت سے متعلق دو قطعے تاریخ رقم کیے جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، پہلا قطعہ فارسی میں ہے۔

حمائل کز شرف دار و شرف بر حاصل کاہنا

کہ امیں جا است بر جاں است صد گونہ بلا زانہا

نوشت و طبع زون نہ ہست رقم ممتاز علی قاسم

حیض بودہ ان گردید تعبیر دین و جانہا

دوسرا قطعہ تاریخ اردو میں ہے جو یہ ہے۔

چھاپی وہ حمائل کہ اگر جان کے لب ہوں

بے ساختہ بول اٹھے کہ مرغوب تھی ہے

میں نے بھی کہا درج میں اور کیونکر نہ کہیے

کہتے ہیں تکرار عدد خوب چھپی ہے

ایک راحت دل پر ہے مضافاً
کیا کہنے کے بہت خوب ہی چھاپی
کیا لکھی کیا عمدہ خوش اسلوب چھپی ہے
کیا کہنے میں پاکیزہ بہت خوب چھپی ہے

۱۲۸۶
مطبع مصطفائی میں

مطبع مصطفائی منشی ممتاز علی نے حجاز سے واپس آکر دہلی میں قائم کیا تھا اور
تصحیح کتب کے لیے انھوں نے مولانا ناتو توئی کو بھی دہلی بلا لیا تھا۔ لیکن یہ معلوم نہیں
ہو سکا کہ وہ کتنا عرصہ مطبع مصطفائی میں خدمات انجام دیتے رہے۔

بہر حال مولانا مدوح نے علی الترتیب مطبع احمدی، مطبع مجتہبی، مطبع ہاشمی اور
مطبع مصطفائی میں سا لہا سا ل تک تصحیح کتب کا کام کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی
لکھتے ہیں: ”معاشی جدوجہد سے آپ نے بہر حال اپنے آپ کو بے تعلق نہیں
رکھا۔ مختلف قرائن و قیاسات کی بنا پر میرا اندازہ یہی ہے کہ ایک کم پچاس کی عمر
گراں مایہ میں سے تقریباً چالیس اثنالیس سال کی عمر تک آپ مذکورہ بالا مختلف
مطابع یعنی احمدی، مجتہبی، ہاشمی، مصطفائی میں علی الترتیب تصحیح کی خدمات انجام
دیتے رہے۔“

۲۹
مولانا گیلانی کے اس متن کی تشریح یہ ہے کہ مولانا ناتو توئی نے کل اچاس سال
عمر پائی اور اس مختصر عمر میں سے چالیس اثنالیس سال مختلف مطابع میں تصحیح کتب کی
خدمت انجام دی۔ اس حساب سے انھوں نے نو دس سال کی عمر میں
تصحیح کا کام شروع کر دیا تھا۔

واقعات کی رُو سے مولانا گیلانی کا یہ فرمان قرین صحت نہیں مولانا ناتو
کی ولادت ۱۲۳۸ھ میں ہوئی۔ محرم ۱۲۶۰ھ کو وہ (بارہ سال کی عمر میں) مولانا
ملوک علی کے ساتھ حصول علم کے لیے دہلی گئے اور کافی پڑھنا شروع کیا۔
۱۲۶۲ھ میں مولانا احمد علی سہارن پوری حج کے بعد حجاز سے واپس آئے اور

دہلی میں مطبع احمدی قائم کیا۔ اس کے بعد مولانا ناتوتوی ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے اور ان سے سنن ابوداؤد پڑھی۔ ۱۲۶۵ھ کے پس و پیش میں وہ فارغ التحصیل ہوئے جب کہ ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اگر طالب علمی کے زمانے ہی میں مطبع احمدی سے تعلق ملازمت اختیار کر لیا ہو اور تصحیح کتب میں مشغول ہو گئے ہوں، جب بھی ۱۲۶۴ھ کے لگ بھگ انہوں نے یہ کام شروع کیا، اس حساب سے وہ کم سے کم اس وقت پندرہ یا سولہ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ ظاہر ہے ان کی قابلیت و صلاحیت سے متاثر ہو کر ہی مولانا سہارن پوری نے اس اہم ذمہ داری پر انہیں مامور کیا ہوگا۔ نو دس سال کی عمر کے بچے کے سپرد اتنا اہم کام نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا ناتوتوی بہت ذہین اور نہایت صاحبِ فراست تھے، تاہم جب تک متعلقہ کتابوں کے متون پر پوری نظر نہ ہو اس قسم کے بڑے کام پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں ہوتا۔

ماہانہ آمدنی

مذکورہ بالا مطابع سے اس اہم خدمت کی جو ماہانہ آمدنی مولانا ناتوتوی کو ہوتی تھی، وہ چار پانچ روپے تھی۔ موجودہ دور کے حساب سے اس کو آمدنی یا تنخواہ سے تعبیر کرنا آمدنی اور تنخواہ کا مذاق اڑانا ہے۔ لیکن آج سے کہ پیش و پڑھ سو سال قبل کے حالات کی رو سے دیکھا جائے تو چار پانچ روپے فی الواقع اپنے اندر ایک وزن رکھتے تھے۔ زندگی سادہ تھی اور زمانہ بہت سستا تھا، پھر علمائے دین کے دلوں میں خلوص کا لہ پناہ داعیہ کار فرما تھا اور وہ تھوڑے کو بہت سمجھنے کے عادی تھے۔ وہ کوئی کام پیسے کے لیے نہیں کرتے تھے، نیکی سمجھ کر کرتے تھے اور ان کے ذہن و قلب پر ہر آن خشتِ الہی اور اللہیت کا جذبہ طاری رہتا تھا۔

لکھ سوانح قاسمی، ج ۱، ص ۵۳۸

دیوبند میں دارالعلوم کا قیام

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے اسلامی مدارس شدید نقصان سے دوچار ہوئے۔ متعدد علمائے دین کو انگریزوں نے پھانسیوں پر لٹکا دیا بعض کو کالے پانی کی سزا دی گئی اور کچھ حضرات ملک سے ہجرت کر کے سرزمین حجاز میں جا بے۔ ان نازک حالات میں چند علما و زعمائے جن میں مولانا فضل الرحمن، مولانا ذوالفقار علی، حاجی عابد حسین، مولوی مہتاب علی اور شیخ مہال احمد شامل تھے، صنم سہارن پور کے مشہور مقام دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ (۲۰ مئی ۱۸۶۷ء) کو دیوبند کی چھتہ والی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے کھلے سخن میں اس مدرسے کا آغاز کیا گیا۔ اس مدرسے کے مہتمم پارس پست مولانا محمد قاسم نانوتوی کو مقرر کیا گیا۔ اس زمانے میں مولانا نانوتوی مطبع محتبائی میرٹھ میں تصبیح کتب کا کام کرتے تھے اس مدرسے کے سب سے پہلے طالب علم کا نام محمود تھا جنہوں نے بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام سے شہرت پائی اور اپنے عہد کے اکابر علمائے ہند میں شمار ہوتے اور پہلے مدرس کا نام ملا محمود تھا جس اتفاق ملاحظہ ہو کہ استاد بھی محمود اور شاگرد بھی محمود۔!

سب سے پہلے جس شخص نے اس مدرسے کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے چادر پھیلائی اور جس نے سب سے پہلے چندہ دیا، اس شخصیت کا اسم گرامی حاجی عابد حسین تھا، جو مدرسے کے بانیوں میں سے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں تقریباً چار سو روپے جمع ہو گئے اور یہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔

اس سے چار دن بعد ۱۹ محرم کو ایک ایشہار چھپو اکر مدرسے کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ پھر طلبہ نے اس مدرسے کی طرف اس کثرت سے رجوع کیا کہ پہلے ہی اس کے انتظامیہ ان کی تعداد اٹھتر ہو گئی۔ ان میں بیرون ہند کے طلبہ بھی شامل تھے۔ جیسے جیسے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، مدرسین کی تعداد بھی بڑھتی سی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا تقرر صدر مدرس کی حیثیت سے کیا گیا۔ مدرسے کے نیا پر سات سال گزرے تھے کہ اس میں طلبہ کی تعداد بہت

بڑھ گئی اور چھتہ والی مسجد میں اُن کے لیے قیام و تعلیم کا انتظام ممکن نہ رہا۔ چنانچہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۴ء) کو اُسے دیوبند کی جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا۔
 نئی جگہ کی خرید اور سنگ بنیاد

جامع مسجد میں مدرسے کی منتقلی پر تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ طلباء کی کثرت نے اسے بھی اپنی تنگ دامانی کا شکار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب مولانا ناتوئی نے اپنے رفقا کے سامنے مدرسے کے لیے آبادی سے باہر ایک وسیع عمارت تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور زمین کا ایک قطعہ خریدا گیا اور پھر ۱۲۹۲ھ کو جمعۃ المبارک کے دن اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ علی الترتیب مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا محمد قاسم ناتوئی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی عابد حسین اور مولانا محمد منظر کاندھلوی نے ایک ایک اینٹ رکھی۔ مولانا محمد یعقوب ناتوئی نے مادۂ تاریخ "انثرف عمارات" سے نکالا، جس سے ۱۲۹۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ عمارت کی تعمیر کا آغاز آئندہ سال ہی سے ہوا، لہذا ۱۲۹۳ھ صحیح قرار پاتا ہے۔ یہی وہ قطعہ اراضی ہے جہاں آج یہ درس گاہ قائم ہے اور جسے برصغیر پاک و ہند کے ایک بہت بڑے دارالعلوم کی حیثیت حاصل ہے، اس سے بے شمار علماء و فضلاء تاریخ التحصیل ہو کر نکلے اور متعدد وجوہ سے اس نے تمام عالم اسلام میں شہرت پائی۔

تیسرا ج

مولانا ناتوئی نے پہلا حج ۱۲۷۷ھ میں کیا تھا، اس سفر حج میں مولانا محمد یعقوب ناتوئی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ ۱۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء) کو ناولہ سے روانہ ہوئے اور کم و بیش ایک سال بعد ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو واپس وطن آئے۔

دوسری مرتبہ ۱۲۸۵ھ کو تصدیج بیت اللہ کیا۔ ان دنوں وہ بصورت ملازمت مطبع مجتبیٰ دہلی سے وابستہ تھے اور اس مطبع کے مالک منشی ممتاز علی اس

حج میں ان کے رفیق سفر تھے۔ اس زمانے میں دلیوبند کا مدرسہ قائم ہو چکا تھا اور مولانا اس کے نگران تھے۔ حج سے واپس آکر وہ میرٹھ کے مطبع ہاشمی میں کام کرنے لگے تھے۔

تیسری دفعہ وہ شوال ۱۲۹۴ھ کو عازم حجاز ہوئے اور حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اس حج میں علمائے کرام کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی۔ حج کے بعد جدہ پہنچے تو ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ کو مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔

پادری تارا چند سے مناظرہ

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی عیسائی مبلغین اور پادری اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ پادری تو وہ تھے جو انگریزوں کے ہم کباب ہو کر ان کے ملک انگلستان سے یہاں آئے اور کچھ وہ تھے جو ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور انگریز پادریوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر ہو کر حلقہ بگوش عیسائیت ہوئے تھے اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اقتدار میں ان کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور پھر جب حکومت براہ راست تاج برطانیہ کے قبضے میں آئی تو ان کی تبلیغی جنگ و ناز نقطہ عروج کو پہنچ گئی۔ علمائے دین نے ان کا ٹٹ کر مقابلہ کیا، تحریر و کتابت کی صورت میں بھی اور تقریروں اور مناظروں کی شکل میں بھی۔ ان حضرات علماء کی وسیع فہرست میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرالوی اور مولانا سید امیر حسن حسینی سہسوانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ انہی حضرات میں بابی دارالعلوم دلیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام نامی شامل ہے۔

اس زمانے میں پادری اس قدر بے باک ہو گئے تھے اور ان کی زبان اتنی دراز ہو گئی تھی کہ گلیوں محلوں، بازاروں اور عام مجموعوں میں جا جا کر اسلام اور

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدف اعتراض ٹھہرانے اور ان پر کھلم کھلا تنقید کرنے لگے تھے۔ دوسرے قصبات و بلاد کی طرح دہلی میں بھی یہی صورت حال تھی۔ مولانا نانوتوی اس زمانے میں دہلی کے مطبع مجتبیٰ میں کام کرتے تھے اور طلباء کو پڑھاتے بھی تھے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور اصحاب عقیدت کو حکم دیا کہ وہ بھی بازاروں اور محلوں میں جا کر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کریں اسلام کی حقانیت بیان کریں اور پادریوں کے افکار و خیالات کی واضح الفاظ میں تردید کریں۔ ان دنوں تارا چند نام کا ایک پادری جگہ جگہ جا کر اسلامی حکام فرماہن کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ یہ صورت حال مولانا نانوتوی کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ ایک دن وہ خود میدان میں آئے اور اپنا نام ظاہر کیے اور تعارف کرائے بغیر مجمع عام میں اسلام کی حقانیت بیان کرنے اور عیسائیت کا رد کرنے لگے۔ وہیں تارا چند سے ان کا سامنا ہوا، اور تھوڑی سی گفت گو کے بعد مناظرہ شروع ہو گیا۔ مناظرے میں پادری کو شکست ہوئی اور مولانا کامیاب رہے۔

اس عہد کے ایک جلیل القدر عالم مولانا ابوالمنصور ناصر الدین دہلوی تھے۔ انھوں نے عیسائیت کی تردید کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ بہت بڑے مناظر اور داعی اسلام تھے۔ مولانا نانوتوی کی ملاقات ان سے ہوئی تو نہایت مسرت کا اظہار کیا اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر انتہائی خوش ہوئے۔ مولانا ناصر الدین نے ۱۳۲۰ھ کو دہلی میں وفات پائی۔

شاہ جہان پور کا میلہ خدا شناسی

انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی کو زیادہ تر مبتلائے مصائب کیا۔ ان کو سیاسی طور پر بھی دبانے کی کوشش کی اور مذہبی اعتبار سے بھی شکست دینے کا عمل شروع کیا۔ ایک طرف ان کے مقابلے میں پادریوں کو لاکھڑا کیا اور دوسری جانب ہندوؤں کو شہ دی کہ وہ مسلمانوں سے مناظرے کریں۔ اس منصوبے کے تحت صوبہ یوپی کے ایک شہر

شاہ جہاں پور کے قریب ایک گاؤں "چاندا پور" میں ۸ مئی ۱۸۷۶ء کو ایک میلے کا اہتمام کیا گیا، جس کا نام "میلہ خدا شناسی" رکھا گیا۔ اس موقع پر مسلمان، عیسائی اور ہندو تین مذاہب کے سرکردہ لوگوں کو اشتہارات کے ذریعے دعوت دی گئی کہ وہ اس میلے میں شریک ہوں اور اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کریں۔ چنانچہ مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولوی الہی بخش رنگین کی تحریک پر مولانا محمد قاسم نانوتوی وہاں پہنچے۔ مولانا محمد حسن، مولوی رحیم اللہ بخوری اور مولانا فخر الحسن ان کے ساتھ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا ابوالمنصور ناصر الدین دہلوی، مرزا موحید جالندھری، مولانا احمد علی دہلوی، میر حیدر دہلوی، مولانا نعمان اور مولانا الہی بخش رنگین بھی وہاں تشریف لے گئے۔ ان تمام علمائے تقریریں کیں اور لوگ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے ابطال تثلیث، ردِ شرک اور اثباتِ توحید کے موضوع پر تقریر کی اور مخالف و موافق حاضرین پر ان تقریروں کا انتہائی اثر ہوا، اور اردگرد کے تمام دیہات و قصبات میں بیات مشہور ہو گئی کہ مسلمان جیت گئے اور دوسرے مذہبوں (عیسائیوں اور ہندوؤں) کے مناظر ہار گئے۔

اس سے دوسرے سال مارچ ۱۸۷۷ء میں میلہ خدا شناسی پھر منعقد ہوا اور مولانا نانوتوی اس مرتبہ بھی وہاں پہنچے۔ اس سال مراد آباد کے منشی اندرن او آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی (وفات ۱۸۸۳ء) بھی وہاں گئے تھے اور انھوں نے سنسکرت آمیز ہندی میں تقریر کی تھی۔ پادری ٹولس نے جو پہلے سال کے میلے میں بھی شامل تھا، اب کی مرتبہ ایک اور پادری کو بھی بلا لیا تھا، جس کا نام اسکاٹ تھا اور یہ عیسائیوں کا مشہور پادری تھا۔ اس میلے میں مولانا نانوتوی کے ساتھ چند اور علمائے دین بھی تھے جن میں مولانا حفیظ الرحمن خاں، مولوی عبدالغفور اور مولوی محمد علی پھراپوئی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا نانوتوی نے مسئلہ توحید سے متعلق گفتگو کی اور کامیاب رہے۔

شاہ جہاں پور کا میلہ خدا شناسی دو سال منعقد ہوا۔ پہلا ۸ مئی ۱۸۷۶ء میں اور دوسرا مارچ ۱۸۷۷ء میں۔ مولانا نانوتوی دونوں میں شریک ہوئے اور دونوں مرتبہ اپنے علم و فضل کے جوہر دکھاتے۔ ان میلوں کے بارے میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم لکھتے ہیں۔

”ایک بات یہاں خاص طور سے غور طلب ہے کہ ”میلہ خدا شناسی شاہ جہان“ اعلان و اشتہار کے ساتھ دو سال منعقد ہوا، اور اس میں ایک طرح سے مذہب اسلام کو چیلنج کیا گیا تھا۔ شاہ جہان پور سے بریلی اور بدایوں بالکل قریب اور متصل اضلاع ہیں، مگر اس میلے میں علمائے بدایوں اور بریلی کی کسی دلچسپی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔“
روداد رٹکی

شوال ۱۲۹۳ھ کو مولانا نانوتوی چند علمائے کرام کی معیت میں حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ کو واپس آئے۔ جدہ پہنچے تو طبیعت خراب ہو گئی، وطن آکر کچھ افاقہ محسوس ہوا، مگر بیماری کلی طور پر ختم نہیں ہوئی۔ اس سے تقریباً پانچ مہینے بعد شعبان ۱۲۹۵ھ کو رٹکی سے اطلاع ملی کہ پنڈت دیبانند سرسوتی سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور اسلام کے خلاف تقریریں کر رہے ہیں۔ مولانا نانوتوی کمزوری کے باوجود رٹکی پہنچے۔ بہت کوشش کی کہ پنڈت دیبانند جمع عام میں آئیں اور سب کے سامنے مولانا سے گفتگو کریں، لیکن وہ نہ آئے اور رٹکی سے واپس چلے گئے۔ مولانا کے حکم کے مطابق مولانا فخر الحسن اور مولانا محمود حسن نے عام جلسوں میں تقریریں کیں اور پنڈت جی کو مناظرے کا چیلنج دیا۔ مولانا نانوتوی نے بھی جلسہ عام میں تقریر کی اور اسلام پر جو اعتراضات پنڈت دیبانند سرسوتی نے کیے تھے ان کا مدلل جواب دیا۔

میرٹھ کا واقعہ

اس سے کچھ عرصہ بعد تپا چلا کہ پنڈت دیبانند میرٹھ پہنچے ہوئے ہیں اور وہاں مختلف

۲۲۲ ”مولانا محمد احسن نانوتوی“ ص ۲۲۲

مقامات پر جلسے منعقد کر کے اسلام پر حملے کر رہے ہیں، چنانچہ میرٹھ کے مسلمانوں کی درخواست پر مولانا نانوتوی وہاں گئے۔ پنڈت جی وہاں بھی ان سے گفتگو کرنے پر تیار نہ ہوئے اور میرٹھ سے چلے گئے۔ مولانا نے وہاں بھی جلسہ عام میں تقریر کی اور پنڈت دیانند کے اعتراضات کا جواب دیا۔

مہمان کے لیے حقے کا انتظام

مولانا نانوتوی ہمہ اوصاف موصوف عالم تھے، ان میں جہاں اور بہت سی خوبیاں پائی جاتی تھیں، وہاں ایک خوبی یہ تھی کہ بہت بڑے مہمان نواز تھے۔ مہمان کی تمام جائز ضرورتوں کا خیال رکھتے اور اس کو کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے جو سوانح قاسمی کے مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی نے نقل کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا نانوتوی کے قیام دہلی کے زمانے میں ایک ایسا شخص ان کے ہاں مہمان کی حیثیت سے آیا جو نہ دنیوی اعتبار سے کوئی خاص مقام رکھتا تھا اور نہ علمی اور دینی لحاظ سے کسی اہم مرتبے کا حامل تھا۔ بس ایک عام سا آدمی تھا۔ اسے ریاح کا عارضہ تھا اور حقہ پینے کا عادی تھا۔ حقہ پینے سے اسے اساقہ رہتا تھا۔ اس نے رات کا کھانا کھایا اور معمول کے مطابق کھانے کے بعد حقہ نہ پی سکا، مولانا کے احترام کے پیش نظر اپنی اس ضرورت کا ان کے سامنے اظہار بھی نہ کر سکا۔ آدھی رات کے بعد اسے لہج ہو گیا اور سخت تکلیف پیش آئی۔ مولانا کو اس کی بے چینی کا علم ہوا تو فوراً اٹھے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ یہ تکلیف حقہ نہ پینے کی وجہ سے پیش آئی ہے، اسی وقت کہیں سے حقہ لے کر آئے، خود چلم بھری اور حقہ اٹھا کر اس کو پیش کیا۔ پھر معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔

”آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں فرمایا تھا کہ میں حقہ پیتا ہوں۔“

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا کو حقے سے نفرت تھی، لیکن اس کے باوجود مہمان

کے لیے آدھی رات کے بعد حقہ ہٹیا کیا اور اسے پلایا۔^{۵۴}
اندازِ تبلیغ کی ایک اچھوتی مثال

مولانا نانو توئی جس زمانے میں منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی دہلی میں تصحیح کتب کی خدمت انجام دیتے تھے، اسی زمانے میں ایک دو صاحب بھی اس مطبع میں کام کرتے تھے، جو ”حافظ جی“ کے نام سے مشہور تھے۔ وہ بالکل آزاد منہش

۵۴ سوانح قاسمی ج ۱ ص ۲۶۸، ۲۶۹۔

یہاں مجھے اسی قسم کا ایک واقعہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم (مصنف رحمۃ للعالمین) کا یاد آیا جو ایک مرتبہ ہمارے ایک بزرگ میاں قاسم الدین مرحوم نے سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ اور میرے دادا میاں محمد مرحوم (جو میاں قاسم الدین کے برادر نسبتی تھے) قاضی صاحب مرحوم سے ملاقات کے لیے پٹیالہ گئے۔ یہ دونوں بزرگ حقہ پینے کے عادی تھے۔ قاضی صاحب اس زمانے میں ریاست پٹیالہ کے سیشن جج تھے۔ یہ بزرگ جتنے دن پٹیالہ میں قاضی صاحب مرحوم کے ہاں مقیم رہے، قاضی صاحب انہیں خود کھانا کھلاتے اور اپنے ہاتھ سے حقہ بھر کر لاتے رہے۔ قاضی صاحب سے یہ حضرات بار بار کہتے کہ کھانا اور حقہ ملازم لے آئے گا، آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ قاضی صاحب ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ آپ ملازم کے رشتے دار یا مہمان نہیں ہیں، میرے رشتے دار اور میرے ہی مہمان ہیں اور مجھ سے ملاقات کے لیے آتے ہیں، میرا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کروں اور آپ کی ضروریات کا اہتمام کروں۔ میرے دادا کا انتقال جولائی ۱۹۳۹ء کو میرے قدیم وطن کوٹ کپورہ (مشرقی پنجاب) میں ہوا، اور میاں قاسم الدین کی وفات ۱۹۵۰ء کو میرے موجودہ گاؤں چک نمبر ۵۳ گ۔ ب تحصیل جڑالوالہ، ضلع فیصل آباد میں ہوئی۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے، پڑانے لوگ عجیب نکار و خیالات کے مالک تھے، سراپا خلوص اور پیکر محبت تھے۔

تھے، رندانہ وضع تھی، چوڑی دار پانچامہ پہنتے تھے جو اس دور کے مشرفا کا لباس نہ تھا۔ ڈاڑھی چڑھا کر رکھتے تھے اور منسا زہ پڑھتے تھے۔ مطیع میں ملازمت کی وجہ سے مولانا اور حافظ جی کی آپس میں نہایت گہری دوستی تھی۔ یہ دوستی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی کے ”حافظ جی مولانا کو ہنلاتے اور کھڑکتے تھے اور مولانا ان کو ہنلاتے اور کھڑکتے تھے مولانا ان کو کنگھا کرتے اور وہ مولانا کو گلگھاتے۔ مولانا کو ان کا اس قدر خیال رہتا کہ ”کبھی مٹھائی وغیرہ ان کے پاس آتی تو حافظ جی کا حصہ ضرور رکھتے۔“

سوانح قاسمی میں مرقوم ہے کہ مولانا کے مقدس دوست، ان کی ایک آزاد شخص کے ساتھ اس قسم کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ اس کی پروا نہ کرتے تھے۔ ”ایک دن تنہائی میں مولانا نے حافظ جی سے کہا کہ ”بھئی! ہماری دوستی کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ دونوں کا رنگ ایک ہی ہو، یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری وضع قطع کچھ اور ہو اور تمہارے دوست کی کچھ اور۔“ فرمایا ”لاؤ میں ہی تمہارا رنگ اختیار کرتا ہوں۔“ یہ الفاظ سن کر حافظ جی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور اس کے بعد اپنے دوست (مولانا توتوی) کا ایسا پختہ رنگ اختیار کیا کہ پرہیزگار مسلمانوں کی وضع قطع اختیار کر لی، اور اس روز سے پچھ نمازی اور نیک وضع بن گئے۔^{۴۷}

^{۴۷} تفصیل کے لیے دیکھیے سوانح قاسمی ج ۱ ص ۲۶۹

اسی نوع کا قاسمی سلیمان منصور پوری کا ایک اور واقعہ ذہن میں آیا۔ یہ واقعہ صوفی نذیر حسین مرحوم سے تعلق رکھتا ہے جو امرتسر کے رہنے والے تھے اور قیام پاکستان کے بعد گوجرانوالہ میں اقامت گزری ہو گئے تھے، ۲۴ فروری ۱۹۵۲ء کو فوت ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کسی زمانے میں بھٹنڈہ ریلوے سٹیشن میں ملازم تھے۔ فقیرانہ لباس اور وہی وضع قطع، بڑی بڑی مونچھیں، اچھی خاصی ڈاڑھی، سر پر لمبے لمبے بال اور پنڈلیوں سے نیچے تک بزرنگ کا چڑکلائی میں چھ سات لوسے کے کڑے اور ہاتھ میں ڈنڈا باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

یہ تبلیغ کا ایک اچھوتا اور نفسیاتی انداز تھا، جو نہایت موثر ثابت ہوا۔
میلاد کا واقعہ

اس زمانے میں ایک بزرگ مولوی عبد السمیع تھے جو میلاد کے سختی سے قائل تھے اور اس موضوع پر بعض علمائے دیوبند سے ان کے مناظرے بھی ہوئے۔ مولانا نانوتوی سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے منقول ہے کہ "ایک صاحب نے میرٹھ میں مولانا نانوتوی سے دریافت کیا کہ مولوی عبد السمیع صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) جسے ہتھیلی میں تمام کراتھ کے چھٹکے سے کوٹوں پر مارتے تو چھن چھن کی آواز گونجنے لگتی۔ صوفی صاحب کہتے ہیں، ایک دن میں اسی شکل و ہیئت میں بھنڈہ دیکھنے ٹیشن کے ایک پلیٹ فارم پر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک بزرگ پر نظر پڑی جو پٹیلہ شاہی عمامہ باندھے ہوئے تھے، خوب صورت ڈاڑھی اور کٹی ہوئی مونچھیں، تنگ موری کا پاجامہ اور شیروانی زیب تن۔ گورا رنگ اور نورانی چہرہ۔ نہایت معزز اور وجیہ آدمی تھے ساتھ ایک ملازم جس کے ہاتھ میں کپڑے کا مصلیٰ اور سلور کا لوٹا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ریلوے ٹیشن کے جو بڑے چھوٹے لوگ ادھر سے گزرتے، ان بزرگ کو نہایت ادب سے سلام کرتے اور وہ مسکراتے ہوئے سب کے سلام کا جواب دیتے تھے۔ مجھے اس بزرگ کی مومنانہ شکل و صورت اور غیر معمولی روحانیت نے اپنی طرف کھینچا اور میں نے آگے بڑھ کر ان کو جھک کے سلام کیا۔ پھر نہایت ادب سے عرض کیا۔

”آپ کہاں رہتے ہیں۔؟“

فرمایا ”یہیں بھنڈے میں رہتا ہوں“

”یہاں جناب کا کیا شغل ہے؟“

بولے ”ٹیشن سے قریب کی مسجد میں ہر روز نماز مغرب کے بعد قرآن مجید کا

درس دیتا ہوں“

”اب کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟“ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

تو مولود شریف کرتے ہیں، آپ کیوں نہیں کرتے؟“
 جواب ملاحظہ ہو، فرمایا ”بھائی! انہیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ
 محبت معلوم ہوتی ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ محبت نصیب کرے۔“
 مولانا تھانوی فرماتے ہیں، یہ جواب کسی طرح مولوی عبد السمیع تک بھی

رفیقہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے ”پٹیلے جا رہا ہوں“

”والپس کب تشریف لائیں گے؟“

جواب دیا ”انشاء اللہ پرسوں آ جاؤں گا اور معمول کے مطابق نمازِ مغرب کے بعد
 دس قرآن دوں گا۔“ پھر بدرجہ غایت شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”آپ
 بھی درس میں آیا کریں۔“

صوفی صاحب بتاتے ہیں کہ میں تیسرے دن اپنی مخصوص وضع قطع اور سہیت کذائی میں
 ان کے درس میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بہت سے افسر اور ساتھی وہاں موجود ہیں اور انتہائی
 اسہاک سے درس سُن رہے ہیں۔ میں سب سے پیچھے جوتوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے دورانِ درس
 میں مجھے دیکھا تو فرمایا ”قرب آ جاؤ“ میں جھجکتا ہوا اٹھا اور حسبِ حکم ان کے قریب جا کر
 بیٹھ گیا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنی اس سہیت پر شرم محسوس کر رہا تھا۔ میرے افسر
 اور ساتھی مجھے ایک خاص انداز سے دیکھ رہے تھے۔ درس کے بعد باہر نکلے تو پتا چلا کہ یہ قاضی محمد سلیمان
 منصور پوری ہیں جو بہت بڑے عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ریاست پٹیلہ کے سیشن جج
 ہیں اور ریاست کی تمام منڈلیوں کے منتظم ہیں اور اس حیثیت سے ناظم منڈلیات ان کا عہدہ ہے
 اور بھنڈہ میں ان کا دفتر ہے۔

اس کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ مونچھوں اور ڈاڑھی کو سنت کے مطابق کیا، سر کے بال
 کٹوائے بڑے اتار پینکے اور ڈنڈا غائب کر دیا۔ چوٹا بنا دیا اور لباس بدل لیا۔ دوسرے دن
 درس میں گیا تو حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے مجھے غور سے دیکھا، اپنے قریب بٹھایا
 اور مسکراتے ہوئے فرمایا، ”وہ چوٹ، کڑے، ڈنڈا اور سر کے بال کدھر گئے۔“ معنی کیا ”اب
 رہا قاضی حاشیہ صفحہ پر دیکھیں،

پہنچ گیا تو کہا، ایسے سے مہلا کوئی کیا لڑے۔
یہ تھا مخالفوں کے بارے میں ان بزرگوں کا اندازِ کلام اور اسلوبِ گفتگو۔
اس قسم کی باتیں لوگوں کو متاثر کرتی تھیں اور وہ امورِ بدعت سے دامن کشاں
ہو جاتے تھے۔

بدعتی کی مہمان نوازی

ایک صاحب "ٹھسک" کے رہنے والے تھے اور طبقہ مشائخ سے تعلق رکھتے
تھے، لوگ انھیں "شاہ صاحب" کہتے تھے۔ علمائے دیوبند جن امور کے بدعت
ہونے کا فتویٰ دیتے تھے، وہ ان میں مبتلا تھے۔ انھوں نے مولانا نانوتوی کی شہرت
سنی تو ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے نہایت احترام کے ساتھ ان کو
مہمان بنایا اور طلبا کو حکم دیا کہ کوئی شخص ان کے طریقے کے خلاف کسی قسم کی بات نہ کرے،
اس لیے کہ مہمان کی دلکشی نہیں کرنی چاہیے۔ مولانا نانوتوی نے رسم مشائخ کی پیروی
کرتے ہوئے شاہ صاحب کی خدمت میں نذر بھی پیش کی۔ بلکہ شاہ صاحب کے
ساتھ جو بھنگی سائیں تھے، ان کو خود کھانا کھلایا اور ان کی خاطر مدارت کی۔ یہ بات
کسی نے مولانا رشید احمد گنگوہی کو بھی پہنچا دی۔ مولانا گنگوہی نے مولانا نانوتوی
کے اس طرزِ عمل پر کچھ ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ بدعتی کا اکرام جائز نہیں۔ مولانا
نانوتوی کی طرف سے جواب دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کافر ممالوں کا

رہے، حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے، وہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے نہ ہو گیا، فرمایا رہنے دیتے، اتنی
جلدی کیا پڑی تھی، وہ لباس اجماع تھا۔ اور آپ کی شخصیت کا جزو بن گیا تھا۔
غور فرمائیے۔ پورانے بزرگوں اور عالموں کا طریقِ کلام اور بیچ تفہیم کس درجے میں تھا اور
پیارا تھا۔ ان کی ہر بات دل میں اترتی اور فکر و ذہن کی کہراہوں میں اثر و سون کے نقوش
مترسم کرتی جاتی تھی۔

۵۷۷ سوانح قاسمی ج ۱ ص ۴۷۱، ۴۷۲

بھی اکرام کرتے تھے۔ مولانا گنگوہی کو لوگوں نے مولانا نانوتوی کا یہ جواب سنایا تو فرمایا کہ کافر کے اکرام میں غلط فہمی اور فساد کا احتمال نہیں، برخلاف بدعتی کے بدعتی کے اکرام میں اندیشہ ہے کہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے اور سمجھنے لگے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کو صحیح قرار دے دیا گیا ہے، علاوہ ازیں دوسرے لوگ بھی یہی غلط نتیجہ نکال سکتے اور بدعتی کے عمل کو مبینی برصحت ٹھہرا سکتے ہیں۔

منقول ہے کہ جب مولانا نانوتوی کے سامنے مولانا گنگوہی کا یہ قول بیان کیا گیا تو جو صاحب ان دونوں بزرگوں کی باتیں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پہنچا رہے تھے، ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ”یہ کیا دہمیت ہے، ادھر کی ادھر لگاتے پھرتے ہو، بیٹھو اپنا کام کرو“

کہا جاتا ہے کہ جب وہ مہمان یعنی شاہ صاحب مولانا نانوتوی کے ہاں سے رخصت ہونے لگے تو اُنھوں نے مولانا سے کہا: ”فقیر تو آپ ہیں، ہم تو صرف نقال ہیں۔“

تصنیفات

مولانا نانوتوی متعدد کتابوں کے مصنف تھے اور ان کی تمام تصنیفات ان مسائل سے متعلق ہیں جو ان کے عہد میں زیر بحث تھے۔ ان سے مختلف اہل علم نے جو استفسار کیے ان کے اُنھوں نے مفصل اور مدلل جواب دیے اور پھر وہ کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان کے مندرجات و مشمولات نہایت دقیق اور فلسفیانہ ہیں۔ مولوی منصور علی خان مراد آبادی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

”میں نے جناب مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی کو خوب دیکھا ہے اور ان کی تقریر بھی سنی ہے اور ان کے خیالات اور اوصاف پر غور کیا ہے۔ ان کا ذہن مصنفینِ فلسفہ کے ذہن سے بھی عالی تھا۔ وہ ہر مسئلہ شرعی کو دلائل عقلیہ

سے ثابت کرنے پر اور مستند فلسفی مخالف شرع کو دلائل عقلیہ سے رد کرنے پر ایسے قادر تھے کہ دوسرے کسی عالم کو میں نے ایسی قوتِ علمیہ اور قوتِ بیانیہ والا نہیں دیکھا ہے۔“

ان کے مکاتیب و رسائل اور تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ بلاشبہ وہ بہت بڑی قوتِ علمیہ اور قوتِ بیانیہ کے مالک تھے اور اللہ نے ان کو ذہانت و فطانت کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ان کے بہت سے مکتوبات کے علاوہ جو انھوں نے مختلف حضرات کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے، ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ تحشیہ صحیح بخاری :- یہ صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کا حاشیہ ہے جو انھوں نے مولانا احمد علی سہارن پوری کے فرمان کے مطابق لکھا۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۲۔ آپ حیات :- یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اور جسمانی حیاتِ مبارکہ سے متعلق ایک علمی اور تحقیقی کتاب ہے۔ بارغِ فدک کے بارے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان کا بھی اس میں جواب دیا گیا ہے۔

۳۔ مصابیح التواویح :- یہ تراویح سے متعلق مولانا احمد حسن امروہوی کے ایک استفسار کا جواب ہے۔

۴۔ ہدایۃ الشیعہ :- اس میں ان اعتراضات کے مفصل اور مدلل جوابات دیے گئے ہیں جو شیعہ حضرات کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں۔

۵۔ الدلیل المحکم علی قرآۃ الفاتحة للموتہم :- یہ فاتحہ خلف الامام کے متعلق ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ اس کے آخر میں ایک بزرگ کے نام ایک

مکتوب ہے جس میں تقلید اور آٹھ رکعت تراویح کا بیان ہے۔

۶۔ اجوبہ اربعین :- اس میں شیعہ حضرات کے مختلف اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۷۔ اسرار قرآنی :- یہ ایک سالہ ہے جو بعض مسائل سے متعلق پانچ مکتوبات کے جوابات پر محیط ہے۔ ان میں پہلے تین مکتوب مولانا محمد صدیق مراد آبادی کے ہیں، چوتھا مولانا احمد حسن امر دہوی کا اور پانچواں مرزا عبد القادر مراد آبادی کا ہے۔

۸۔ تصفیۃ العقائد :- سر سید احمد خاں اور مولانا نانوتوی کے درمیان پیر جی محمد عارف انبٹھوی کی معرفت ایک مرتبہ عقائد اسلام کے موضوع پر خط و کتابت ہوئی تھی۔ مولانا محمد حیات میرٹھی نے تصفیۃ العقائد کے نام سے اسے چھاپ دیا تھا۔ پہلا خط پیر جی محمد عارف کے نام اور دوسرا خط سر سید احمد خاں کے نام ہے۔ سر سید کا خط بنام پیر جی محمد عارف بھی اس میں شامل ہے۔

۹۔ تحذیر الناس :- مولانا محمد احسن نانوتوی کے ایک استفسار کا جواب جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔

۱۰۔ رد قول الفصیح :- مولانا عبد القادر بدایونی کے شاگرد مولوی فصیح الدین بدایونی نے تحذیر الناس کے رد میں ایک رسالہ قول الفصیح لکھا تھا۔ مولانا نانوتوی نے اس کے جواب میں رد قول الفصیح لکھا۔

۱۱۔ حجة الاسلام :- چاندپور (ضلع شاہ جہان پور) کے میبلہ خدائشی میں مولانا نانوتوی نے حقانیت اسلام کے متعلق ایک تقریر کی تھی جو مولوی فخر الحسن گنگوہی نے حجة الاسلام کے نام شائع کی۔

۱۲۔ گفتگو تے مذہبی (میبلہ خدائشی) :- یہ بھی ایک تقریر ہے جو چاندپور (ضلع شاہ جہان پور) کے میبلہ خدائشی میں کی تھی۔ یہ میبلہ ۱۸۶۶ء

کو ہوا تھا۔

۱۳۔ مباحثہ شاہ جہان پور :- یہ بھی ایک تقریر ہے جو ۱۹، ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کے میلہ خدا شناسی میں ہوئی۔

۱۴۔ انصار الاسلام :- یہ وہ تقریر ہے جو رٹ کی میں اس وقت جا کر کی جب کہ پنڈت دیانند سروتی وہاں گئے تھے اور مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج دیا تھا۔ مولانا نانوتوی مناظرے کے لیے وہاں پہنچے تو دیانند سامنے نہیں آئے تھے اور رٹ کی سے کسی دوسری جگہ چلے گئے تھے۔ اس تقریر میں شیطان، جن اور فرشتوں کا وجود ثابت کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سرسید کے ادہام کی بھی تردید کی گئی ہے۔

۱۵۔ قبلہ منہ :- پنڈت دیانند سروتی (آریہ سماجی) نے استقبال قبلہ کے مسئلے کو بہت اعتراض ٹھہرایا تھا۔ مولانا نانوتوی نے اس رسالے میں استقبال قبلہ اور بت پرستی کے درمیان جو فرق ہے، اس کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقت قبلہ کیا ہے اور نماز میں اس کی طرف منہ کرنا کیوں ضروری ہے۔ یہ رسالہ "انتصار الاسلام" کا حصہ دوم ہے۔

۱۶۔ جواب ترکی بد مذہبی :- ایک مرتبہ میرٹھ (لوپی) میں آریہ سماجیوں نے اسلام پر کچھ تخریبی اور تقریبی اعتراض کیے تھے۔ اس رسالے میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ مولانا نانوتوی کا یہ رسالہ مولوی عبدالعلی نے مرتب کیا ہے۔

۱۷۔ تقریر دلپذیر :- اس میں عقلی اور نقلی دلائل سے اسلام کی حقانیت ثابت کی گئی ہے اور اللہ کی توحید اور آنحضرت کی نبوت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ نیز واضح کیا گیا ہے کہ نجات کا دار و مدار صرف اسلام کو ماننے پر ہے۔

۱۸۔ توثیق الکام در مبحث خلف الامام :- جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس

رسالے میں فاتحہ خلف الامام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۱۹۔ تحفہ حمید :- اس میں گوشت خوری کو عقلی اور نقلی اسلوب میں ثابت

کیا گیا ہے۔

۲۰۔ امتیاز المؤمنین :- یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے جو مولوی الہی بخش

کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا۔ اس میں شیعہ حضرات کے اعتراضات کا

جواب دیا گیا ہے۔ رسالے کے آخر میں مولانا حبیب الرحمن بن مولانا

احمد علی سہارن پوری نے مولانا اسماعیل شہید دہلوی کا عربی زبان کا

ایک خط اور اس کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔

۲۱۔ بیوض قاسمید :- اس میں پندرہ علمی مکتوبات کے جواب دیے گئے ہیں۔

۲۲۔ جمال قاسمی :- یہ مولانا نازوقی کے ان دو مکتوبات پر مشتمل ہے جو

انہوں نے محمد جمال الدین دہلوی کو تحریر فرمائے۔ مکتوب لینے پر مکتوبات

”جمال قاسمی“ کے نام سے مرتب کیے۔

مکتوب اول :- ۲ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ کو لکھا گیا جو وحدت الوجود کے

بیان میں ہے۔

مکتوب دوم :- ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ کو تحریر فرمایا گیا جو سماع موتی کے

متعلق ہے۔

۲۳۔ لطائف قاسمید :- یہ رسالہ نو مکتوبات پر مشتمل ہے جو مولانا نے مختلف

مسائل کے جواب میں نو حضرات کے نام تحریر کیے۔

۲۴۔ مکتوبات قاسمید :- اس مجموعہ مکتوبات میں مولانا کے آٹھ خطوط

شامل ہیں جو انہوں نے خلیفہ بشیر احمد دیوبندی کے نام لکھے۔ یہ خطوط تصوف و

سلوک کے موضوع پر مشتمل ہیں۔ آخر میں حاجی امداد اللہ ہاجر مکی کے آٹھ

خط درج کیے گئے ہیں اور ایک خط مولانا رشید احمد گنگوہی کا ہے۔

۲۵۔ الاجوبۃ الکاملہ فی الاسولۃ الخامسہ :- یہ رسالہ شیعیت کے

رد میں ہے۔

۲۶۔ تصانیف قاسمیہ : مولانا ذوقِ شعری بھی رکھتے تھے۔ یہ ان کے چند تصانیف کا مجموعہ ہے۔ تصنیفِ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ بابرکات میں ہے۔ تین تصانیف ترکی کے سلطان عبدالحمید کی مدح میں ہیں۔ پہلا اردو میں، دوسرا فارسی میں اور تیسرا عربی میں۔ مولانا ذوالفقار علی، مولانا فیض الحسن اور مولانا محمد یعقوب نالوتوی کے عربی تصانیف بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جو انہوں نے سلطان عبدالحمید کی مدح میں لکھے۔ آخر میں مولانا نالوتوی کا منظوم حاشیہ صابریہ شجرہ درج ہے۔

تلامذہ

مولانا محمد قاسم نالوتوی بلاشبہ دیارِ ہند کے جلیل القدر عالم اور متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ ان کی خدماتِ گونا گوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ اگرچہ محدود تھا، لیکن اس میں ہندوستان کے بعض اعظم رجال شامل تھے، جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا محمد یعقوب دہلوی اور حکیم منصور علی خاں مراد آبادی لائقِ تذکرہ ہیں۔

انتقال

مولانا نالوتوی حج بیت اللہ کے لیے تیسری اور آخری مرتبہ شوال ۱۲۹۴ھ کو وطن سے روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ کو واپس تشریف لائے۔ وہ اپنی پر حدیہ پہنچے تو ان کی طبیعت خراب ہو گئی اور پھر مستقل طور پر بیماری کی گرفت میں آ گئے۔ درمیان میں علاجِ معالجے سے کچھ افاقہ بھی ہوا، مگر مرض کی جڑ نہیں کٹی اور ضیقِ النفس کی تکلیف نے شدت اختیار کر لی۔ بالآخر ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۴ھ (۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء) کو پچھنبہ کے روز دیوبند میں ان کی روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور نمازِ مغرب کے بعد اس خزانہ علم و فضل کو اسی سرزمین میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اللہم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

۷۷۔ مفتی محمد قلی کنتوری

مفتی محمد قلی بن محمد حسین بن حامد حسین بن زین العابدین موسوی نیسا پوری کنتوری اپنے دور کے فاضل بزرگ اور مشہور شیعہ عالم تھے۔ ۱۱۸۸ھ کو پیدا ہوئے اور لکھنؤ کے ممتاز اساتذہ سے حصول علم کیا۔ پھر سید ولد ار علی نقوی نصیر آبادی سے منسلک ہوئے جو نامور شیعہ مجتہد تھے۔ ان سے حدیث و فقہ اور اصول حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیعہ حضرات کی طرف سے میرٹھ (لوہی) میں مسند افتا پر فائز ہوئے۔ عرصے تک اس منصب پر متمکن رہے۔ شیعہ اصول و کلام سے متعلق بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ السیف الناصری : یہ کتاب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحفہ

اشنا عشریہ کے پہلے باب کے رد میں ہے۔

۲۔ ثقلب المکاید : یہ تحفہ اشنا عشریہ کے دوسرے باب کے رد

میں ہے۔

۳۔ برهان السعاده : اس میں تحفہ اشنا عشریہ کے ساتویں باب کا رد کیا

کیا گیا ہے۔

۴۔ تشنیید المطاعن لکشف الظفائن : یہ تحفہ اشنا عشریہ کے دسویں باب کی تردید

مشتعل ہے۔

۵۔ مصارع الافہام لقطع الاوهام : اس میں تحفہ اشنا عشریہ کے

گیارہویں باب کی تردید کی گئی ہے۔

۶۔ الاجر دینۃ الناکرة : اس میں مولانا رشید الدین خاں

دہلوی کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انہوں نے سیف

مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فقہائے پاک و ہند تیسرے

صدی ہجری جلد اول ص ۲۲۲ تا ۲۲۵ -

ناصری پر کیے ہیں۔

۷۔ الفتوحات الحیدریہ :- یہ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھالوی کی الصراط المستقیم کے رد میں ہے۔

۸۔ الشعبلة الطفریہ :- یہ مولانا رشید الدین خان دہلوی کی مشہور کلمات "الشوكة العربیہ" کے رد میں ہے۔

۹۔ فناء الشیخین بحکم احادیث الصحیحین۔

۱۰۔ تطہیر المؤمنین عن نجاسة المشرکین۔

۱۱۔ تقریب الافہام فی تفسیر آیات الاحکام۔

ان کے علاوہ انہوں نے اور بھی رسائل تحریر کیے۔

مفتی محمد قلی کنٹوری نے ۹ محرم - ۱۲۶ھ کو ۷۲ سال کی عمر میں وفات

پائی ۹

۷۸۔ مولانا محمد لبیب عثمانی

یوپی کا شہر بدایوں علم و علما کی کثرت میں خاص شہرت کا حامل ہے۔ اس شہر کی سرزمین میں بے شمار اہل علم نے جنم لیا اور اپنی خدمات کی وجہ سے بڑا نام پایا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس خطے میں جو حضرات پیدا ہوئے ان میں مولانا محمد لبیب عثمانی بدایونی کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ مولانا محمد سعید بدایونی کے بیٹے تھے جو اس نواح کے اصحاب علم میں خاص طور سے معروف تھے۔

مولانا محمد لبیب بدایوں میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں نشوونما پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ محمد سعید بدایونی سے حصول علم کیا اور مدت تک ان سے دانشگری اختیار کیے رکھی۔ علوم متداولہ سے فراغت کے بعد خود سلسلہ درس جاری کیا

۹۷ نزہة الخواطن ج ۷ ص ۴۶۰، ۴۶۱ بحوالہ تذکرۃ العلما۔

اور بہت سے علما و طلباء ان سے مستفید ہوتے۔ علم فقہ اور فرائض و وراثت میں مہارت رکھتے تھے اور اس موضوع سے متعلق کثیر تعداد میں لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔

بدایوں کے اس عالم و فقیہ نے ۷۴ برس عمر پا کر محرم ۱۲۰۵ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

۷۹۔ سید محمد لطیف مچھلی شہری

سید محمد لطیف ہاشمی جعفری جلیل القدر عالم، نامور فقیہ اور شیخ تھے۔ علمائے حنفیہ میں اونچے مرتبے کے بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تاصنی ثناء اللہ مچھلی شہری کی اولاد سے تھے۔ بلند اخلاق اور صالح عالم دین تھے۔ مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد مفتی علی کبیر سے حصول علم کا آغاز کیا، کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر مولانا محمد شکور کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے تکمیل علم کی۔ تمام علوم عقیدہ و تقلید کے ماہر تھے۔ ادبیات عربی میں بالخصوص کمال حاصل تھا۔ عبادت و زہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ کئی سال درس و تدریس میں مشغول رہے اور بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ پہلے مفتی مقرر ہوئے، پھر صدر امین کا عہدہ سنبھالا، بعد ازاں صدر الصدور کا منصب پایا۔ مسندِ قضا پر بھی متمکن رہے۔ تمام مناصب میں اچھی شہرت پائی اور ہر طبقے کے لوگ ان کے کام سے متاثر ہوئے۔ حکایات عربی ان کی ایک تصنیف ہے۔ طوطی نامہ کا ترجمہ شروع کیا تھا، لیکن اسے مولانا عبدالشکور نے مکمل کیا۔ مذکورہ بالا خدمات انجام دینے کے بعد پیش پائی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

آخر عمر حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور سعادتِ حج حاصل کی۔ ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۶۷ھ کو مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے۔^{۸۱}

۸۰۔ مولانا محمد مبین فرنگی محلی

برصغیر پاک و ہند کے جن علمی خاندانوں نے بہت زیادہ شہرت پائی، ان میں لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ یہ انصاری خاندان تھا۔ اس کے متعدد اہل علم کا ذکر سلسلہ فقہائے ہند کے بہت سے مقامات میں ہو چکا ہے۔ اس دورانِ عالی قدر کے جدِ اعلیٰ شیخ قطب الدین شہید سہالوی تھے، جن کی شہادت کے بعد یہ خاندان لکھنؤ کے نواحی قریہ سہالی سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ آیا اور وہاں کے ایک مقام ”فرنگی محل“ میں اقامت گزری۔ نئے کی بنا پر اس کے معزز ارکان ”فرنگی محلی“ کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولانا قطب الدین شہید کے فرزندِ نامدار ملا نظام الدین انصاری فرنگی محلی نے عربی اور دینی مدارس کے لیے باقاعدہ ایک نصابِ تعلیم مرتب کیا جو ان کے نام کی مناسبت سے ”درس نظامیہ“ کہلایا۔ اسی خاندان کے ایک عالم دین مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی تھے۔ ان کا مختصر نسب نامہ یہ ہے: محمد مبین بن محب اللہ بن احمد بن محمد سعید بن قطب الدین شہید انصاری فرنگی محلی لکھنوی۔

مولانا محمد مبین اپنے دور کے عالم کبیر اور شیخ ذی مرتبت تھے۔ کبار فقہائے حنفیہ میں گروانے جاتے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی گہوارہٴ علم میں نشوونما پائی۔ منقول و منقول کے جید عالم ملا حسن فرنگی محلی لکھنوی سے علم حاصل کیا جو ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور علوم متداولہ میں درجہ کمال کو پہنچے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و افادہ

۸۱۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۷۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۲

میں مشغول ہوئے اور اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ علاوہ ازیں تصنیف و تالیف میں بھی نام پیدا کیا اور وعظ و تذکیر کے میدان میں بھی شہرت پائی۔ ایک روایت کے مطابق شیخ قطب الدین کی اولاد میں یہ اولین عالم دین تھے جنہوں نے لکھنؤ کے فرنگی محل کو مرکز بنا کر تذکیر و وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات اور شرح و حواشی کا دائرہ کسی ایک ہی فن میں محدود نہیں ہے، یہ ہر موضوع پر حاوی تھے اور ہر میدان میں انہوں نے داؤد تحقیق دی، جس کی تفصیل مندرجہ تحت ہے۔

۱۔ شرح سئلہ العلوم :- یہ علم منطق کی کتاب ہے اور درسیات میں شامل ہے۔ اس کی انہوں نے ایک مبسوط شرح سپرد قلم کی، جسے طلقہ علماء میں تلمیح و قبولیت حاصل ہوئی۔

۲۔ شرح مسلم الثبوت :- اصول فقہ کی ایک مشہور کتاب مسلم الثبوت ہے اور شامل درس نظامی ہے۔ مولانا محمد حسین فرنگی محلی نے شرح مسلم الثبوت کے نام سے اس کی شرح لکھی۔

۳۔ حاشیہ میرزا عہد رسالہ۔

۴۔ حاشیہ منیرزاہد ملاحلال۔

۵۔ حاشیہ میرزاہد شرح المواقف۔

۶۔ حاشیہ علی شرح ہدایۃ الحکمة از شیرازی۔

۷۔ وسیلۃ النجات :- یہ رسالہ اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہے۔

۸۔ ترجمہ حکایات الصالحین۔

۹۔ شرح اسماء حسنی۔

۱۰۔ شرح تبصرہ :- یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ہے۔

۱۱۔ زبدۃ الفوائد :- اس میں سحری اور رمضان المبارک کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۱۲۔ کثر الحسنت فی ایتاء الزکوٰۃ :- یہ رسالہ زکوٰۃ کے احکام و مسائل سے متعلق ہے۔

غرض مولانا محمد مبین انصاری فرنگی تیرھویں صدی ہجری کے جید عالم اور نماز فقیہ تھے۔ ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ کو لکھنؤ میں فوت ہوئے ۸۲

۸۱۔ مولانا محمد مرشد سرہندی

سرہند (مشرقی پنجاب) میں تیرھویں صدی ہجری کے جو علماء و فقہاء امتیاز و ناموری سے مہتر ہوئے، ان میں مولانا محمد مرشد بن محمد ارشد بن فرخ شاہ کا نام نامی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ وہ مسدک حنفی تھے اور سرہند کے رہنے والے تھے۔ متقی اور صالح عالم دین تھے۔ ۱۱ صفر ۱۱۱۱ھ ان کا سن ولادت ہے۔ ان کے والد محمد ارشد سرہندی جید علماء میں سے تھے اور ان کا سلسلہ درس جاری تھا جس سے بہت سے تشنگانِ علوم مستفید ہوئے۔ بیٹے نے اپنی کے حضور زائے شاگردی تسلیم کیا اور علم و معرفت میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے بازی لے گئے۔

علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد عازمِ رام پور ہوئے۔ وہاں اس زمانے میں نواب فیض اللہ خاں داد حکمرانی دیتا تھا اور علم و علما کا بہت قدر دان تھا، مولانا محمد مرشد سے بھی اس نے انتہائی تکریم کا برتاؤ کیا اور انھیں مناسبت عزت سے ٹھہرایا۔ انھوں نے رام پور میں درس و تدریس کی مسند آراستہ کی اور اس نواح کے علماء و طلباء کا مرکز قرار پاتے۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں ان کے فرزند گرامی مولانا سراج احمد بھی شامل ہیں، جنھوں نے جامع ترمذی کی شرح سپردِ قلم کی۔

۸۲ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۷۲ - ۱۷۴ - تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۱

تذکرہ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۲ ، ۲۰۴

مولانا محمد مرشد سمرندی نے پیر کے روز ۱۹۔ رجب ۱۲۰۱ھ کو رام پور میں وفات پائی^{۵۳}۔

۸۲۔ مولانا محمد مستعان کا کوری

کاکوری کسی زمانے میں بے شمار علما و فقہاء اور صلحا و اتقیا کا مسکن تھا اس کے تیرھویں صدی ہجری کے عالی مرتبت اصحاب میں مولانا محمد مستعان بن عبد سبحان کا نام تذکرہ و رجال کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ یہ کاکوری کے شیخ و فاضل اور عالم کبیر تھے، وہاں کے فقہائے حنفیہ میں ان کو بڑا اونچا مقام حاصل تھا۔ ان کا مولد و منشا کاکوری ہے۔ مولانا محمد اعلم بن شاکر اللہ سندیلوی سے علم حاصل کیا اور اپنے عہد کے عظیم لوگوں میں گردانے گئے۔ حصول علم کے بعد خود درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور خلق کثیر کو مستفیہ فرمایا۔

علم فقہ، منطق و فلسفہ اور اصول و کلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ زہد و تقویٰ، ورع و عبادت، حسن کلام، علو اخلاق اور ذکاوت و فطانت میں خاص طور سے مشہور تھے۔

اس عالم اجل نے غزہ رجب ۱۲۲۷ھ کو وفات پائی۔^{۵۴}

۸۳۔ قاضی محمد معروف مدراسی

تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے مدراس میں قاضی محمد معروف بن عبداللہ مدراسی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اپنے زمانے کی مشہور علمی شخصیت تھے اور ممتاز شیوخ میں شمار کیے جاتے تھے۔ مدراس اور اس کے قریب وجوار میں ان کا بہت

^{۵۳} نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۲، ۴۶۳ بحوالہ الہدیۃ الاحمدیہ۔

^{۵۴} نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۳۔

شہرہ تھا۔ ان کے والد قاضی عبداللہ مدرسہ راسی بھی ہمہ اوصاف موصوف عالم تھے۔ بیٹے نے علوم متداولہ کی ابتدائی اور متوسط کتابیں والد بزرگوار سے پڑھیں پھر قاضی ارتضاعلی گوپاموی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ علم سے فارغ ہونے کے بعد خود درس و افادہ میں مصروف ہوئے اور ایک مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر منصب افتا پر متمکن کیے گئے اور طویل عرصے تک اس نازک اور اہم منصب پر فائز رہے۔ اپنے اُستاد قاضی ارتضاعلی گوپاموی کی وفات کے بعد قاضی القضاة بنا دیے گئے، اس زمانے میں اس بہت بڑے عہدے پر اسی شخص کو متمکن کیا جاتا تھا جو علم فقہ کے تمام گوشوں سے پوری طرح آگاہ ہوتا تھا۔ قاضی محمد معروف مدرسہ راسی کو اس پر اسی لیے فائز کیا گیا کہ وہ دیگر مروج و متداولہ علوم کے علاوہ علم فقہ پر بھی عمیق نگاہ رکھتے تھے۔

ہندوستان کے اس جلیل القدر عالم و فقیہ نے ۲۹ شعبان ۱۲۷۳ھ کو اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی۔^{۸۵}

۸۴۔ مولانا محمد معین انصاری لکھنوی

علمائے فرنگی محل میں مولانا محمد معین بن محمد مبین انصاری لکھنوی نے میدانِ علم کے مختلف پہلوؤں میں بڑی شہرت پائی۔ وہ اپنے عصر کے ممتاز عالم، نامور فقیہ اور معروف شیخ تھے۔ لکھنوی میں ولادت ہوئی اور وہیں تربیت پائی۔ خاندان کے تمام افراد علم و فضل کے زلیوے سے آراستہ تھے۔ اپنے بڑے بھائی مولانا حیدر، چچا زاد بھائی مولانا ولی اللہ اور مفتی ظہور اللہ لکھنوی سے علم حاصل کیا۔ سندِ حدیث مولانا عبدالحفیظ کی حسنی سے لی۔ پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور بہت لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ان کے والد مولانا محمد مبین انصاری لکھنوی ہر جمعے کو مجلس و عظیم منعقد

^{۸۵} نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۶۳ بحوالہ حدیقۃ المرام۔

کرتے تھے، باپ کی وفات کے بعد لائق بیٹے (محمد معین) نے مسند سنبھالی تو انہوں نے یہ سلسلہ وعظ جاری رکھا۔ کثیر تعداد میں لوگ ان کی مجلس وعظ و تذکیر میں شامل ہوتے اور نصیحت حاصل کرتے تھے۔

مولانا محمد معین انصاری اپنے زمانے کے جید عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ علم فقہ اور دیگر موضوعات سے متعلق انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ غایۃ البیان فیما یجمل ویبیرم من الحيوان :- یہ کتاب مسائل فقہ پر مشتمل ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں ان حیوانات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا کھانا شرعی اعتبار سے حلال یا حرام ہے۔

۲۔ غایۃ الکلام فی القراءۃ خلف الام :- یہ فاتحہ خلف الامام کے بارے میں ہے۔

۳۔ ابراز الکنوز فی احوال ارباب الرموز :- حالات اصحاب رموز کے بیان میں۔

۴۔ شرح رسالہ امام نووی۔

۵۔ کتاب حسن حصین :- نا تمام رہی۔

۶۔ حاشیہ صدر :- تاجت بیوی۔

۷۔ معینیہ :- متعلق تحریم اور آیات وراثت کی تفسیر میں۔

۸۔ حاشیہ علی ہدایۃ الحکمة :- شیرازی کی مشہور درسی کتاب ہدایۃ الحکمة

پر حاشیہ۔

علاوہ ازیں بعض دوسری کتابوں پر حواشی و تعلیقات ان سے یادگار ہیں۔

مولانا محمد معین انصاری فرنگی محلّی لکھنوی نے ۲۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۸ھ

کو سفر آخرت اختیار کیا اور باغ مولانا احمد الوار الحق لکھنوی میں دفن ہوئے۔

۸۶ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۸ — تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱، ۲، ۱، ۵، ۱ —

ترجمہ الخواطر ج ۷ ص ۳۶۲ -

۸۵—مولانا محمد نعیم کشمیری

خطہ کشمیر علم و ادراک، تصوف و سلوک اور فضل و کمال کے اعتبار سے اسلامی تاریخ میں ہمیشہ ایک مستقل حیثیت کا حامل رہا ہے۔ اس میں لا تعداد پوریشین علما، بے شمار اصحابِ درس و تدریس اور ان گنت اربابِ فتویٰ و فضا پیدا ہوئے بعض مقامات پر مختلف اوقات میں اور بعض علاقوں میں ایک ہی عہد میں متعدد علماء و فقہانے خدمات انجام دیں اور خلقِ کثیر نے ان سے کسبِ علم اور اخذِ فیض کیا۔

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں اس نواح میں جن حضرات نے فیضِ رسائی کی مسدیں آراستہ کیں، ان میں مولانا محمد نعیم کشمیری کا اسم گرامی کشمیر کی تاریخ میں محفوظ ہے جو کشمیر کے فقہائے احناف میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ والد کا نام نامی محمد مقیم تھا۔

محمد نعیم کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ ان کے چچا مولانا محمد اکبر کشمیری تھے جو بمبئی چلے گئے تھے اور جن کا حلقہ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ ان کی وفات ۱۲۷۲ھ کو بمبئی میں ہوئی اور وہیں ان کا مدفن ہے۔ محمد نعیم نے انہی سے استفادہ کیا اور مرتبہ بلند کو پہنچے۔ ایک اور بزرگ شیخ عبدالرحیم کی صحبت و رفاقت اختیار کی اور ان سے اخذِ طریقت کیا۔

علوم متداولہ کی تحصیل اور تصوف و طریقت کے حصول کے بعد مولانا محمد نعیم نے اپنے علم محترم مولانا محمد اکبر کشمیری کی مسند سنبھالی اور درس و تدریس اور فتویٰ نویسی میں نامور ہوئے۔

مولانا محمد نعیم کشمیری نے ۲۷۔ رمضان المبارک ۱۲۴۷ھ کو انتقال کیا۔

۸۶۔ محمد وجیہ کلکتوی

بہار اور بنگال کے علاقوں کو بے شمار علما و فقہاء کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بالخصوص صوبہ بہار کے بلا و تقصبات اور دیہات میں وسیع پیمانے پر اہل علم نے درس و تدریس کے ہنگامے بپا کیے اور مخلوق خدا کو فیض پہنچایا۔ ان حضرات کے تذکرے فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں ہو چکے ہیں، زیر تصنیف کتاب میں بھی ان علاقوں کے بہت سے ماہرین فقہ اور مصنفین و مدرسین کا ذکر موجود ہے۔ ان خوش بخت حضرات میں ایک بزرگ مولانا محمد وجیہ تھے، جن کے والد کا نام مولا بخش اور دادا کا نام مولا اکبر علی صدیقی بہاری تھا۔ یہ خاندان اصلاً صوبہ بہار سے تعلق رکھتا تھا۔ محمد وجیہ کی ولادت اور نشوونما بھی بہار ہی کے کسی مقام میں ہوئی۔ وہ فقہ حنفیہ کے عالی قدر علما میں سے تھے۔ اپنے عہد کے بہت بڑے شیخ، جلیل القدر عالم اور مانے ہوئے فقیہ تھے۔ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں رئیس المدرسین کے منصب رفیع پر فائز ہوئے اور علما و طلباء کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ کلکتہ میں قیام کی وجہ سے "کلکتوی" کہلائے۔

ابو داؤد کے شارح صاحب عون المعبود مولانا شمس الحق ڈیالوی نے اپنی ایک قلمی کتاب "تذکرۃ النبلا" میں ان کا ذکر کیا ہے اور یہ کتاب نزہۃ الخواطر کے فاضل مصنف سید عبدالحی حسنی کے ذاتی کتب خانے راتے بریلی میں محفوظ ہے۔

مولانا محمد وجیہ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ شیخ عبداللہ السراج مکی ۱۲۵۶ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو ان سے ان کی ملاقات ہوئی تھی، شیخ مکی ان کے علم و فضل اور وسعت معلومات سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی تعریف کی۔

۸۵۵ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۶۶۶ بحوالہ تذکرۃ النبلا۔

۸۷۔ مولانا محمد یعقوب دہلوی

مولانا محمد یعقوب فاروقی دہلوی جید عالم معروف شیخ، ممتاز محدث اور فقیہ تھے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے لڑکے، مولانا محمد فضل کے بیٹے اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۲ رذی الحجہ ۱۲۰۰ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے جلیل القدر نانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی گو و شفقت میں تربیت پائی۔ تفسیر جلالین اور علم نحو کی کتاب شرح جامی کے کچھ حصے ان سے پڑھے۔ باقی کتب درسی شاہ رفیع الدین دہلوی سے پڑھیں۔ سند علم و طریقت شاہ عبدالعزیز سے حاصل ہوئی۔ ایک عرصے تک دہلی میں درس و افادے کا سلسلہ جاری رکھا اور علماء و طلباء کی ایک بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا، جن میں نواب محمد صدیق حسن خاں بھی شامل ہیں۔

۱۲۵۸ھ کو اپنے برادر کبیر حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے ساتھ دہلی سے

ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

یہ حضرات علم و کمال کے اعتبار سے ارض ہند کی شمع فروزاں تھے۔ ان کا وجود باعث برکت اور موجب رحمت تھا۔ ان سے خلق کثیر نے علمی اور روحانی فیوض حاصل کیے اور مرتبہ عالی پایا۔ ان کی فیض رسائیاں صرف برصغیر پاک و ہند تک محدود نہ تھیں، پورا عالم اسلام ان کے فضل و کمال کی فرادانیوں سے سعادت اندوز ہوا۔ آج بالخصوص برصغیر کے مختلف مقامات میں جو

قال اللہ وقال الرسول کی دلنوازا صدا تیں بلند ہو رہی ہیں، وہ انہی پاک باز حضرات کی سعی مسلسل کا نتیجہ ہے۔ ان کے تعلیم و تربیت کے دائرے بہت وسعت پذیر تھے، اس عالم خاکی کی فضاؤں میں ان کے خلوص و للہیت کے جھنڈے ہمیشہ لہراتے رہیں گے اور مخلوق خدا کے علم و ادراک میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا رہے گا۔

اس عالم کبیر، محدثِ جلیل اور فقیہ نامدار نے جو مولانا محمد یعقوب فاروقی دہلوی کے نام سے موسوم تھے، جمعہ کے روز ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

۸۸۔ مفتی محمد یوسف فرنگی محلی

مفتی محمد یوسف بن مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابوالرحم بن مفتی یعقوب

بن عبدالعزیز انصاری فرنگی محلی لکھنوی۔

مفتی محمد یوسف ۱۲۲۳ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی گود میں پرورش پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو اپنے والد مکرم مفتی محمد اصغر انصاری سے تعلیم کا آغاز کیا۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی سے بھی استفادہ کیا اور مفتی نور اللہ لکھنوی کے حضور بھی زانوئے تلمذتہ کیا۔ ان تمام حضرات کو علم فقہ اور دیگر علوم میں دسترس حاصل تھی۔

مفتی محمد یوسف کے والد گرامی مفتی محمد اصغر حکومت اودھ لکھنؤ کی طرف سے وہاں کی عدالت دیوانی میں منصب افتا پر فائز تھے۔ ۱۹۔ رجب ۱۲۵۵ھ کو ان کا انتقال ہوا تو یہ عہدہ جلیلہ لائق بیٹے کے سپرد کر دیا گیا، اس لیے کہ یہ بھی والد کی طرح علم و آگاہی کی منزلیں طے کر چکے تھے اور اصحاب فضل میں شہرہ کیے جاتے تھے۔ ۱۲۷۲ھ تک وہ اس منصب پر متمکن رہے اور نہایت دیانت و امانت سے یہ نازک خدمت انجام دی۔ اسی اثنا میں اودھ کی حکومت ختم ہو گئی اور انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس سے عہدہ افتا کا منصب بھی متاثر ہوا۔ اب وہ تمام امور سے منقطع ہو کر گھر میں بیٹھ گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تقریباً پانچ سال اسی طرح گزر گئے۔

۱۲۷۷ھ کو انھیں جون پور کے اصحاب علم نے دعوت دی اور وہ وہاں کے مدرسہ حنفیہ امامیہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۲۸۶ھ تک وہاں خدمات تدریس انجام

دی۔ اسی اثنا میں حج بیت اللہ کا شوق پیدا ہوا، اور سفر حجاز پر روانہ ہو گئے۔
رمضان کے آخری دنوں میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور شوال کے آخر میں مدینہ منورہ
کا عزم کیا اور مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی۔

مفتی محمد یوسف انصاری فرنگی محلّی دیار ہند کے مشاہیر اور کبار اساتذہ میں سے
تھے۔ درس و افادہ میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور علما و طلبانے ان سے
خوب استفادہ کیا۔

اللہ نے ان کو تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی نوازا تھا، لیکن زیادہ تر
انہوں نے دینی کتابوں پر تعلیقات و حواشی سپرد قلم کیے۔

۱۔ حاشیہ شرح سلم، قاضی مبارک گوپاموی۔

۲۔ حاشیہ شرح سلم، ملا حسن۔

۳۔ حاشیہ شمس بازغہ، ملا محمود جون لوری۔

۴۔ تکلمہ حاشیہ شمس بازغہ، ملا حسن۔

۵۔ حاشیہ برطبعیات الشفاء۔

۶۔ حاشیہ شرح وقایہ تا مبحث مسح بالراس۔

۷۔ تعلیقات تفسیر بیضاوی۔

۸۔ تعلیقات صحیح بخاری۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمے میں ان کے بارے

میں رقم طراز ہیں۔

”علمائے فرنگی محلّی میں مفتی محمد یوسف فرنگی محسلی نے ہنومان گڑھی
کے جہاد کے موقع پر مولوی امیر الدین علی کی تحریک کو حکومت اودھ کے اشارے
پر سخت نقصان پہنچایا۔ مولوی عبدالرزاق فرنگی محلّی کو جہاد سے باز رکھا
مجاہدین کی جماعت میں جہاد کے خلاف وعظ کیا اور جہاد کے خلاف
فتویٰ دیا۔ تذکرہ علمائے فرنگی محسلی نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے۔“

مفتی محمد یوسف کے ملاحسن اور میرزا بدیع العاشی کے چند نسخے دارالمصنفین میں ہیں، جن میں سے ایک پر مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی کے دستخط بتاریخ ۱۲۷۳ھ ثبت ہیں۔

مفتی محمد یوسف حج کے موقع پر مدینہ منورہ گئے تو وہاں بیمار ہو گئے، اور ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ کو وہیں ان کا انتقال ہوا۔ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ ان کے ممتاز شاگردوں میں مولوی محمد فاروق چریا کوٹی شامل ہیں۔

۸۹ — مولانا محمود سورتی

ارض ہند کے جن علاقوں میں مدت مدید تک علم کے جھنڈے گڑے رہے اور جہاں کی فضاؤں میں عرصہ دراز تک اصحابِ فضیلت کے علم لہراتے رہے، ان میں صوبہ گجرات کا شہر سورت بھی شامل ہے۔ اس صوبے کی خاک میں کتنے ہی علم کے خزینے مدفون ہیں اور کتنے ہی فضل و کمال کے حامل افراد اس کی مٹی میں آسودہ ہیں۔ پہلی صدی ہجری سے لے کر اب تک بزرگانِ دین کا ایک جہمِ غفیر وہاں آباد ہوا، جنہوں نے قدم قدم پر اسلام کی شمعیں روشن کیں اور ایک دنیا کو راہِ حق اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی تلقین کی، وہ اپنی اس تلقین اور کوشش میں کامیاب رہے اور ان کی سعی مسلسل اور جذبہ صادق سے اثر پذیر ہو کر ہند کے کنارے بحیرہ عرب سے ہم آغوش ہو گئے۔

قافلہ صدق کے ان ارکانِ باہمت میں تیرھویں صدی ہجری کے مولانا محمود بن عبدالقادر بن عبدالاحد سورتی باعکظہ کا نام بھی صفحاتِ تاریخ میں مرقوم

۸۹ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۲۸۵، ۲۸۶ — تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص

۲۲۰، ۲۲۱ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۳۵ — تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۲۰۶ — احوال

علمائے فرنگی محل ص ۸۲، ۸۳ — حدائق الحنفیہ ص ۲۸۶ -

سے، جو شافعی المسک فقہ تھے اور اصول اور علوم عربیہ میں کامل درک رکھتے تھے۔ محمود باعکظہ سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اپنے عم محترم مولانا ابراہیم بن عبدالاعلیٰ باعکظہ سے علم حاصل کیا جو وقت کے کبار علمائے سورت میں سے تھے اور جن کا انتقال ۲۷ رجب ۱۲۸۲ھ کو ہوا۔ مولانا محمود سورتی نحل علما میں سے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ ان کا تجارتی کاروبار بہت وسیع تھا اور ہر لحاظ سے لوگ ان سے متاثر تھے۔ اس دور کے ہر طبقہ فکر کے لوگ مسائل شرعی میں انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کے فتوے کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

اس فقہی نامہ دار نے غرہ ربیع الاول ۱۲۸۶ھ کو سورت میں وفات پائی۔

۹۰۔ مولانا محمود جون پوری

جون پوری کے شہر جون پور کو شیرازہ منہد کہا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ کسی زمانے میں مجمع علما اور مرکز اہل کمال تھا۔ یہ شہر پورب میں واقع ہے اور علمی اعتبار سے اس کی تاریخ نہایت شان دار ہے۔ سہ دور میں یہ ایک مردم آفریں قطعہ ارض رہا اور اس کی زرخیز مٹی سے بکثرت ادب و فضل پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس کے باکمال ارکان میں سے مولانا محمود بن کرامت علی بن امام بخش صدیقی جون پوری کا نام کتب تذکرہ و رجال میں مذکور ہے۔ یہ مسلکاً حنفی تھے، اور اپنے زمانے کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔

مولانا محمود کی ولادت و تربیت جون پور میں ہوئی۔ ان کے والد گرامی مولانا کرامت علی جون پوری کا شمار اکابر فقہائے منہد میں ہوتا تھا، ان کی وفات ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ کو بنگال کے شہر رنگ پور میں ہوئی۔ لائق بیٹے نے

نہ نزمۃ الخواطر ج ۱، ص ۶۶ بحوالہ حقیقت سورت۔

بہت سی درسی کتابیں باپ سے پڑھیں۔ ان کے بھائی احمد بھی جلیل القدر علما کے زمرے میں گردانے جاتے تھے، کچھ کتابوں کی تکمیل ان سے کی۔ پھر عازم لکھنؤ ہوئے۔ وہاں مفتی یوسف انصاری لکھنوی کا سلسلہ درس جاری تھا اور وہ اپنے عہد اور غلاتے کے کبار اساتذہ میں سے تھے، مولانا محمود جون پوری نے ان سے اکتساب علم کیا۔ ایک بزرگ شیخ عبداللہ قندھاری تھے، ان سے فنون ریاضی کی تعلیم حاصل کی تصوف و سلوک سے بھی لگاؤ تھا۔ اس کے لیے اپنے والد محترم مولانا کرامت علی سے وابستہ رہے۔

علوم رسمیہ اور فنون متداولہ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمود جون پوری نے خود تدریس و تذکیر کا سلسلہ شروع کیا اور اللہ کی مخلوق کو فیض یاب کرنے کی طرح ڈالی۔ بہت اچھے واعظ تھے اور نماز جمعہ کے بعد بالالترام جامع مسجد میں وعظ کتے تھے، جس میں جون پور شہر اور قرب و جوار کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ باہمت اور مستقل مزاج عالم دین تھے۔ ابتدائے قرآن سے سلسلہ وعظ شروع کیا تھا جو طویل عرصے تک چلا۔

مولانا محمود بہت بڑے فقیہ تھے اور علوم میں درک رکھتے تھے متدین و متقی، عابد و زاہد، ذکی و فہم اور صاحبِ ورع و دیانت تھے۔ ۱۲۹۶ھ کی کوئی تاریخ تھی کہ اچانک نمازِ عشا کے بعد روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔^{۹۱}

۹۱۔ مولانا محمود بخش صدیقی کاندھلوی

کاندھلہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر ہے، جس کے متقدم علما فقہاء کا تذکرہ سلسلہ فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں بعض مقامات پر ہو چکا ہے۔ یہ شہر دہلی سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ تیسری صدی ہجری

^{۹۱} مفید المفتی ص ۱۲۵، ۱۲۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۴، ص ۳۶۶

میں کا ندھلہ میں ایک بزرگ مولانا محمود بخش پیدا ہوئے، جن کے والد کا نام شیخ الاسلام، دادا کا قطب الدین اور پردادا کا عبدالقادر تھا۔ نسباً صدیقی تھے۔

مولانا محمود بخش متقی اور صالح عالم دین تھے۔ علم فقہ اور باقی علوم رسمہ میں درک رکھتے تھے۔ صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی کی اولاد سے تھے اور ہر اعتبار سے اچھی شہرت کے مالک تھے۔ کا ندھلہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ ان کے بڑے بھائی اپنے دور کے ذی علم آدمی تھے۔ محمود بخش نے انہی سے تعلیم کا آغاز کیا اور تمام مروجہ علوم کی کتابیں نہایت محنت اور توجہ سے پڑھیں، یہاں تک کہ علم میں سچتگی حاصل ہو گئی، فتویٰ نویسی کے اہل قرار پائے اور تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

مولانا محمود بخش صدیقی کا ندھلوی کا شمار ممتاز علما میں ہوتا تھا۔ حلیم الطبع متواضع، منکسر المزاج، عالی کردار، اخلاقِ حسنہ کی دولت سے مالا مال اور عبادت گزار عالم تھے۔ درس و تدریس کو مشغلہ حیات قرار دے لیا تھا، ہمیشہ اسی میں مصروف رہے اور اسی کارِ خیر میں زندگی بسر کر دی۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا جو تبلیغ اسلام اور ترویج علم کا ذریعہ بنے۔

کا ندھلے کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲۸۵ھ کو وفات پائی۔^{۹۲}

۹۲۔ مولانا محی الدین عثمانی بدایونی

علمائے بدایوں میں مولانا محی الدین عثمانی بدایونی حلقہ اہل علم میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ والد کا نام عبدالقادر اور دادا کا فضل رسول تھا۔ مشاہیر فقہائے احناف میں سے تھے۔ ۱۲۴۳ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ خاندان کے تمام افراد پڑھے لکھے تھے۔ محی الدین نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو والد کے حلقہ درس

میں شامل ہوئے اور کتب و رسوے کی تکمیل کی۔ اخذِ طریقت بھی اپنی سے کیا۔ اپنے مذہب و مسلک میں نہایت متعصب تھے اور مخالفوں پر شدت سے تنقید کرتے تھے۔ اس ضمن میں کسی قسم کی رواداری یا مداریت کے قائل نہ تھے۔ ان کا اصل مشغلہ تصنیف و تالیف اور فتویٰ نویسی تھا۔ اس میں انہوں نے بہت نام پیدا کیا اور مختلف مسائل کی اپنے خاص نقطہ نظر سے وضاحت کی بعض کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ ان کی تعلیقات و حواشی اور تصنیفات میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:-

- ۱۔ حاشیہ میرزا بدرسالہ -
 - ۲۔ حاشیہ کلیات قانون ابو علی سینا -
 - ۳۔ شمس الایمان : رد و ہدایت میں ایک رسالہ -
- مولانا محی الدین بزازوفی نے جو معقولات و منقولات کے ماہر علما میں سے تھے، ۶ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ کو سہارن پور میں داعی اجل کو لبیک کہا۔^{۹۳}

۹۳۔ سید محی الدین ویلوری

جنوبی ہند میں تیرھویں صدی ہجری کے جن علما و فقہانے خداتِ دینی سرانجام دیں ان میں سید محی الدین ویلوری قابل ذکر ہیں۔ ۱۲۰۷ھ ان کا سال ولادت ہے۔ عارف باللہ، عالم اجل اور حافظِ قرآن تھے۔ تفسیر و حدیث اور فقہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن ویلور میں ایک مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ علاقہ مدراس میں علم کی جو روشنی پھیلی، وہ ان کے فیضِ عام کا پرتو ہے۔ ہمیشہ

۹۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۲ ————— نزمۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۷، ۲۶۸۔

تذکرۃ الاصلیین ص ۲۵۵

تعلیم و تدریس کی مسند چھائے رکھی اور علما و طلباء کی کثیر تعداد کو مستفید فرمایا۔
سید ممدوح تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے اور بہت سی کتابوں
کے مصنف تھے، جن میں مندرجہ ذیل کتابوں کے نام کتب تذکرہ درجانی
میں محفوظ ہیں۔

۱۔ جواہر الحقائق۔

۲۔ فصل الخطاب۔

۳۔ جواہر السلوک۔

اس نامور عالم و فقیہ نے ۳۔ محرم ۱۲۸۹ھ کو مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔
وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے مولوی رکن الدین باپ کے جانشین
ہوئے۔

۹۴۔ شاہ مخصوص اللہ دہلوی

فانداں ولی اللہی کے ممتاز رکن شاہ عبدالرحیم دہلوی کے پرپوتے، شاہ
ولی اللہ کے پوتے اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے بیٹے شاہ مخصوص اللہ دہلوی
بہت سی خصوصیات کے حامل تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تہذیب و تقویٰ، رشد و صلاح، زہد و عبادت اور فقاہت و فراست
میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مدرسے
میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ ان کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرستیں
حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کا اسم گرامی شامل ہے۔

جدل و نزاع سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ کبھی کوئی ایسی بات نہ کی جو
دوسرے کے لیے تکلیف و اذیت کا باعث ہو۔ تدریس و تعلیم اور تبلیغ و

۹۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۲۔

اشاعت کا وہی انداز اختیار کیے رکھا جو آبا و اجداد کا تھا۔ دہلی میں جب وہا بیت اور اصحاب مقابر کے درمیان نزاع پیدا ہوا، اور فریقین کے اسلوب کلام میں شدت آئی تو شاہ صاحب ممدوح نے خاموشی کو ترجیح دی اور اپنی توجہ صرف درس و تدریس تک محدود رکھی۔ آخر عمر میں سلسلہ درس و تدریس سے بھی کنارہ کش ہو گئے تھے اور گوشہ نشینی اختیار کر کے صرف ذکر الہی اور اللہ کی عبادت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان کی زندگی نمونہ اسلاف تھی۔ تمام علوم متداولہ پر یکساں عبور تھا۔

۱۸۵۷ء کا منگامہ قمری حساب سے رمضان ۱۲۷۳ھ میں بپا ہوا تھا۔ تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق شاہ صاحب نے اسی سال یعنی ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی، مہینے اور تاریخ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن نزہۃ الخواطر میں بتایا گیا ہے کہ جنگ آزادی سے تقریباً دو سال قبل ۱۳۔ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔^{۹۵}

۹۵۔ مولانا مراد اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے انصاری خاندان میں ایک بزرگ مولانا مراد اللہ بن نعمت اللہ بن نور اللہ انصاری لکھنوی گزرے ہیں جو علم و شیخت اور فقاہت میں تیرھویں صدی ہجری میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے اور فقہائے حنفیہ میں مختلف علوم سے متعلق خاص شہرت کے مالک تھے۔

مراد اللہ کا مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ ان کے والد مفتی نعمت اللہ لکھنوی تھے جو اپنے عہد کے جید عالم تھے اور علم و فضل کی وجہ سے فیض آباد کے منصب افتا

^{۹۵} تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۸، ۲۶۹

حیات دلی ص ۶۳۲، ۶۳۵۔ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۱۳، ۱۱۴

پر ممکن ہو گئے تھے۔ مراد اللہ نے اپنی سے علم حاصل کیا اور ایک عرصے تک ان سے منسک رہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد لکھنؤ میں خود مسند تدریس آراستہ کی اور طویل مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بہت سے علما و طلبانے ان سے استفادہ کیا۔

لکھنؤ سے عازم گجرات ہوئے اور بڑودہ میں سلسلہ درس شروع کیا۔ وہاں بھی کثیر تعداد میں اہل علم ان سے استفادہ ہوئے۔ وہیں سے ۱۲۷۹ھ کوچ بیت اللہ کا عزم کیا اور حج و زیارت کی نعمت سے مستمع ہوئے حجاز سے واپس وطن آ رہے تھے کہ مرض اسہال میں مبتلا ہوئے اور اسی عارضے سے اپنے والد (مفتی نعمت اللہ) کی زندگی میں وفات پائی۔ ان کا سن وفات ۱۲۸۱ھ ہے۔

مفتی نعمت اللہ کا انتقال اس سے اٹھارہ سال بعد ۱۲۹۹ھ کو ہوا
رحمہا اللہ تعالیٰ۔

۹۶۔ سید مرتضیٰ حسینی لکھنوی

لکھنوی کے ایک اور عالم سید مرتضیٰ بن مصطفیٰ بن اسد علی بن عبد الباقی بن محی الدین حسینی لکھنوی تھے، جن کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر فقہاء اور جید علما میں ہوتا تھا۔

سید مرتضیٰ حسینی کی نشوونما لکھنؤ شہر میں ہوئی اور اپنے چچا سید محمد حسینی سے جو اس دور کے ممتاز عالم اور مدرس تھے، حصول علم کا آغاز کیا۔ حدیث اور فقہ کی کتابیں اپنی کے حلقہ درس میں پڑھیں پھر منطق اور فلسفے کی طرف

متوجہ ہوئے تو اس کے لیے مولانا محمد مبین انصاری لکھنوی سے رجوع کیا اور ان کی خدمت میں رہ کر ان علوم کی تکمیل کی۔ پھر دل میں علم طب کے حصول کا شوق پیدا ہوا تو اس عہد کے مشہور طبیب حکیم رضی الدین امر و ہوی کے دروازے پر دستک دی اور ان سے علم طب پڑھا۔

سید مرتضیٰ حسینی تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں انگریزوں کی سفارت میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں کلکتے بھی گئے اور ایک عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے اور ادھک کے نواب سعادت علی خاں کے دور حکومت میں لکھنؤ کی مسند افتا پر متمکن ہوئے اور وہاں کے مفتی قرار پائے۔

اب سفر حیات نے ایک اور موڑ کاٹا اور غازی الدین حیدر کے ایام حکومت میں امیر المجاہدین سید احمد شہید سے رابطہ قائم ہوا۔ ان کے تدبیر و تقویٰ سے متاثر ہو کر ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں منصب افتا سے استعفیا دے دیا تھا اور تمام علاقوں سے منقطع ہو کر یاد خدا کو سہمہ وقتی معمول ٹھہرا لیا تھا۔

سید مرتضیٰ حسینی کی ایک تلمیذ کتاب کا نام کثکولاً ہے جس میں صرف و نحو لغت و بلاغت اور علوم ادبیہ کے اہم مسائل جمع کیے گئے ہیں۔ سید ممدوح کا خط نہایت عمدہ تھا۔

اس عالم و فقیہ نے جمعہ کے روز ۸۔ شوال ۱۲۵۰ھ کو لکھنؤ میں وفات

پائی۔

۹۷۔ سید مرتضیٰ بگرامی زبیدی

ارض ہند کے جن اصحاب علم اور ادب کمال کی شہرت پوری اسلامی دنیا

۹۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۷۰۔

میں پھیلی، ان میں سید مرتضیٰ بن محمد بن قادری بن ضیاء اللہ حسینی واسطی بلگرامی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے شیخ و امام، عالم و محدث اور ماہر فقہ و لغت تھے۔ علم نحو، ادب و معانی، اصول و کلام اور انساب میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ شعر و شاعری میں درک حاصل تھا۔ وہ ہندوستان کی سکونت ترک کر کے علاقہ ہین کے ایک مقام ”زبیدی“ میں جا بے تھے، اس لیے زبیدی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں بلگرام کے بہت سے اہل علم کا تذکرہ ہو چکا ہے، اس شہر میں متعدد علما و فقہا اور ادبا نے جنم لیا اور اپنی بے پناہ خدمات کی بنا پر بے حد شہرت پائی۔

بلگرام فصل و کمال کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے۔ یہ ایک مردم خیز شہر تھا۔ نہایت ذہین و فطین لوگ اس میں پیدا ہوئے۔ اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع ہردوئی کا ایک بہت قدیم اور مشہور قصبہ ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ٹھٹیرے آباد تھے، جن کو قنوج کے راجپوتوں نے حملہ کر کے شہر سے نکال دیا تھا اور اس پر اپنا تسلط جمایا تھا۔ مغلوں کے دور حکومت میں بلگرام، قنوج سرکار کے ماتحت ایک پرگنہ تھا۔

محمود غزنوی نے جب ہندوستان پر حملے کیے تو ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) میں قاضی محمد یوسف عثمانی گاڈرونی نے اس شہر کو فتح کیا اور یہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ غزنوی سلطنت زوال پذیر ہوتی تو مقامی ہندوؤں نے مسلمان حکمران کو بلگرام سے مار بھگایا اور اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس وقت بلگرام کا حاکم راجہ سری کو بنایا گیا تھا، اس نے اس شہر کا نام بدل دیا اور اپنے نام پر اس کا نام ”سری نگر“ رکھا۔

سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں ابو الفرج واسطی کے ایک جانشین سید محمد صغریٰ نے ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں ایک مضبوط اور مسلح شاہی

فوج کے ساتھ بگرام پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ مسلمانوں کا اس پر دوبارہ قبضہ تھا۔ اب اس کا نام بدل دیا گیا اور اسے سری نگر کے بجائے پھر بگرام کہا جانے لگا۔

۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) کو اس شہر میں مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجوں کے درمیان زبردست معرکہ ہوا تھا، جس میں ہمایوں کی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ۱۰۰۲ھ کو جلال الدین اکبر بادشاہ نے ایک فرمان کے ذریعے اس شہر میں شراب اور دیگر منشیات کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔

بگرام کے سادات جو وہاں کے عثمانی اور فرشوری شیوخ پر ہمدان میں سبقت لے گئے تھے، تصنیف و تالیف، علم و ادراک، شعر و ادب اور عمل و تدبیر میں ممتاز ہوئے۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات نے بالخصوص بہت نام پایا۔

۱۔ سید محمد طاہر بگرامی :- متعدد اوصاف علمی کے حامل تھے۔ ۹۵۰ھ کو وفات پائی۔

۲۔ میر سید عبد الواحد بگرامی :- کئی کتابوں کے مصنف اور شارح ہیں، شاہدی تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک مشہور کتاب بیع سائل ہے۔ ۳ رمضان المبارک، ۱۰۱۷ھ کو فوت ہوئے۔

۳۔ سید فیروز بگرامی :- ممتاز فقیہ اور عالم تھے۔ ۵ محرم ۱۰۶۶ھ کو رحلت فرمائی۔

۴۔ قاضی یوسف بگرامی :- عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بگرام کے منصب قضا پر متمکن تھے۔ ۵ ذیقعدہ ۱۰۸۴ھ کو انتقال ہوا۔

۵۔ سید ضیاء اللہ بگرامی :- علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ ۲۵ شعبان ۱۱۰۴ھ کو عالم آخرت کی راہ لی۔

- ۶۔ میر سید عبدالواحد بلگرامی ہے :- واحد اور ذوقی ان کا تخلص تھا۔ ہندی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ۲ محرم ۱۱۳۴ھ کو قتل ہوئے۔
- ۷۔ سید عبدالجلیل بلگرامی ہے :- علامہ وقت اور شیخ دوراں تھے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ کو دہلی میں انتقال ہوا، اور ان کی وصیت کے مطابق ۶ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۸ھ کو ان کی میت بلگرام لے جا کر ان کے والد میر سید احمد بلگرامی کے پہلو میں دفن کی گئی۔
- ۸۔ سید طفیل محمد بلگرامی ہے :- معقول و منقول کے جامع تھے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔
- ۹۔ سید طیب بلگرامی ہے :- فضلا و شیوخ میں سے تھے۔ ۱۵ رجب ۱۱۵۲ھ تاریخ وفات ہے۔
- ۱۰۔ سید ال محمد بلگرامی ہے :- علوم ظاہری و باطنی اور فقہ میں اُدیچے مرتبے کے مالک تھے۔ ۱۵ رمضان ۱۱۶۴ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔
- ۱۱۔ میر سید محمد شاعر بلگرامی ہے :- جلیل القدر عالم اور بہترین شاعر تھے۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۱۰۱ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۱۸۵ھ کو انتقال کیا۔
- ۱۲۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی ہے :- دیارِ ہند کے نہایت مشہور عالم اور بہت بڑے مصنف، مورخ اور شاعر تھے۔ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ کو وفات پائی۔
- ۱۳۔ سید علی بلگرامی ہے :- مشہور فرانسیسی محقق ڈاکٹر لبنان کی کتاب کا ”تمدن عرب“ کے نام سے ترجمہ کیا۔ ۱۳۲۹ھ کو ہردوتی میں فوت ہوئے۔ اسی بلد علم و عرفان کے ایک بزرگ سید مرتضیٰ بلگرامی تھے، جن کے آبا و اجداد عراق کے شہر ”واسط“ کے رہنے والے تھے۔
- سید مرتضیٰ ۱۱۴۵ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو

اپنے شہر (بگرام) کے اساتذہ سے حصولِ علم کا آغاز کیا۔ پھر وہاں سے نکلے اور یوپی کے ایک شہر "سندیلیہ" پہنچے۔ سندیلیہ کے بعض علما سے استفادہ کرنے کے بعد خیر آباد کا اعزاز کیا اور وہاں کے اہل علم سے مستفید ہوئے۔ خیر آباد سے الہ آباد گئے، الہ آباد میں اس وقت دیارِ ہند کے ممتاز عالم مولانا محمد فاخر الہ آبادی کا ہنگامہ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے۔ بعد ازاں دہلی کے لیے رختِ سفر باندھا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حلقہٴ تدریس میں شرکت کا اعزاز حاصل کیا، پھر "سورت" پہنچے، جسے اس زمانے میں اہل کمال کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ وہاں مولانا خیر الدین بن زاہد سورتی کے دائرہٴ شاگردی میں شمولیت کی اور سال بھر وہاں اقامت گزری رہے۔ سورت سے ۱۱۶۲ھ کو حجاز مقدس روانہ ہوئے، وہاں سے "زبیدیہ" کا عزم کیا جو علاقہٴ یمن میں واقع ہے اور جسے اُس عہد میں "دارالعلم" کی حیثیت حاصل تھی۔ زبیدیہ کے متعدد علما و اساتذہ کے حضور دامنِ ادب تہہ کیا۔

سید مرتضیٰ کو چاروں مذاہبِ فقہ کے علما و مشائخ سے سند و اجازہ کا شرف حاصل ہوا اور مختلف بلاد و امصار کے اہل علم سے استفادے کے مواقع میسر آئے۔ ان کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے اور یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے عصر اور علاقوں میں علمی اعتبار سے بہت اونچے درجے کے مالک تھے۔ سید مدوح متعدد مرتبہ مکہ مکرمہ گئے اور انہوں نے کئی حج کیے، وہاں کے بہت سے اصحابِ فضل سے ملاقات کی اور ان سے مستفید ہوئے۔ پہلی دفعہ ۱۱۶۴ھ کو مکہ مکرمہ گئے تو سید عبدالرحمن عیدروس سے ملاقات ہوئی اور ان سے بعض کتابوں کا درس لیا اور پھر ان سے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔

سید عبدالرحمن عیدروس وسیع القلب اور عالی فکر عالم تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے سید مرتضیٰ کے سامنے مصر کے علما و ائمہ اور ادبا و شعرا کی اس انداز سے تعریف کی کہ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور حریمِ دل میں مصر جانے اور وہاں

کے اہل علم سے ملاقات کا شوق کروٹ لینے لگا چنانچہ وہ ۹ صفر ۱۱۶۷ھ کو مصر پہنچے اور وہاں کے ایک مقام "خان الصاعہ" میں اقامت اختیار کی۔ اُس وقت مصر میں بہت سے جید علماء مصروفِ استفادہ تھے، سید مرتضیٰ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے فیض حاصل کرنے لگے۔ ان تمام علماء و اساتذہ نے ان کو سند و اجازہ سے مفتخر فرمایا اور اس ہندی عالم کے علم و فضل، ہوشیاری، حفظ و القان، فہم و فراست، وسعتِ نظر اور عمیق فکر کا لوہا مانا اور حدیثِ فقہ میں ان کے عبور و استحضار کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ اب مزید تعلیم اور علماء سے ملاقات کے لیے انھوں نے علاقہ مصر کے دیگر مقامات کا رخ کیا۔ وہ "رشید" اور "دمیاط" پہنچے اور وہاں کے اہل علم سے سماعِ حدیث کیا۔ پھر "اسیوط" اور "بلاد صعید" گوروانہ ہوتے اور وہاں کے علماء سے شرفِ لقا حاصل کیا۔

کم و بیش تین سو علماء سے مستفید ہونے کے بعد انھوں نے شادی کی اور "عظمت الغسال" میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں ایک ایسی عظیم الشان کتاب کی تصنیف کا آغاز کیا جس کی وجہ سے ان کی شہرت دُور و نزدیک پھیل گئی اور عالم اسلام کے تمام اطراف و اکناف میں ان کے علوم مرتبت اور رسوخ فی العلم کی دھوم مچ گئی۔ یہ کتاب لغت سے متعلق ہے اور اس کا نام "تاج العروس" ہے۔ یہ کتاب انھوں نے دس ضخیم جلدوں میں مکمل کی اور اس کی تصنیف پر چودہ سال دو مہینے صرف ہوئے۔ اس کی تصنیف کے بعد مصنف نامدار نے ایک عظیم دعوت کا اہتمام کیا، جس میں بہت سے شیوخ وقت، علمائے عصر اور طلبائے علم شریک ہوئے، جنھوں نے بالاتفاق ان کی فضیلتِ علمی، وسعتِ معلومات اور فن لغت میں ان کی مہارتِ تامہ کی شہادت دی اور ان کے فضل و کمال کو بے حد خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کے تبحر علمی کی دل کھول کر تعریف کی اور ان کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کیا اور انھیں مستحقِ تعظیم و تکریم گردانا۔

۱۱۸۹ء کے اوائل میں وہ قاہرہ (مصر) کے ایک علاقہ "سولقیۃ اللالہ" میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں کے علما و زعمائے ان سے از حد اکرام و توقیر کا برتاؤ کیا اور بہت سے ہدایا و تحائف ان کی خدمت میں پیش کیے۔ اس علاقے میں انھوں نے ہندو مواعظت کا سلسلہ شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اس نواح میں ان کی شہرت پھیل گئی اور قرب و جوار سے عوام و خواص کثیر تعداد میں ان کی مجالس علمیہ میں حاضر ہونے لگے۔ وہ چونکہ غیر ملکی تھے اور ان کی وضع قطع علمائے مصر سے ہم آہنگ نہ تھی۔ پھر وہ فارسی، ترکی اور کرجی زبانوں سے بھی خوب آشنا تھے اور ان میں وانی سے گفتگو کرتے تھے، لہذا لوگوں نے ان کی بہت مالی امداد کی اور انھیں مال و دولت سے بے نیاز کر دیا۔

اس علاقے میں علمی اعتبار سے ان کا اس درجے شہرہ ہوا کہ وہاں کے علما و طلباء اچھی خاصی تعداد میں ان سے درسِ حدیث لینے لگے اور اس باب میں چند ہی روز میں وہ مرجعِ خلائق ہو گئے۔

وہ حاضرینِ مجلس کو حدیث مسلسل بالاولیۃ سُناتے اور اس سماع کی بنا پر انھیں تحریری سند و اجازہ مرحمت فرماتے۔ ایک مرتبہ چند علمائے ازہران کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازہ کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا "بنیادی کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے" چنانچہ انھوں نے آپ سے تنہائی میں صحیح بخاری پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ صحیح بخاری کا درس شروع ہوا تو بہت سے علما اس میں شریک ہونے لگے، جن میں بعض کتب خانوں کے مہتمم اور مساجد کے متولی بھی تھے۔ اس سے سید مرتضیٰ کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا، اور اہل علم کے حلقوں میں ان کو پہلے سے کہیں زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ حاضرینِ درس کی تعداد بہت بڑھ گئی اور دور و نزدیک سے علما و طلباء استفادے کی غرض سے شاملِ درس ہونے لگے۔ صحیح بخاری کے اس درس میں وہ ایسے علمی و فنی اور لغوی و فقہی نکات بیان کرتے جو اس

قبل مصر کے مدرسین و اساتذہ نے کسی سے نہ سُننے تھے۔ لوگ اس سے نہایت متاثر بھی ہوتے اور ان کے وسعتِ معلومات پر اظہارِ تعجب بھی کرتے۔ ان کا اسلوبِ کلام اور اندازِ بیان ایسا تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل کی پیچیدہ گہری معین کے سامنے کھلتی چلی جاتیں۔

صحیح بخاری کے اس درس کے علاوہ شہر کی ایک بڑی مسجد میں ایک اور درس کا انتظام کیا گیا۔ اس درس کے لیے ہفتے میں کچھ دن مقرر تھے۔ جن دنوں بخاری کا درس نہیں ہوتا تھا، ان دنوں میں نمازِ عصر کے بعد سید مرتضیٰ شمائل ترمذی پڑھاتے تھے۔ اس درس کی وجہ سے ان کی شہرت و عظمت کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ درس کا طریقہ مصری علما کے مروجہ طریقے سے مختلف تھا، اس لیے طلباء و علما اس میں کثیر تعداد میں شریک ہوتے اور بہت دلچسپی لیتے۔ علاقے کے بعض متمول افراد اور اصحاب ثروت نے بھی اپنے گھروں میں ان کے درس و تدریس کا انتظام کیا۔ جب وہ درس کے لیے کسی کی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے تو اونچے ذہن و فکر کے کچھ طلباء اور مقرر اور کاتب ان کے ساتھ ہوتے۔ درس کے وقت ان کے سامنے عیبر، عود اور لوبان جلایا جاتا اور تمام صحن یا کمرہ درس خوشبو سے معطر ہو جاتا۔ درس کے اختتام پر سید مرتضیٰ اپنے خاص انداز سے درود شریف پڑھتے اور پھر تمام شکر کائے درس کے نام لکھ لیے جاتے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کے نام بھی ضبط تحریر میں لائے جاتے، دن اور تاریخ بھی لکھی جاتی اور آخر میں سید مرتضیٰ ناموں کی اس فہرست کے نیچے اپنے دستخط ثبت فرماتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔

۱۱۹۱ھ میں عبدالرزاق آفندی جو اپنے علاقے کے بہت بڑے رئیس تھے، روم (ترکی) سے مصر تشریف لائے۔ ان کو سید مرتضیٰ کے درسِ حدیث کا پتہ چلا اور اس کی شہرت ان کے کانوں تک پہنچی تو ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور ان سے مقاماتِ حریری پڑھانے کی درخواست کی۔ چنانچہ ان کی درخواست منظور ہوئی

اور وہ مقامات حریری پڑھنے لگے۔ سید ممدوح اس طریقے سے انہیں مقاماتِ حریری پڑھاتے کہ الفاظ کے لغوی معنی ان کے ذہن میں پرویت ہوتے چلے جاتے۔ ایک دفعہ محمد پاشا ان کی خدمت میں آیا اور پہلی ہی ملاقات میں ان کی فراوانی علم سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان کی کفالت اپنے ذمے لے لی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کے تبحرِ علمی کا ہر سو چرچا تھا اور اہل علم پر ان کے فضل و کمال کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ دُور دراز کے قبائل کے لوگ ان سے پوری طرح باخبر ہو گئے تھے۔ تمام اسلامی ملکوں کے اساتذہ و علما ان سے متاثر ہو کر عرب تھے اور ہر علاقے میں ان کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا مختلف ممالک و قبائل کے اربابِ علم اور اصحابِ حکومت کی طرف سے انہیں خطوط آتے اور مخالف پیش کیے جاتے تھے۔ حجاز، ترکی، ہندوستان، یمن، نجد، شام، بصرہ، عراق، سوڈان، فران اور الجزائر وغیرہ ممالک کے سلاطین و امرا کی طرف سے خطوط اور نوڈ آتے اور ہر ملک کی جانب سے وہاں کا کوئی خاص شخص نہایت عقیدت و احترام سے ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ ایک مرتبہ حاکمِ فران نے ایک عجیب و غریب شے پیش کی، جس کی شکل بھیر کی سی تھی اور سر پھڑے کا سا۔ یہ تحفہ سید مرتضیٰ نے سلطانِ ترکی عبدالحمید کی اولاد کو بطور ہدیہ بھیج دیا تھا۔

عرب کے مغربی ممالک کے لوگ تو ان سے انتہائی متاثر تھے اور کہا کرتے تھے کہ جو شخص حج کرنے گیا اور مرتضیٰ زبیدی کی زیارت سے محروم رہا تو گویا اس کا حج ادھورا رہا۔ ایامِ حج میں ان کی قیام گاہ پر لوگوں کا ہمیشہ ایک ہجوم رہتا اور ہر شخص کے ہاتھ میں سید مرتضیٰ کے نام ایک خط ہوتا۔ جس شخص کو سید ممدوح کی طرف سے اس کے خط کا تحریری جواب مل جاتا، وہ اس کو نہایت متبرک سمجھتا اور بحفاظت تمام اپنے پاس رکھتا اور اسے اپنے سفرِ حج کی نشانی قرار دیتا۔ وہ یہ بھی یقین رکھتا کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ جس شخص کو اس کے خط کا جواب نہ ملتا وہ حسرت و افسوس کا اظہار کرتا اور لوگ اُسے لائقِ ملامت ٹھہراتے۔

سید مرتضیٰ بہت بڑے شاعر بھی تھے اور ان کے شعر بہت مشہور ہیں، ان کی
 اولیہ نے ۱۱۹۲ھ کو وفات پائی۔ اس سے وہ نہایت مغموم ہوئے۔ اس موقع
 پر انھوں نے بعض انتہائی دردناک شعر کہے جن میں سے چند شعریاں درج کیے جاتے ہیں:

مصنعت فرضت عنی بہا کل لذة تقدیرہا عینائی فالقطعاً معاً
 لفتد شربت کامنا سنشرب کلنا کما شربت لم یجد عن ذاک مدفعاً
 فن مبلغ صبحی بکفة انفی بکیت فلم اترک لعینی مدمعاً

یعنی وہ اس دنیا سے چلی گئی اور اس کے جانے کے ساتھ ہی دنیا کی تمام
 لذتیں ختم ہو گئیں۔

اس نے موت کا پیالہ پی لیا اور عنقریب ہم سب اسے اسی طرح پئیں گے
 جیسا کہ اس نے پیا، موت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

میرے دوستوں میں سے کتے میں کون یہ پیغام پہنچائے گا کہ میں اتنا رویا
 کہ آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ باقی نہ رہا۔

بیوی کی وفات ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا اور اس صدمے سے وہ اتنے متاثر
 ہوئے کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ اس کے
 بعد کسی کے تحفے تحائف قبول نہیں کیے۔

سید مرتضیٰ زبیدی کا جسم کمزور اور رنگ سنہری تھا۔ داڑھی معتدل اور
 باریک تھی۔ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے اور خوش و خرم رہتے تھے۔ لیکن بیوی کی وفات
 کے بعد چہرے سے خوشی کے آثار معدوم ہو گئے تھے اور حزن و ملال کے نشان
 ابھرتے تھے۔

ان کی تصنیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہے جن میں سے بعض چھپ چکی
 ہیں اور بہت سی بصورتِ مخطوطات بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ کتا ہیں
 مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ اطفال السادة المتقين بشرح احياء علوم الدين :- یہ مطبوعہ ہے۔

مطبع امینیہ قاہرہ نے ۱۳۱۱ھ کو بیس ضخیم جلدوں میں شائع کی۔ فاس (مراکش) میں ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۰۴ھ تک تیرہ جلدوں میں طبع ہوئی۔

۲۔ تاج العروس فی شرح القاموس :- فن لغت میں نہایت عمدہ تصنیف ہے جو دس ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے، جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، مصنف شہیر نے یہ کتاب چودہ سال اور دو مہینے میں مکمل کی۔ اس کتاب کی وجہ سے انھوں نے انتہائی شہرت حاصل کی اور یہ کتاب اہل علم میں بہت مقبول ہوئی۔ ان کی زندگی ہی میں اسے قبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ بادشاہ روم (ترکی) نے کتابت کرا کے اپنے کتب خانے میں محفوظ کیا۔ ایک نسخہ سلطان دارفور نے لکھوایا۔ ایک نسخہ سلطان مغرب نے اپنے لیے کتابت کرایا۔ ایک امیر اللواء محمد بیگ ابوالاہیہ نے طلب کیا اور اپنی مسجد کے اس کتب خانے میں محفوظ کیا جو جامع ازہر کے قریب ہے۔ یہ نسخہ اُس نے ایک ہزار رباں میں حاصل کیا تھا۔ یہ کتاب اب جدید انداز میں کویت سے شائع ہو رہی ہے۔ کئی جلدیں چھپ چکی ہیں۔ چوبیس جلدوں میں مکمل ہو گئی۔

۳۔ تکمیلہ القاموس :- ان الفاظ کی لغوی تشریح جو تاج العروس میں درج ہونے سے رہ گئے تھے اور بعد میں درج کیے گئے۔

تاج العروس پر اس دور کے متعدد اصحاب علم نے نظم و نشر میں تقریبات لکھیں، جن میں شیخ عبدالرحمن عیدروس (متوفی ۱۱۹۲ھ) شیخ حسن البداوی (متوفی ۱۲۰۲ھ) شیخ عطیہ الجھوری (متوفی ۱۱۹۰ھ) شیخ عیسیٰ البداوی (متوفی ۱۱۸۲ھ) شیخ محمد بن ابراہیم العونی (متوفی ۱۱۹۱ھ) شیخ حسن الہواری (متوفی ۱۲۱۰ھ) شیخ علی بن صالح الشاوری (متوفی ۱۱۸۵ھ) شیخ محمد الجنبیر تباوی (متوفی ۱۲۰۰ھ) شیخ علی صعیدی (متوفی ۱۱۸۹ھ) شیخ احمد الزردیر (متوفی ۱۲۰۱ھ) شیخ علی القناوی (متوفی ۱۱۹۸ھ) اور شیخ محمد بغدادی مشہور بہ السویدی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

۴۔ الجواہر المنیفة فی اصول اولیة مذهبہ الامام ابی حنیفہ : - ۱۲۹۲ھ
 کو مصر سے شائع ہوئی۔ اس میں حضرت امام ابو حنیفہ کے مذہب فقہی کی احادیث
 رسولؐ سے تائید کی گئی ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں
 ایمانیات اور حصہ ثانی میں عبادات کا بیان ہے۔ احاف کے نقطہ نظر
 سے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

۵۔ تنبیہ المعارف البصیر علی اسرار حزب الکبیر : - مصر میں طبع
 ہوئی۔ ابو الحسن شاذلی کی حزب الکبیر کی شرح ہے۔

۶۔ نشوة الارتیاح فی بیان حقیقة المیسر القداح : - ۱۳۰۲ھ
 کو لیدن میں چھپی۔

۷۔ بلغة الاریب فی مصطلح آثار الحبیب : - ۱۳۱۶ھ کو مصر میں
 طبع ہوئی۔

۸۔ شرح حدیث ام زرع -

۹۔ رفع الکمال عن العلل -

۱۰۔ تخریج حدیث شیبنتی ہود -

۱۱۔ تخریج حدیث نعم الام الخل -

۱۲۔ المواہب الجلیہ فیما يتعلق بمحدث الاولیہ -

۱۳۔ المرقاة العلیہ بشرح الحدیث المسلس بالاولیہ -

۱۴۔ العروس المجلیہ فی طرق حدیث الاولیہ -

۱۵۔ حسن المحاضرہ فی آداب البحت والمناظرہ -

۱۶۔ انالۃ المتی فی سرا لکنی -

۱۷۔ القول المبتوت فی تحقیق لفظ التابوت -

۱۸۔ رسالہ فی اصول الحدیث -

۱۹۔ رسالہ فی اصول المعنی -

۲۰۔ کشف المغطی فی الصلوٰۃ الوسطیٰ -

۲۱۔ الاحتفال بصوم الست من شوال -

۲۲۔ ایضاح المدارک عن نسب لعواتک -

۲۳۔ اقرار العین بذكر عن نسب الی الحسن والحسین -

۲۴۔ الابتہاج بذكر امر الحاج -

۲۵۔ الفيوضات العلیہ بہا فی سورة الرحمن من اسرار الصیغۃ الالہیہ -

۲۶۔ التصریف ضروری علم التعرف -

۲۷۔ العقد الثمین فی طرق اللباس والتلقین -

۲۸۔ اتحاف الاصفیاء بسلاسل الاولیاء -

۲۹۔ اتحاف بتی الزمن فی حکم قہوۃ الیمن -

۳۰۔ اتحاف الاخوان فی حکم الدخان -

۳۱۔ المقاعد العندیہ فی شاہد النقشبندیہ :- یہ ایک سو پچاس

اشعار پر مشتمل ہے -

۳۲۔ الدرۃ المضیہ فی الوصیۃ المرضیہ :- دو سو بیس اشعار

پر مشتمل ہے -

۳۳۔ ارشاد الاخوان الی الافلاق الحسان :- ایک سو بیس اشعار -

۳۴۔ الفیۃ السند :- پندرہ سو اشعار اور دس کراسوں پر محتوی -

۳۵۔ شرح صیغۃ ابن مشیش -

۳۶۔ شرح صیغۃ البدوی -

۳۷۔ شرح ثلاث صیغ :- ابو الحسن البکری کی ثلاث صیغ کی شرح -

۳۸۔ شرح سبع صیغ المسمیٰ بدلائل القرب :- سید مصطفیٰ البکری کی

صیغ کی شرح -

۳۹۔ الاذہار المتناثرہ فی الاحادیث المتواترہ -

- ۲۰ - تحفة العید -
- ۲۱ - تفسیر سورة یونس علی لسان القوم -
- ۲۲ - لقطۃ العجلان فی لیس فی الامکان ابداع مباحث -
- ۲۳ - القول الصحیح فی مراتب التعذیل والتجریح -
- ۲۴ - التحطیر فی حدیث المسلسل بالتکبیر -
- ۲۵ - الامالی الحنفیہ :- یہ کتاب ایک جلد میں ہے اور اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں محفوظ ہے -
- ۲۶ - الامالی الشیخونیه :- دو جلدوں میں ہے اور قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں محفوظ ہے -
- ۲۷ - معارف الابرار فیما للکنی والالقباب من الامرار -
- ۲۸ - العقد المنظم فی امہات النبی صلی اللہ علیہ وسلم -
- ۲۹ - الفوائد الجلیلہ علی مسلسلات ابن عقیلہ -
- ۳۰ - النغمة القدسیہ بواسطة البضعة العید روسیہ -
- ۳۱ - حکمة الاشراف الی کتاب الافاق :- اس کا قلمی نسخہ قاہرہ میں موجود ہے -
- ۳۲ - شرح الصدر فی اسماء اهل البدر -
- ۳۳ - التفتیش فی معنی لفظ الدرولش -
- ۳۴ - رفع نقاب الخفایع من انتمی الی وفاء وای وقار -
- ۳۵ - اعلام الاعلام بمناسک حج بیت اللہ الحرام -
- ۳۶ - رشف سلاف الرجیق فی نسب حضرة الصدیق -
- ۳۷ - القول المبتوت فی تحقیق لقطۃ یاقوت -
- ۳۸ - لفظ اللی من الجوهر العالی :- یہ استاد حق کی اسانید میں ہیں جس کی اجازت مصنف شہیر کو ۱۱۶۷ھ میں ملی، جس سال کہ وہ مصر گئے -
- ۳۹ - ہدیۃ الاخوان فی شجرة الدخان -

۶۰ - اتحاف سید الحی بسلاسل بنی طی -

۶۱ - قرویج القلوب بذكر ملوك بنی الیوب -

۶۲ - كشف اللغام عن اداب الایمان والا سلام -

۶۳ - مختصر العین - لغت سے متعلق ہے -

۶۴ - التكملة والصله - دو جلدوں میں - مخطوطہ -

۶۵ - عقد الجمال فی بیان شعب الایمان -

۶۶ - تحفة اسماعیل :- شیخ العرب اسماعیل کی مدح میں - یہ مخطوطہ قاہرہ میں

موجود ہے -

۶۷ - تحقیق الوسائل لمعرفة المكاتبات والرسائل -

۶۸ - جودة الاقتباس فی نسب بنی عباس -

۶۹ - الروض المعطار فی نسب السادات آل جعفر الطیار :- مخطوطہ قاہرہ میں

موجود ہے -

۷۰ - سفينة النجات المحتویة علی بضاعة مزجاة من الفوائد المنتقاة -

۷۱ - غایة الحاج لمقتضى اسانید مسلم بن الحجاج -

۷۲ - عقد اللالی المتناثره فی حفظ الاحادیث المتواتره -

۷۳ - العقد المکمل بالجواهر الثمین -

۷۴ - زهد الامتنام المنشق عن جیوب الالهام لشرح صیفة

سیدی عبد السلام -

۷۵ - رشفة المدام المختوم للبکری -

۷۶ - معجم شیوخہ -

۷۷ - دفع الشکوی وترویج القلوب فی ذکر ملوک بنی الیوب -

۷۸ - المررب الکابلی فیمین روی عن الشمس البابی :- اس کا قلمی نسخہ قاہرہ میں

موجود ہے -

۷۹۔ برنا مجہد ۱۔ سید مرتضیٰ نے اسے سید باسط علی قادری بلگرامی کے لیے مصر میں تحریر کیا، اس میں انہوں نے اپنے ان کم و بیش تین سو سا تازہ کا ذکر کیا ہے، جن سے انہوں نے استفادہ کیا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں موجود ہے۔

۸۰۔ اسانید الطرق الثلاثہ :- قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں محفوظ ہے۔

۸۱۔ تخریج احادیث خیر الاقام :- قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

۸۲۔ مناقب اہل الحدیث :- محدثین کے مناقب و فضائل سے متعلق۔

۸۳۔ عقد الجواہر الثمین فی تخریج حدیث اطلبوا العلم وکان بالصین۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ انہوں نے اور بھی متعدد چھوٹے بڑے رسائل تصنیف کیے۔ ابتدائی سات کتابوں کے علاوہ غالباً اور کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی۔ بہت سی غیر مطبوعہ کتابوں کے قلمی نسخے قاہرہ، حیدرآباد (دکن) اور دہلی کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں اور بعض کتب و رسائل دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، سید مرتضیٰ بہت بڑے شاعر بھی تھے، ان کے چند اشعار جو انہوں نے اپنی بیوی کی وفات پر کہے، گزشتہ سطور میں لکھے جا چکے ہیں، چار شعر اور ملاحظہ ہوں جو پند و نصیحت سے متعلق ہیں :-

قول علی مولاک و اخش عقابہ وداوم علی التقوی و حفظ الجوارح

وقدم من البر الذی تستطیعہ ومن عمل یرضاه مولاک صالح

واقبل علی الفعل الجمیل و بذلہ الی اہلہ ما استطعت غیر مکالم

ولا تسمع الا قوال من کل جانب

فلا ید من متن علیک و قادح

ترجیح :-

اللہ پر توکل کرو اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہو۔ ہمیشہ تقویٰ اختیار کیے رکھو اور از نکاب گناہ سے اعضا و جوارح کی حفاظت کرو۔ جس قدر طاقت ہو، نیکیوں کی طرف دوڑو، ہر وہ عمل جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے، عمل صالح ہے۔

بہترین کاموں کو اپنا مرکز توجہ بنائے رکھو اور جہاں تک ممکن ہو، لوگوں میں اچھائیاں پھیلاؤ، لیکن اس میں (یہ احتیاط ضروری ہے کہ) کسی سے توشیح و تونی سے پیش نہ آؤ۔

ادھر ادھر کی باتیں سننے سے گریز کرو، تمہارے لیے مضبوط عزم و ارادے کے حامل اور اصحابِ فہم و تدبیر ہونا ضروری ہے (تاکہ کوئی غلط کردار اور غلط گفتار آدمی اپنی باتوں سے تمہیں متاثر نہ کر سکے)۔

بلاشبہ سید مرتضیٰ سوادِ ہند کے جلیل القدر عالم تھے۔ انھوں نے ہر موضوع پر کتابیں لکھیں اور نہایت علمی کام کیا۔ ان کی تگ و تاز علم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ فن لغت میں تو وہ مرتبہ امامت پر فائز تھے اور اس کے تمام گوشوں پر مختہداتہ نظر رکھتے تھے۔

انھوں نے جنوں ہی شعور کی آنکھیں کھولیں، اپنے ملک ہندوستان کے شاہیر علما و اساتذہ سے اکتسابِ فیض میں مصروف ہو گئے اور ہر اس دروازے پر دستک دی جہاں سے انھیں حصولِ خیر کی توقع ہو سکتی تھی۔ جس ذی علم شخصیت کے حضور انھوں نے اپنا دامن طلب پھیلایا، اللہ نے انھیں کامیاب کامران فرمایا۔ یہ ایک عظیم سعادت تھی جو ان کے حصے میں آئی۔

ہندوستان کے اساتذہ سے استفادے کے بعد وہ بھر ہند کی موجوں پر سوار ہوئے اور بحیرہ عرب کو عبور کرتے ہوئے حجاز مقدس پہنچے۔ کئی جگہ کیے اور وہاں کے اربابِ فضیلت سے مستفید ہوئے۔ پھر یمن کے سرسبز و شاداب مقامِ نجد

کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس کے بعد دریائے نیل کے ساحل پر اترے اور مصر میں سکونت اختیار کی۔ اب ان کا مرکز بلدۂ علم و کمال قاہرہ تھا، جہاں وہ ہر لحاظ سے بام عروج پر پہنچے۔ انھوں نے ہر اعتبار سے بھرپور زندگی گزاری اور جہاں گئے وہاں کے آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ان کو اللہ نے انتہائی احترام سے نوازا اور ان کی عزت و حشمت کا سایہ لمحہ بہ لمحہ پھیلتا اور دراز ہوتا گیا۔ عمالِ حکومت، امرائے سلطنت، اربابِ منبر و محراب، اصحابِ درس و تدریس، غرض ہر شعبہ حیات کے لوگوں نے ان کو مستحقِ تکریم گردانا اور ان سے حصولِ فیض کو اپنے لیے باعثِ خیر و برکت قرار دیا۔

بیوی کی وفات کے بعد ان کے گلستانِ طبع پر خزاں چھا گئی تھی اور وہ تنگنگیِ جوان کے قلب و ضمیر کا خاصہ تھی، باقی نہ رہی تھی۔ امورِ دنیا سے منقطع ہو کر گوشہ گیری اختیار کر لی تھی اور گھر کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ درس و تدریس کے منگامے ختم کر دیے تھے، لوگوں سے میل جول ترک کر دیا تھا اور رواتے سکوت اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ آفتابِ جوہندوستان سے طلوع ہو کر کئی سال سے میں اور مصر کی علمی فضاؤں کو منور کر رہا تھا، اب اپنی نورانی کرنیں سمیٹ چکا تھا۔ اس اثنا میں یکایک طاعون کے مہلک مرض نے سر نکالا اور چند ہی روز میں پورے مصر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جمعے کا روز تھا کہ سید مرتضیٰ اپنے گھر کے سامنے کی مسجد میں گئے جو مسجدِ کر دی کہلاتی تھی، نماز جمعہ سے فارغ ہو کر ابھی مسجد ہی میں بیٹھے تھے کہ طاعون کا مرض ان پر حملہ آور ہوا۔ وہ کسی طرح گھر پہنچے اور کواڑ بند کر کے بیٹھ گئے۔ کسی کو کوئی چنانہ تھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ دو دن اور دو راتیں اسی حالت میں کٹیں۔ بالآخر آوار کو ان کی حیاتِ مستعار کا خاتمہ ہو گیا، عالمِ تنہائی میں ان کی روحِ نفسِ عمری سے پرواز کر گئی اور وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ یہ شعبان کا مہینہ اور سن ۱۲۰۵ھ تھا۔ ان کی موت کی کسی کو کوئی اطلاع نہ تھی، ان کا وقتِ اخیر

کس طرح گزرا، اس کا کسی کو علم نہیں سب لوگ اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار اور بیماری سے پریشان تھے اور بیک وقت کئی کئی میتیں لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر قبرستان کی طرف جا رہی تھیں۔ ایسے نازک حالات میں کسی کو دوسرے کا کیا علم ہو سکتا تھا۔ پیر کے روز باشندگانِ قاہرہ کو پتا چلا تو شہر کے لوگوں نے ان کے گھر کا رخ کیا اور ان کا جنازہ دروازے سے باہر نکالا۔

اس عالمِ اجل نے اپنی زندگی میں خود ہی سیدہ رقیہ کے مزار کے قریب ایک جگہ منتخب کر لی تھی، وہیں انھیں دفن کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ ان کی زندگی کا ایک الم انگیز اور دردناک پہلو یہ ہے کہ اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، نہ کوئی بیٹا نہ بیٹی۔ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لہِ وَاَرْحَمْہِ و عَافِہِ وَاَعْفِ عَنہِ ۹۸

۹۸۔ قاضی مصطفیٰ فاروقی گوپاموی

گوپامو (لوپی) کے علما و مشائخ اور فقہاء و اصولیین میں ایک بزرگ قاضی مصطفیٰ تھے، جن کے والد کا نام خیر الدین اور دادے کا خیر اللہ تھا۔ نیلاً فاروقی تھے۔

قاضی مصطفیٰ کا مولد و منشا گوپامو سے جو ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک شہر ہے۔ اس شہر کی خاک سے متعدد علما و فقہاء نے جنم لیا اور حلقہ علم و فضل میں مشہور ہوئے۔ قاضی ممدوح کچھ بڑے ہوئے تو مولانا محمد زمان اور مولانا محمد اکرام

۹۹۸۔ اجدالعلوم ص ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۳ تا ۲۲۶۔

نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۷۰ تا ۳۷۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۲۵۸ تا ۲۶۱۔ الاعلام

ج ۷ ص ۲۹۷۔ تاریخ الکامل ابن اثیر الجزری حاشیہ عبدالرحمن الجبرتی مصر ج ۵ ص ۱۰۰۔

اتحاد البنیاء ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ قضاء الارب من ذکر علماء النج والادب ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

سے حصولِ علم کا آغاز کیا اور پھر اپنی سے تکمیلِ علوم کی۔ یہ دونوں بزرگ قاضی عبدالغنی فاروقی گوپاموی کے شاگرد تھے۔

اس زمانے میں علومِ ظاہری سے فراغت کے بعد علمِ باطنی کی تحصیل لازمی سمجھی جاتی تھی۔ قاضی مصطفیٰ نے بھی علمِ طریقت و تصوف کے حصول کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور اس کے لیے وہ اس دور کے ایک بزرگ شیخِ قدرتِ علی حشمتی کی خدمت میں گئے اور ان سے فرقہٴ طریقت حاصل کیا۔ یہ وہ دور تھا جب کہ مدراس میں بہت سے اصحابِ فضل و کمال اقامت گزری تھے اور وہاں کے منصبِ امارت پر قاضی مصطفیٰ کے ایک حجازی فائز تھے۔ قاضی مدوح نے بھی مدراس کا عزم کیا، چونکہ یہ لغتِ علم سے بہرہ ور تھے، اس لیے انھیں مدراس کی مسندِ تدریس پر متمکن کر دیا گیا۔ بعد ازاں یہ مدراس کے قاضی مقرر کر دیے گئے، ان کی صلاحیتیں جب مزید اجاگر ہوئیں تو انھیں مدراس کا قاضی القضاة بنا دیا گیا۔ اس کے بعد تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ انھیں قاضی مصطفیٰ علی خان بہادر کہا جاتا ہے۔ غالباً ”خان بہادر“ کا لقب ان کو والی مدراس نے دیا تھا۔

ان کی صرف دو تصنیفات کا علم ہو سکا ہے۔ ایک فارسی کے دیوانِ شعری کا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبعِ موزوں رکھتے تھے، اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ دوسرے ”تذکرۃ الانساب“ کا۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۱۹۲ھ کو ”چنپین“ میں لکھی جو جنوبی ہند کا ایک شہر ہے۔ فقہیات پر انھیں عبور حاصل تھا، اسی لیے پہلے مدراس کے قاضی اور پھر قاضی القضاة مقرر کئے گئے تھے۔

قاضی مصطفیٰ گوپاموی نے ۱۲۳۴ھ کو وفات پائی۔^{۹۹}

۹۹۔ مولانا مصطفیٰ رفیقی کشمیری

وادی کشمیر کے ان مشاہیر علمائے حنفیہ میں جنہوں نے تیرھویں صدی ہجری کے فقہاء و اصولیین میں قابل قدر خدمات انجام دیں، مولانا مصطفیٰ رفیقی کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی طیب اور دادا کا احمد تھا۔ مولانا طیب اپنے دور میں کشمیر کے مشہور فقہاء میں گروانے جاتے تھے۔ یہ ۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ کو فوت ہوئے۔

ان کے دادا کا نام نامی مولانا احمد رفیقی تھا۔ یہ بھی تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز کشمیری فقہاء میں سے تھے۔ ان کی وفات ۲۲ رجب ۱۲۱۹ھ کو ہوئی۔ مولانا احمد کے والد کا نام مصطفیٰ تھا۔ یہ بھی صاحب علم بزرگ تھے۔ غرض یہ تمام خاندان علم و عمل اور فقہ و اصول میں خاص شہرت کا حامل تھا۔ مولانا مصطفیٰ رفیقی کی ولادت ۱۲۲۶ھ کو ہوئی اور حدیث و فقہ کی تعلیم اپنے والد مکرم مولانا طیب سے حاصل کی۔ حدیث کی سند بھی اپنی سے لی۔ بعض علوم مروجہ کی تحصیل دیگر علمائے بھی کی اور تشنگان علوم کے زمرے میں بڑی شہرت پائی۔

علم سے قراعت کے بعد درس و افادہ کا وہی سلسلہ شروع کیا جو ان سے قبل ان کے آبا و اجداد کا شیوہ تھا۔ خلق کثیر نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا اور علوم متداولہ سے بہرہ یاب ہوئی۔ ان کے شاگردوں میں زیادہ تر تعداد کشمیری اہل علم کی ہے جن میں مولانا بہاؤ الدین، مولانا احمد، مولانا احسن اور مولانا عبدالشکور رفیقی شامل ہیں۔

مولانا مصطفیٰ رفیقی عالم با عمل فاضل کامل، فقیہ و محدث، بہترین مقرر، عربی و فارسی کے ادیب، اچھے مؤرخ اور شاعر تھے۔ اس کشمیری عالم نے جمعہ المبارک کے روز ۱۴۔ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ کو آخرت

۱۰۰۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی

ہندوستان کے صوبہ لوئی میں "کاندھلہ" ایک مشہور شہر ہے جس میں بہت سے علماء و فقہا پیدا ہوئے۔ ان میں ایک عالم مولانا مظفر حسین کاندھلوی تھے جو مولانا محمود بخش کاندھلوی (متوفی ۱۲۵۸ھ) کے فرزند گرامی تھے۔ یہ خاندان کئی پشتوں سے خدمتِ علم و دین میں معروف تھا اور ان میں سے ہر بزرگ اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔

مولانا مظفر حسین اپنے عہد کے شیخ کبیر، عالم نبیل، فقیہ نامدار اور مفتی و صالح شخص تھے۔ اتباعِ سنت، شریعت میں استقامت، کلمہ حق میں عزیمت اور پاک بازی اور تورع میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ تمام عمر لقمہ مرثیہ حلق میں نہیں اتارا۔ اگر بے خبری میں کوئی ایسی چیز منہ میں چلی بھی گئی تو معدے نے اُسے قبول نہیں کیا، فوراً اگل دیا۔ یہ اللہ کا بہت بڑا انعام تھا جو انھیں نصیب ہوا۔

مظفر حسین کی ولادت اور نشوونما کاندھلہ میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو مفتی الہی بخش کاندھلوی کے حلقہ درس میں شمولیت کی اور ایک مدت تک ان سے منسلک رہے۔ ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۲۲۵ھ کو مفتی صاحب مدوح کا انتقال ہوا تو مظفر حسین نے دہلی کا عزم کیا اور مولانا محمد یعقوب دہلوی کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے۔ مولانا محمد یعقوب دہلوی ایک جلیل القدر عالم تھے۔ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے چھوٹے بھائی اور

شہد مدائن الحنفیہ ص ۲۸۹ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۸۲ — تذکرہ

شہدائے ہند، ص ۲۲۶

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے۔ ۱۲۵۸ھ کو اپنے بڑے بھائی (شاہ محمد اسحاق دہلوی) کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے تھے اور مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی۔

مولانا مظفر حسین نے امیر المجاہدین سید احمد شہید سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا اور ان سے مستفیض ہوئے۔

مولانا ممدوح نے سنتِ مطہرہ کی حمایت اور بدعت کی تردید کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ ان کے زمانے میں کسی عورت کا شوہر فوت ہو جاتا تو دوسری جگہ اس کا نکاح نہیں کیا جاتا تھا اور وہ تمام عمر گھر میں بیٹھی رہتی اور اسی طرح زندگی گزار دیتی تھی۔ یہ ہندوانہ رسم تھی جو ہندوستان کے مسلمانوں میں رواج پذیر ہو گئی تھی۔ مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید نے اس غلط اور غیر شرعی رسم کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، ان کے رفقاء عالی مقام نے بھی اس کے خلاف جدوجہد کی۔ مولانا مظفر حسین کا ندھلوی نے بھی اس رسم کی شدید مخالفت کی اور بہت سی بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں جاہل اور اسلامی احکام سے ناواقف مسلمانوں کی طرف سے انہیں سخت مصائب و محن میں مبتلا کیا گیا، مگر وہ اس غیر شرعی رسم کو ختم کرنے کے لیے برابر کوشاں رہے۔ مولانا مظفر حسین نے دوج کیے۔ پہلے حج کے لیے وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تو مکہ مکرمہ گئے، پھر حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے، اور بخیریت وطن واپس آ گئے۔ کچھ عرصے بعد حجِ ثانی کا قصد کیا۔ مکہ مکرمہ پہنچے تو ان کے استاد مکرم مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی کا انتقال ہو گیا، ان کی نماز جنازہ پڑھی اور تجہیز و تکفین کی۔ اس کے بعد حج کیا اور مدینہ منورہ روانہ ہو گئے لیکن راستے ہی میں بیمار پڑ گئے۔ حالتِ مرض ہی میں مدینہ منورہ پہنچے تو اللہ کی بخشش رحمت میں چلے گئے۔ جمعرات کی شب ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ

کا واقعہ ہے۔

۱۰۱۔ مولانا مظہر علی عظیم آبادی

عظیم آباد کسی زمانے میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر ٹپٹہ کا نام تھا۔ وہاں علما و فضلا اور فقہا و صلحا کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا ہوئی اور ان تمام حضرات نے مختلف گوشوں میں نہایت شہرت حاصل کی۔ ان میں سے بعض بزرگوں کا تذکرہ ”فتہائے پاک و ہند تیسویں صدی ہجری“ کی جلد دوم کے مقدمے میں کیا جا چکا ہے اور بعض کے حالات و کوائف سلسلہ ”فتہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر معرض بیان میں آچکے ہیں۔ عظیم آباد (ٹپٹہ) کے ایک عالم دین مولانا مظہر علی تھے، جو اپنے عہد کے شیخ اور صالح عالم تھے۔ حلقہ اصناف سے تعلق رکھتے تھے اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں درک عمیق میں مشہور تھے۔ عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے اور علما و طلباء کی کثیر تعداد نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مشہور کتاب ”قسطا کس البلاغہ“ کے مصنف شیخ محمد سعید ان کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں شامل ہیں۔

مولانا مظہر علی عظیم آبادی نے ہجرت کے روز ۶ صفر، ۱۲۴۷ھ کو وفات پائی اور ان کے شاگرد شیخ محمد سعید نے یہ تاریخ نکالی۔
آہ شنبہ ساؤس ماہ صفر یوم الرحیل

۱۰۲۔ سید معز الدین کرطومی

سید معز الدین کرطومی فحول علمائے فقہ میں سے تھے۔ سید خیرات علی

۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۱، ص ۲۸۳، ۲۸۴

۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۱، ص ۲۸۴

حسینی مشہدی کاظمی کڑوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ فقہ و اصول کے علمائے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ احمد آباد نارہ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کے اہل اساتذہ سے اکتسابِ علوم کیا۔ ذہن شاقب اور فہم کامل رکھتے تھے۔

سید معز الدین حسینی کڑوی ان اصحابِ علم حضرات میں سے تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے بدو شعور ہی میں فضل و کمال کی تمام نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا ان کا اسلوبِ کلام اور سنجِ تغیم نہایت موثر تھا، جو بات زبان سے نکالتے سناہین کے ذہن میں پیوست ہوتی چلی جاتی۔ درسیات پر عبور حاصل تھا اور چھوٹی عمر ہی میں ہر گوشہ علم پر حاوی ہو گئے تھے۔

اس عالم کبیر نے عین عالم جوانی میں ۱۲۵۵ھ کو اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ اعمالِ حسنہ اور پاکیزہ کردار کے سوا کوئی شے بطور یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کا مرقد احمد آباد نارہ میں ہے، جہاں ان کے دیگر بزرگ مدفون ہیں۔ ایک شاعر نے ان کی تاریخِ وفات ان اشعار سے نکالی۔

مشفق مولوی معز الدین کر رحلت چو زین جہان بچبان
سال فوٹس چنیں رستم کردن آہ اولو دے بے نظیر جہان

۱۰۳۔ مولانا معشوق علی جون پوری

مولانا معشوق علی جون پوری اپنے عصر کے جید عالم اور ممتاز فقیہ تھے مولانا غلام حسین جون پوری کے بیٹے تھے جو کہ حساب، ہیئت، ہندسہ وغیرہ فنونِ ریاضی کے نامور عالم تھے۔

مولانا معشوق علی حنفی المسک تھے اور مولانا فتح علی فاروقی جون پوری کے بھانجے تھے۔ ولادت و تربیت جون پور کے مرکزِ علم و علما میں ہوئی اور

۱۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۸۵۔
۱۴ مولانا فتح علی جون پوری، فاروقی الشل تھے اور نہایت صالح۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

وہیں کے اساتذہ سے حصولِ علم کیا۔ بعد ازاں مزید تعلیم کے لیے دیارِ ہند کے اربابِ علم کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ احمد یمنی سے جو تیرھویں صدی ہجری کے بہت اڑے ادیب و عالم تھے، فنونِ ادبیہ کی تحصیل کی۔

نہایت ذہین و فطین اور قابلِ آدمی تھے، کتابوں پر گہری نظر تھی اور مختلف علوم و فنون کے بارے میں ماہرانہ رائے رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قاضی مقرر کر دیے گئے تھے جو ایک نہایت اہم اور نازک منصب ہے۔

محکمہ قضا پر متمکن ہونے کے باوجود زیادہ تر درس و افادہ میں مصروف رہتے اور طلباء کی اچھی خاصی جماعت ان کے حلقہٴ درس میں موجود رہتی اور وہ اس کو بہترین شغل قرار دیتے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ کثیر المطالعہ عالم تھے اور کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کے انتہائی شائق تھے منقول ہے کہ اس زمانے میں پانچ ہزار کتابیں ان کے کتب خانے میں جمع تھیں۔ عربی کے بہترین ادیب تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا۔

- ۱۔ ایک بڑی اچھی کتاب اخلاق کے بارے میں تصنیف کی۔
- ۲۔ ایک کتاب "الفرائض الاسلامیہ" کے نام سے لکھی جو وراثت سے متعلق ہے۔
- ۳۔ دیوانِ متنبی کے کچھ اجزا کی شرح سپردِ قلم کی۔

اس عالم و فقیہ نے ۶ رمضان ۱۲۶۸ھ کو وفات پائی۔

رہتیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) اور پرمیزگار عالم دین تھے۔ اعمالِ جون پور میں ایک گاؤں (منڈیاہو) تھا، وہاں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے شہر جون پور کے اساتذہ سے علم حاصل کیا، پھر سید احمد شہید بریلوی سے وابستہ ہو گئے اور ان سے اخذِ لقیہ کیا۔ سید صاحب نے ان کا نام فتح علی سے بدل کر عبدالقدوس رکھ دیا تھا۔ اس عالم اجل نے علاقہ پنجاب میں وفات پائی۔

۱۷۲، ۱۷۳، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۷۔ نزہۃ الخواطر ص ۲۸۵

۱۰۴۔ مولانا معین الدین انصاری سہسوانی

صوبہ یوپی کے مشہور شہر سہسوان کے بہت سے علما و فقہا کا ذکر فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں ہو چکا ہے۔ اس شہر کے ایک ممتاز عالم و فقیہ مولانا معین الدین انصاری سہسوانی تھے۔ ان کے اسلاف مغل بادشاہ جہاں گیر کے عہد سے وہاں کی جامع مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے آ رہے تھے اور علم و معرفت اور ورع و تقویٰ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ سہسوان اور اس کے قرب و جوار میں ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

تیرھویں صدی ہجری میں اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا معین الدین انصاری گزرے ہیں، جن کو تفسیر و حدیث، فقہ و اصول اور دیگر علوم مروجہ میں درک حاصل تھا۔ وعظ و تذکیر، تبلیغ دین، اشاعت سنت اور ترویج اسلام میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ بدعات اور غیر شرعی رسوم و رواج سے انھیں شدید نفرت تھی اور اس کا برسر عام رد کرتے تھے۔ کلمہ حق کہنے میں بے باک تھے اور اس سلسلے میں کسی بڑے چھوٹے کی قطعاً پروا نہ کرتے۔ جس بات کو کتاب و سنت کی روشنی میں صحیح سمجھتے، اس کا برملا اظہار کرتے اور جو غلط ہوتی، اس کی سب کے سامنے تکمیر کرتے۔

ان کے بعض واقعات "حیات العلماء سہسوان" (صفحہ ۲۵ تا ۳۷) میں مولانا سید عبدالباقی سہسوانی نے بیان کیے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ احقاقِ حق اور الباطلِ باطل میں کس درجے جری تھے۔ لیکن اس سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے اور اپنے شہر سہسوان ہی میں نشوونما پائی۔ متداولہ علوم و فنون کی تحصیل کے لیے پہلے رامپور گئے اور وہاں کے اساتذہ کے سامنے زمانے کے ادب تہہ کیا۔ پھر عازم لکھنؤ ہوئے،

وہاں کے بعض علما سے اخذِ علم کیا۔ اس کے بعد دہلی روانہ ہوئے اور وہاں مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی، مولانا عبدالرحیٰ بڑھالوی اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حلقہ ہائے درس میں شامل ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ وہ ان بزرگوں کے طریق و عطا و ارشاد اور بیخ تقریر سے خاص طور پر متاثر ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالبِ علمی ہی کے زمانے میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اپنے اساتذہ دہلی کے اسلوب پر شروع کیا۔

علوم سے فراغت کے بعد سہوان آئے تو درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شہر اور قصبات قریبات کے دورے شروع کر دیے اور لوگوں میں خالص کتاب و سنت کی تبلیغ کرنے لگے۔ کسی کے گھر سے کھانا نہ کھاتے، اپنا خرچ ساتھ لے کر جاتے اور خود ہی روٹی پکا کر کھاتے۔ یتیموں، مسکینوں اور بیوہ عورتوں کی بہت مدد کرتے اور جو پیسہ ہاتھ آتا ان میں تقسیم کر دیتے۔ شادی بیاہ اور عقی کے مواقع پر جو غیر شرعی رسمیں مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں، ان کی شدید مذمت کرتے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ جماعت کی پابندی پر زور دیتے۔

جو لوگ نماز کے وقت گھروں میں بیٹھے رہتے انھیں کھینچ کر مسجد میں لاتے اور جو جماعت میں شامل ہونے میں تباہی سے کام لیتے ان کو سختی کے ساتھ شامل جماعت ہونے کی تاکید کرتے۔ اس سلسلے میں اتنے نازک احساس کے مالک تھے کہ مار پیٹ پر اتر آتے۔ جس نے ذرہ ادھر ادھر کی بات کی اور مسجد میں جانے سے گریز کی راہ اختیار کی، اس پر ڈنڈا اٹھا لیا اور اس وقت تک آرام نہ لیا جب تک اس کو مسجد میں لے جانے میں کامیاب نہ ہو گئے۔ یہ کام بلا خوف و خطر کرتے اور اس میں امیر عزیز یا حاکم و محکوم کے درمیان کوئی امتیاز روا نہ رکھتے، اپنے شہر سہوان میں بھی یہ خدمت دھڑلے سے انجام دیتے رہے اور اس کے قریب جوار کے قصبات دیہات میں بھی۔

اشاعتِ دین کے اس انداز سے متعلق لوگوں کے دلوں پر ان کا رعب طاری ہو گیا تھا اور سخت سے سخت لوگ بھی ان سے خوف کھاتے تھے۔ جدھر کو نکل جاتے بے عمل اور بے نماز لوگوں پر دہشت طاری ہوتی۔

ایک مرتبہ شہر کے ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا، قریب کی مسجد میں جانے لگے تو دیکھا کہ وہاں تحصیل دار کا دفتر ہے اور مسجد سے ملحق ہے، اور اذان کی آواز وہاں پہنچ رہی ہے، لیکن نماز کے لیے نہ تحصیل دار اٹھا اور نہ اس کے ماتحت مسلمان عملے کے کسی شخص میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔ تحصیل دار ویسے ہی ایک باختیار اور بڑا افسر ہوتا ہے، مگر وہ تحصیل دار بہت سخت مزاج اور مغرور بھی تھا۔ معین الدین نصاریٰ تحصیل دار کے دفتر جا پہنچے اور اسلام علیکم کے بعد اس سے مخاطب ہو کر کہا "آپ مسلمان ہیں؟" بولا "ہاں! مسلمان ہوں" فرمایا "مسلمان ہو تو چلو مسجد میں جا کر نماز پڑھو اور اپنے ماتحت مسلمان عملے کو بھی مسجد میں لے کر جاؤ۔" وہ اس قسم کے اسلوب کلام کو سننے کا عادی نہ تھا۔ انتہائی غصے سے مولانا کو دیکھا، لیکن وہ اپنی بات پراڑے رہے اور مسجد میں جانے اور نماز یا جماعت پڑھنے پر اصرار برابر جاری رہا۔ نماز کے فضائل بھی بیان کیے اور نہ پڑھنے کی وعید بھی سنائی۔ بالآخر آگے بڑھے اور اُسے کھینچ کر کرسی سے نیچے اتار لیا۔ تمام عملہ خاموش بیٹھا دیکھتا اور سننا رہا۔ پھر اس کا بازو پکڑ کر مسجد میں لے آئے، دوسرے لوگوں کو بھی مسجد میں جانے کا حکم دیا۔

نماز ہو چکی تو نماز کی فضیلت، ارکانِ اسلام کی اہمیت اور دیگر امور شرعیہ سے متعلق نہایت مدلل اور مؤثر تقریر کی اور اس درجے نرمی اور پیار سے احکامِ دین بیان کیے کہ حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس کے بعد وہ تحصیل دار بھی پکا نمازی ہو گیا اور باجماعت نماز ادا کرنے لگا اور اس کے ماتحت کام کرنے والے مسلمان بھی نماز باجماعت کے پابند ہو گئے۔ سہسوان کے جوار میں ایک گاؤں "سید پور" ہے۔ ایک مرتبہ وہاں گئے تو لوگوں کو حسبِ معمول احکامِ شرع کی سجا آوری کی تلقین کی۔ غیر اسلامی رسوم و رواج کی مذمت فرمائی اور بدعات و محدثات کا رد کیا۔ ایک شخص کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ تارکِ نماز ہے، مگر یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ اُسے کھینچ کر مسجد میں لے جانا چاہا تو وہ ڈر کر بھاگ اٹھا، مولانا بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ وہ ایک درخت پر چڑھ گیا، مولانا بھی درخت پر چڑھ گئے۔ وہ نیچے کود پڑا، مولانا بھی فوراً کود پڑے اور اس کا

تعاقب کرنے لگے۔ وہ بھاگتا ہوا کنوئیں میں گر گیا، مولانا بھی دوڑتے ہوئے بے خبری میں کنوئیں میں گر گئے اور پانی میں غوطے کھانے لگے۔ اس پانس کے لوگ بھاگ کر آئے اور دونوں کو کنوئیں سے نکالا۔ خدا کا شکر ہے کہ دونوں زندہ سلامت رہے۔

حیات العلماء کے مصنف مولانا عبد الباقی لکھتے ہیں کہ وہ مولانا کی وفات سے چونتیس سال بعد ۱۲۹۶ھ میں خود سید پور گئے اور اس شخص سے ملے جس کے پیچھے مولانا بھاگے تھے، اس نے اور بعض دوسرے لوگوں نے واقعہ کی تصدیق کی اور بتایا کہ اس دن سے وہ شخص نماز باجماعت کا پوری طرح پابند ہے اور اپنے افراد و خاندان اور دوسرے لوگوں کو بھی نماز کی تاکید کرتا ہے۔

مولانا معین الدین انصاری کسی غیر مسلم یا غیر متشرع مسلمان حاکم کی تکویم نہ کرتے، جس گاؤں میں وعظ و نصیحت کے لیے جاتے، وہاں کے لوگوں کے گھر سے کھانا نہ کھاتے۔ کھانے پینے کا انتظام خود ہی کرتے، کسی کو تکلیف دینا اور کسی پر بوجھ بنانا کی عادت کے خلاف تھا۔ غریب و مستحقین کی خود بھی مالی امداد کرتے اور اصحاب ثروت کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے مواعظ و نصائح سے خلق کثیر کے عقائد کی اصلاح ہوئی اور ان کے عمل کی دنیا بدلی۔

آخر عمر میں زیادہ تر ضلع بلند شہر کے ایک قصبے ”ڈبائی“ میں قیام کرنے لگے تھے، ان کا مقصد وہاں کے لوگوں کی اصلاح و تعلیم اور ان کو مسائل دین سے آگاہ کرنا تھا۔ وہیں کے ایک شعی القلوب نے ان کے کھانے میں زہر ملا دیا، اس کے اثر سے نماز فجر کے بعد اور طلوع آفتاب سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے مہینے کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ حادثہ ۱۲۷۲ھ کے اوائل میں پیش آیا۔ ڈبائی میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی تو منقول ہے کہ اس قصبے کی کل آبادی سے تین گنا زیادہ لوگ شریک جنازہ تھے اور سب حیران تھے کہ سالوں کا یہ انبوہ کب کہاں سے آیا اور اتنی جلدی ان کی موت کی اطلاع انہیں کیسے ہوئی۔ اس کے بعد

میت کو سہسوان لایا گیا اور وہاں جنازہ پڑھا گیا تو اس میں بھی حاضرین کی کثرت کا یہی حال تھا۔

مولانا سید عبدالباقی سہسوانی لکھتے ہیں کہ جس رات مولانا کی وفات ہوئی، اسی رات میرے والد مکرم مولانا سید سراج احمد رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے ہیں۔ صبح کو یہ خواب مولانا بزرگ علی مارہروی سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا، کسی عالم دین اور داعی حق کا انتقال ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسی دن شام کو مولانا معین الدین انصاری کی میت سہسوان آگئی اور اُسے سہسوان کی خاک میں دفن کر دیا گیا۔

۱۰۵۔ مولانا مملوک علی صدیقی نانوتوی

صوبہ یوپی کے ضلع سہاون پور میں ایک گاؤں کا نام "نانوتہ" ہے یہ گاؤں گنگوہ سے بارہ میل مغرب میں، دیوبند سے سولہ میل مشرق میں، سہارن پور سے اٹھارہ میل شمال میں اور تھانہ بھون سے نو میل جنوب میں واقع ہے۔ علم و عمل کی تاریخ میں یہ گاؤں نہایت اہمیت کا حامل ہے کسی زمانے میں یہ ایک مردم آفرین گاؤں تھا۔ اس میں بہت سے علما و فقہا پیدا ہوئے، جنہوں نے نہ صرف خطہ ہند میں شہرت پائی بلکہ پوری دنیائے اسلام میں نامور ہوئے اور بے شمار لوگوں نے ان کے علم و عرفان کی فراوانیوں سے استفادہ کیا۔ ان میں ایک عالم دین مولانا مملوک علی تھے جو نسباً صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، چچا لیسوی پشت میں ان کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

نانوتہ میں آمد اور سکونت

مولانا مملوک علی کا خاندان سمرقند میں آباد تھا اور تین و تقویٰ کے لحاظ سے سمرقند اور اس کے نواح میں اس خاندان کی بڑی شہرت تھی۔ مولانا ممدوح کے شجرہ نسب پرنگاہ ڈالیں تو ان کی پندرہویں پشت میں ایک بزرگ قاضی

منظر الدین کا نام آتا ہے "سیرت یعقوب و مملوک" کے مصنف پر و فیسیر محمد الوار الحسن (فصیل آباد) "مکتوبات یعقوبی" کے مقدمہ (صفحہ ۳) کے حوالے سے مولانا مملوک علی کے فرزند گرامی مولانا محمد یعقوب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"سلطان سکندر لودھی نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مرحوم کے اجداد میں سے جناب قاضی منظر الدین رحمۃ اللہ علیہ کو جن کا مزار جہاں آباد (دہلی) میں ہے، ۸۷۱ھ میں سمرقند میں طلب فرما کر شرف حضور ی بخشا۔ علاوہ دیگر اعزاز ہائے فراوان کے عہدہ قضا جہاں آباد رزانی فرمایا۔ چونکہ مقام نالوتہ قریباً وسط کاٹھا میں واقع ہے اور یہاں کے اہل ہنود، اقوام راجپوت و گوجر، روڑہ وغیرہم کا بہت جھگڑا تھا، اور یہ لوگ نہایت سرکش و سخت منہصیب، بدخواہ مسلمانان تھے، پس ان لوگوں کی سرکشی مٹانے کے لیے اور اس علاقے کو مطیع و منقاد کرنے کی جہت سے جناب قاضی منظر الدین کے صاحب زادوں میں سے قاضی میراں بڑے صاحب کو واسطے اقامت و سکونت قصبہ نالوتہ کے ارشادِ شاہی ہوا، اور علاوہ املاک و جاگیرات کے عہدہ قضا وہاں کا مرحمت فرمایا۔"

۱۶۱۱ء میں مکتوبات یعقوبی کے مرتب امیر احمد عشرتی صدیقی کو سہو ہو گیا ہے، اور پروفیسر محمد الوار الحسن نے بھی اس پر غور نہیں فرمایا۔ ۸۷۱ھ میں ہندوستان کا بادشاہ سکندر لودھی نہ تھا، بلکہ اس کا باپ بہلول لودھی تھا، جس نے ۸۵۵ھ سے ۸۹۲ھ تک اس ملک پر حکومت کی۔ یہ بادشاہ ہندوستان میں لودھی خاندان کی حکومت کا بانی تھا۔ اس کی وفات کے بعد ۸۹۳ھ میں اس کا بیٹا سکندر لودھی تخت ہند پر چھٹکن ہوا، اور اس نے، اذلیقیدہ ۹۲۳ھ کو اس دور کے دارالسلطنت آگرہ میں وفات پائی۔ قاضی منظر الدین، بہلول لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے ہوں گے۔ اگر سکندر لودھی کے زمانے میں آئے ہیں تو ۸۷۱ھ کا سن صحیح نہیں۔

۱۶۱۱ء سیرت یعقوب و مملوک ص ۱۹، ۲۰ بحوالہ مکتوبات یعقوبی مقدمہ ص ۳ -

ان سطور سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں :

- ۱۔ مولانا مملوک علی کے اسلاف لودھی خاندان کے عہد حکومت میں سمرقند سے ہندوستان آئے اور لودھی حکمران کی دعوت پر آئے۔
 - ۲۔ ان کے اولین بزرگ جو وارد ہند ہوئے، قاضی منظر الدین صدیقی تھے۔
 - ۳۔ قاضی منظر الدین صدیقی کے بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے۔
 - ۴۔ قاضی مدوح کے علم و کمال کی شہرت ہندوستان میں لودھی حکمران تک پہنچ گئی تھی، اسی لیے ان کو یہاں آنے کی دعوت دی۔
 - ۵۔ قاضی منظر الدین کو بادشاہ نے دہلی کے منصب قضا پر مامور کیا۔
 - ۶۔ ان کے بیٹے قاضی میراں بڑے بھی صاحب علم بزرگ تھے، انھیں ناناوتے کا قاضی مقرر کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے ناناوتے اس عہد میں محل وقوع کے اعتبار سے اس نواح کا ایک اہم مقام تھا اور وہاں محکمہ قضا قائم کرنا بادشاہ کے نزدیک ضروری تھا۔
 - ۷۔ قاضی میراں بڑے صاحب کو بادشاہ کی طرف سے جاگیر عطا کی گئی۔
 - ۸۔ قاضی میراں کو ناناوتے میں آباد کرنے کی بڑی وجہ وہاں کے غیر مسلموں کا زور توڑنا اور اس علاقے میں اسلام کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرنا تھا۔
 - ۹۔ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ اس میں کامیاب رہے اور اس پورے علاقے کو علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔
 - ۱۰۔ لودھی حکمرانوں کے نزدیک ہندوستان میں تبلیغ اسلام اور ترویج دین کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔
- بہر حال قاضی منظر الدین اس خاندان کے پہلے آدمی تھے جو ایک لودھی حکمران کی دعوت پر ہندوستان آئے اور جنھیں دہلی کا قاضی مقرر کیا گیا۔ ان کے بیٹے میراں بڑے صاحب کو ناناوتے کا عہدہ قضا تفویض کیا گیا۔ میراں بڑے صاحب

کا اصل نام کیا تھا اس کا علم نہیں ہو سکا۔ یہ علمی اعتبار سے یانکی اور دین داری کی دوسے اہل دہلی کی بڑی شخصیت ہوں گے جنہیں ”بے صاحب“ کہا جاتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ دہلی اور نانوٹے کے منصب قضا کے سوا تو ان باپ بیٹے کے حالات کہیں مرقوم ہیں اور ان سے لے کر مولانا مملوک علی تک درمیان کی تیرہ چودہ شخصیتوں کے بارے میں تذکرہ درجاں کی کتابوں میں کسی چیز کا سراغ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی علمی تاریخ بالکل خاموش ہے۔

ولادت

مملوک علی ۱۲۰۲ھ (۸۹۱—۸۸۸ء) کو نانوٹہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے، باپ کا نام احمد علی، دادا کا غلام ثروت اور پردادا کا عبداللہ تھا۔

تعلیم

ابتدائی دینی کتابیں اپنے گاؤں نانوٹہ کے بعض اساتذہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد عازم دہلی ہوئے۔ دہلی اس زمانے میں اسلامی اور دینی علوم و فنون کا گہوارہ تھا اور تحصیل علم کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں سے لوگ وہاں جاتے تھے۔ مملوک علی جب دہلی گئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی زندہ تھے۔ وہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے تیرکا علم نحو کی کتاب ”ہدایت النور“ کے چند اسباق پڑھے۔ بعد ازاں شاہ صاحب کے ممتاز و معروف شاگرد مولانا رشید الدین خاں کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے فنون مروجہ اور علوم متداولہ کی تکمیل کی۔

سلسلہ درس و تدریس

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مولانا مملوک علی کب اور کتنی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اس دور کے حالات اور قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حصول علم سے فراغ کے بعد انہوں نے دہلی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا،

چونکہ وہ تمام اصنافِ علم پر عبور رکھتے تھے اور معقول و منقول کے ماسر تھے، لہذا بہت جلد طلباء کا اچھا خاصا حلقہ ان کے گرد قائم ہو گیا تھا۔ ان کے استاد مولانا رشید الدین خاں دہلی کالج میں مدرس تھے، لائق شاگرد نے بھی یکم جون ۱۸۲۵ء کو وہیں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

یہاں دہلی کالج کے بارے میں بھی چند سطور لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ابتدا میں اس کا نام مدرسہ غازی الدین تھا جو ۱۷۹۲ء میں غازی الدین خاں فیروز جنگ نے دہلی میں اجمیری دروازے کے پاس قائم کیا تھا۔ مدرسے کے ساتھ ایک شان دار مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اس مدرسے میں عربی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ تیس سال تک اس مدرسے میں ان علوم کی تدریس کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔ ۱۸۲۳ء میں مدرسے میں صرف نو طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے اور مولوی عبداللہ انھیں تعلیم دیتے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہو گیا اور اس کا نام ”دہلی کالج رکھا گیا۔ اس کا پرنسپل مسٹر ٹیڈر کو بنایا گیا۔ مولوی رشید الدین خاں کو اس میں عربی کا اول مدرس مقرر کیا گیا، سو روپے ماہانہ ان کی تنخواہ تھی۔

۱۸۲۸ء میں سر چارلس مٹکاف برٹش ریڈیٹنٹ کشر کی سفارش سے دہلی کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا۔ اسی سال لوکل فنڈ کے تعلیمی بجٹ سے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کالج کو دو سو پچاس روپے دینے کی منظوری دی گئی، جس سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔

۱۸۳۰ء میں حکومت اودھ کے وزیر نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دہلی کالج میں عربی اور فارسی کی تعلیم و ترقی کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار روپے دینے کی پیشکش کی تھی لیکن ابھی یہ بات چل ہی رہی تھی کہ نواب صاحب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اس اثنا میں دہلی کے لوگوں نے ایک الگ کالج

۱۸۷۸ء کانفرنس گزٹ، علی گڑھ ۱۵ نومبر ۱۸۳۰ء

کھولنے کی کوشش کی، لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔
 ۱۸۳۵ء کو لاپی کے لیفٹیننٹ گورنر لارڈ بیٹنگ نے ایک ریزولوشن
 کے ذریعے دہلی کالج سے تمام مشرقی علوم کی تعلیم بند کر دی۔ یہ علوم عربی، فارسی اور
 سنسکرت زبانوں پر مشتمل تھے۔ اس سے اہل ملک کو شدید ذہنی کوفت ہوئی اور
 لوگوں میں ایک مہجانب سا پیدا ہو گیا۔ خود کالج کے کچھ انگریز مدرسوں نے اس پر
 احتجاج کیا۔ چنانچہ بعض نے کالج کی تدریس سے استعفا بھی دے دیا۔ اس کے بعد
 لارڈ میکالے کا تقرر ہوا۔ یہ انتہائی متعصب شخص تھا، اس کی تقرری سے مسلمانوں
 اور ہندوؤں کو مزید تکلیف پہنچی۔

لارڈ بیٹنگ کی جگہ لارڈ آکلینڈ لاپی کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا تو اس نے ۲۴ نومبر
 ۱۸۳۹ء کو ایک چٹھی کے ذریعے آرڈر جاری کیا اور کالج میں علوم مشرقی کی دوبارہ تعلیم
 دی جانے لگی۔ لیکن اس سے کچھ عرصہ بعد دہلی کالج سے علوم مشرقی کا خاتمہ ہو گیا۔
 اس وقت مختلف زبانوں کی تعلیم کے اعداد و شمار مندرجہ تحت تھے۔

۱۔ انگریزی کے طالب علم	۱۹۹
۲۔ فارسی کے	۵۷
۳۔ عربی کے	۳۹
۴۔ سنسکرت کے	۲۶

۱۸۷۷ء تک یہ کالج قائم رہا، پھر اسی سال بند کر دیا گیا اور اس کا شاپت
 گورنمنٹ کالج لاہور میں بھیج دیا گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل لائسنز بھی
 چاہتا تھا۔

یہ تھا دہلی کالج کی تاریخ کا ایک مختصر سا خاکہ۔ آئیے اب اپنے اصل
 موضوع کی طرف لوٹیں اور مولانا مملوک علی کے حالات و سوانح بیان کرنے کی کوشش کریں۔
 دہلی کالج میں تقرر

مولانا مملوک علی یکم جون ۱۸۲۵ء کو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر دہلی کالج میں

استاد مقرر ہوئے، اس وقت ان کی عمر بتیس تئیس برس کی تھی۔ اپنے استاد مولانا رشید الدین خان کے ساتھ ہی نائب مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا تھا، مولانا رشید الدین خان عربی کے صدر مدرس مقرر ہوئے تھے اور ان کی تنخواہ سو روپے ماہانہ تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ایک کتاب ”شاہ دلی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک“ (ص ۱۸۱) میں لکھا ہے کہ مولانا مملوک علی کا دہلی کالج میں تقرر ان کے استاد مولانا رشید الدین خان کے بعد ہوا۔ ان کے عربی الفاظ ہیں :- نصب مدرساً فی دہلی کالج۔ بعد شیخہ یعنی اپنے استاد مولانا رشید الدین خان کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیے گئے۔ مولانا سندھی کی یہ بات صحیح نہیں۔ مولانا مملوک علی کو ان کے استاد مولانا رشید الدین خان کی زندگی میں اور ان کے ساتھ ہی دہلی کالج میں عربی کے نائب مدرس بنایا گیا تھا۔

مولانا مملوک علی کے ساتھ ہی عربی کے دوسرے نائب مدرس مولوی سید محمد کو بنایا گیا تھا۔ اس سے تقریباً پانچ سال بعد ۳۰ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو شعبہ عربی میں مولانا رشید الدین بن مولانا رشید الدین کا اور پھر چار سال بعد ۵ اکتوبر ۱۸۳۴ء کو مولانا سبحان بخش شکار پوری کا تقرر ہوا۔
تنخواہ میں اضافہ

مولانا مملوک علی یکم جون ۱۸۲۵ء کو دہلی کالج میں ملازم ہوتے تھے، نومبر ۱۸۳۱ء (یعنی سولہ سال) تک ان کا مشاہرہ پچاس روپے رہا۔ ۸ نومبر ۱۸۳۱ء کو سٹریٹس ڈیپارٹمنٹ نے ایک رپورٹ لکھی، جس میں ان کی تنخواہ میں اضافے کی سفارش کی اور لکھا کہ ان کی تنخواہ اسی روپے ماہانہ کر دی جائے۔ اس سفارش پر پورا عمل تو

۹۱۹ ملاحظہ ہو ”مولانا محمد حسن نانوتوی“ (ص ۱۷۳) بحوالہ رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انٹرکشن ۲-۱۸۳۲ء
۱۸۳۱ء دیکھیے ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی کتاب ”مولانا محمد حسن نانوتوی“ (ص ۱۷۳) بحوالہ رپورٹ جنرل کمیٹی ۸ نومبر

نہ ہوا، البتہ دس روپے بڑھا دیے گئے اور انھیں ساٹھ روپے تنخواہ ملنے لگی۔
 اسی اثنا میں نواب حامد علی خاں (متوفی) نے مولوی جعفر علی کو (جو مسلکاً
 شیعہ تھے اور جن کی ولادت ۲ صفر ۱۲۲۲ کو اور وفات ۸ صفر ۱۳۱۲ کو ہوئی) دہلی کالج میں سو روپے
 ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ نواب حامد علی خاں چاہتے تھے کہ مولوی جعفر علی کو
 صدر مدرس مقرر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے اس سے مولانا مملوک علی کی حق تلفی ہوتی
 تھی جو کم و بیش سولہ سال سے خدمت انجام دے رہے تھے۔ کالج کے ارباب انتظام
 نے اس سلسلے میں مفتی صدر الدین آزادہ سے رائے طلب کی تو انھوں نے مولانا
 مملوک علی کے علم و فضل کو سراہا اور صدر مدرس کے لیے ان کی سفارش کی۔
 لیکن مجلس انتظامیہ نے نواب حامد علی خاں (متوفی) کے مقرر کردہ مولوی جعفر علی کو
 ان کے منصب سے علیحدہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور مولانا مملوک علی کی صدر مدرس
 کا معاملہ کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ بالآخر نومبر ۱۸۴۱ء ہی میں مولانا مملوک علی
 کو صدر مدرس بنا دیا گیا اور سو روپے ان کی تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۸۴۳ء کو مولوی جعفر علی
 دہلی کالج کی ملازمت سے الگ ہو گئے۔

سٹرٹامن نے مولانا مملوک علی کے علم و فضل کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کے
 انگریزی الفاظ جنرل کمپنی کی رپورٹ (مورخہ ۳۔ نومبر ۱۸۴۱ء) میں مرقوم ہیں ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:-
 "مولانا مملوک علی عربی کے بہت بڑے تامل میں اور دہلی شہر میں ان کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔"
 دہلی کالج میں مولانا کی تدریسی مساعی کے نتائج

دہلی کالج میں مولانا مملوک علی اور دیگر علمائے دین نے جو تدریسی خدمات انجام
 دیں، ان کے نہایت اچھے نتائج نکلے اور ایسے اصحاب علم میدانِ عمل میں آئے جن
 کی مساعی سے پورا ہندوستان متاثر ہوا۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی
 بالخصوص لائق تذکرہ ہیں:-

۱۔ مولانا محمد مظہر نانوتوی:- تحصیل علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازمت
 اختیار کی۔ اس کے بعد بریلی کالج میں تبادلہ ہو گیا۔ ۱۳۰۲ھ کو سہارن پور

میں لا ولد فوت ہوئے۔

۲۔ مولانا محمد منیر فاقوٹوی :- سنی ۱۸۶۱ء کو بریلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔

۳۔ مولانا محمد احسن :- پہلے بنارس، پھر بریلی کالج میں منصب تدریس پر فائز ہوئے۔

۴۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی :- شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد

گرامی تھے، بریلی کالج میں پڑھاتے رہے، پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے اور نیشنل پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔

۵۔ مولانا فضل الرحمن دیوبندی :- بریلی ہاسپیٹل اور سہارن پور

میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔

۶۔ شمس العلماء مولوی ضیاء الدین دہلوی :- دہلی کالج میں مدرس

مقرر ہوئے۔

۷۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ :- کئی قسم کی تصنیفی و علمی

خدمات انجام دیں۔

۸۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد :- متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

۹۔ پیر زادہ محمد حسین (سینئر جج)

۱۰۔ شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد :- ان کی بہت سی علمی مساعی

کے علاوہ، بہت بڑی خدمت قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔

۱۱۔ خواجہ محمد شفیع جج۔

۱۲۔ خان بہادر میر ناصر علی۔

۱۳۔ مولوی کریم الدین پانی پتی۔

۱۴۔ مولوی جعفر علی۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات ہیں جنہوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور ان میں سے اکثر ملک کے تعلیمی نظام سے وابستہ ہوئے، انگریزی

حکومت کی باقاعدہ ملازمت کی اور جس حسن و خوبی سے اپنے مفوضہ فرائض انجام دیے اس کی خود حکومت نے تحسین کی اور اس کا بہتر صلہ دیا۔
چند تلامذہ کرام

مولانا مملوک علی کے تلامذہ کی فہرست بہت وسیع ہے اور یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد فضل و کمال کے مختلف اہم گوشوں میں شہرت پائی اور نامور ہوئے۔ ان بزرگانِ عالی قدر میں درج ذیل حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا احمد حسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد یعقوب (ابن مولانا مملوک علی) نانوتوی، مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمان دیوبندی، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین، منشی جمال الدین مدارالمہام بھوپال، مولانا کریم الدین پانی پتی، مولانا عالم علی مراد آبادی، مولانا سمیع اللہ دہلوی، مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتی، مولانا شیخ محمد تقی نانوتوی اور دیگر بہت سے بزرگ۔!

مولانا عبید اللہ سندھی نے سرسید احمد خاں، منشی ذکار اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد کو بھی مولانا مملوک علی کے شاگردوں میں شامل کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے تو مولانا ممدوح سے بے شک استفادہ کیا تھا (ملاحظہ ہو مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار ص ۵۱) لیکن سرسید اور منشی ذکار اللہ نے ان سے کچھ نہیں پڑھا اور وہ دونوں ان کے شاگردوں میں شامل نہیں ہیں۔

مولانا مملوک علی سے ہندوستان کے بہت سے ان جلیل القدر علمائے علم حاصل کیا جو آگے چل کر درس و تدریس کی مسندوں پر فائز ہوئے اور جن سے بے شمار لوگوں کو فیض پہنچا اور پھر اس چشمہ فیض سے لاتعداد افراد نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ یہ فیض اب تک جاری ہے اور ان کے شاگردوں کے شاگرد

جگہ جگہ علمی و تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ سلسلہ کم و بیش ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے۔ اس حیثیت سے مولانا مملوک علی بلاشبہ استاذ العلماء تھے اور انھوں نے جو اہم کام شروع کیا، وہ بدستور جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔

حج بیت اللہ

مولانا مملوک علی اپنے آبائی وطن "نالوتہ" کی سکونت ترک کر کے مستقل طور پر دہلی میں اقامت گزریں ہو گئے تھے اور وہاں کے کوچہ چلیاں میں اپنا ذاتی مکان بنا لیا تھا۔ انھوں نے ۱۲۵۸ھ میں حج بیت اللہ کے لیے کالج سے رخصت لی اور اس مبارک سفر پر تشریف لے گئے۔ رجب ۱۲۵۸ھ کو وطن سے روانہ ہوئے، یکم ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ پہنچے اور حج کیا، پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے، اس طرح ایک سال بعد واپس دہلی آئے۔ اس اثنا میں آدھی تنخواہ حکومت کی طرف سے نہیں ملتی رہی۔

عوام اور حکومت کے نزدیک قدر و منزلت

ہر حلقے میں مولانا مملوک علی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عالم و مدرس کی حیثیت سے انھوں نے بہت شہرت پائی، اہل علم بھی ان کی بہت تعظیم کرتے تھے، عوام میں بھی ان کو عزت کا مقام حاصل تھا اور حکومت کے حلقوں میں بھی ان کو عالی مرتبت سمجھا جاتا تھا اور ان کے کام اور محنت سے متعلقہ حکام بہت خوش اور مطمئن تھے۔

دہلی کالج میں انھوں نے پچیس سال کچھ ہیٹھتے خدمت تدریس انجام دی، اس اثنا میں تقریباً پندرہ سال عربی کے نائب مدرس رہے اور دس گیارہ سال صدر مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ اس پوری مدت میں کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتمد علیہ رہے۔ کالج کی رپورٹوں سے (جو پروفیسر محمد الیوب تدریسی نے اپنی کتاب "مولانا محمد احسن نالوتوی" میں درج کی ہیں) واضح ہوتا

ہے کہ مولانا مملوک علی پرکاش کے تمام انگریز پرنسپل بہت اعتماد کرتے تھے، ہر سالانہ رپورٹ میں ان کی توصیف و تعریف کی جاتی تھی اور ان کے کام کو لائق اطمینان گردانا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کو خود ہندوستان کے گورنر جنرل نے الغام سے سرفراز کیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ۱۵ اور ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار منعقد کیا۔ ۱۷ نومبر کے دربار میں سنتیس حضرات کو الغام و اکرام سے نوازا گیا۔ مولانا مملوک علی مدرس اول کو خلعت سے پارچہ مرحمت ہوا۔ اسی طرح مرزا اسد اللہ خان غالب کو خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جو اس وقت صدر الدین خان بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعت سے پارچہ اور ایک گھنٹہ ملا۔

اس زمانے میں انگریزی حکومت کی کوشش یہ تھی کہ مغربی علوم اور تعلیم کو ہندوستان کے مسلمانوں میں، بالخصوص دہلی کے مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، ان میں اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد میں انگریزی حکومت کامیاب رہی اور مسلمانوں نے جہاں عربی اور فارسی علوم حاصل کیے وہاں انھوں نے انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے حصول کو بھی درخور اعتنا قرار دیا۔ بہت سے مسلمان طلباء دہلی کالج اور اس قسم کے دوسرے کالجوں میں داخل ہوئے اور اس کے بہتر نتائج نکلے۔ مولانا مملوک علی اور بعض دیگر علمائے کرام کی کالجوں میں ملازمت اور خدمت تدریس کی وجہ سے بھی مسلمانوں میں اس کے لیے ایک کشش اور جاذبیت پیدا ہوئی۔

سیاسیات سے بے تعلقی

مولانا عبید اللہ سندھی کا کہنا ہے کہ ۱۲۵۸ھ میں جب مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز مقدس تشریف لے گئے تو ان کے

بعد سیاسی تحریک کو جاری رکھنے اور اس کے انتظام کے لیے ایک بورڈ بنایا گیا تھا جس کے صدر مولانا مملوک علی تھے اور نواب قطب الدین، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی اس بورڈ کے رکن تھے۔ لیکن مولانا سندھی کی یہ بات قرین صحت نہیں۔ اس کی موٹی موٹی تین وجوہ ہیں۔

اول: مولانا مملوک علی نے کبھی سیاسیات میں حصہ نہیں لیا۔ ان کی تمام زندگی درس و تدریس میں گزری۔ سیاسی معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔
دوم: مولانا مملوک علی انگریزی حکومت کے باقاعدہ ملازم تھے، وہ انگریز کی مخالفت کیونکر کر سکتے تھے۔

سوم: دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپل ان کے مداح تھے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے، ان کی تدریسی اور تعلیمی سرگرمیوں کی بنا پر ان کی ترقی ہوئی، تنخواہ میں اضافہ ہوا، اور پوسٹ انگریز منصب داروں کی سفارش سے ہوا۔ خود ہندوستان کے گورنر جنرل نے ان کو الغام و اکرام اور خلعت سپارچہ سے نوازا۔ اگر یہ سیاسیات ملکی میں لوٹتے تو انھیں ہرگز اس کا مستحق نہ گردانا جاتا۔

ہمارے ہاں الیہ یہ ہے کہ اسی عالم دین کو ”بڑا عالم“ سمجھا جاتا ہے جو انگریزی حکومت کا مخالف رہا ہو۔ اگر مخالفت کا کوئی واضح ثبوت نہ مل سکے تو اس کے معتقدین کھینچ تان کر اس کو انگریز کا مخالف ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ سیاسیات کبھی علم اور قابلیت کے حدود کو ماپنے کا پیمانہ نہیں رہی۔ اگر ایک شخص سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور وہ اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کا محور و مرکز صرف خدمتِ علم و دین کو قرار دیتا ہے تو اس میں کیا بُرائی ہے۔ ہر شخص کو سیاست کی عینک سے دیکھنا ایک سیاستدان ہی کی سوچ ہو سکتی ہے، کسی محقق اور اصل واقعات کی تہہ تک پہنچنے والے کی سوچ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اگر مولانا مملوک علی اور اس دور کے بہت سے دیگر

علمائے کرام نے اپنے عہد کی سیاست میں حصہ نہیں لیا تو کیا ان کے علم و عرفان میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے؟ وہ وقتی سیاسی ہنگاموں سے دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود جلیل القدر عالم تھے اور ان کی خدمات علمی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ لہذا اس ضمن میں نہ کوئی معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے، نہ ان کو کھینچ کر سیاسیات کے اکھاڑے میں لانے کی ضرورت ہے۔ ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی ہنگاموں سے دور رکھا اور دس و تدریس میں مشغول رہ کر بڑے بڑے اصحاب علم کو زیورِ علم سے آراستہ کیا اور انہیں "العلماء کا لقب پایا" رحمۃ اللہ علیہم جمعیں یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں کسی سیاسی تحریک کو جاری رکھنے اور اس کے انتظام کیلئے نہ کوئی بورڈ بنایا گیا تھا اور نہ کوئی اس کا رکن یا صدر تھا اور نہ اس کی ضرورت ہی تھی۔

اخلاق و کردار

مولانا مملوک علی بلندا خلاق اور عالی کردار عالم تھے۔ تواضع، حلم، بردباری اور انکسار کا پیکر تھے۔ علم کے خادم اور علما کے قدردان تھے طلباء سے نہایت حسن سلوک سے پیش آتے اور عمدہ انداز سے ان کو پڑھاتے تھے تصنیع اور تکلف سے انہیں نفرت تھی، سادہ لباس پہنتے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وعظ و تقریر کی بالکل عادت نہ تھی ان کا اصل کام درس و تدریس تھا اور تمام عمر ہی میں مشغول رہے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر کی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے) نہایت مخلصانہ تعلقات تھے مولانا مملوک علی کے فرزند گرنی مولانا محمد یعقوب نالوتوی اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں :-

”جب مولوی مظفر حسین کاندھلوی (صاحب دہلی تشریف لاتے تو والد مرحوم (مولانا مملوک علی) کے پاس ہمارے مکان میں فرودکش ہوتے اور والد مرحوم جب وطن (نالوتہ) جاتے، کاندھلہ ہو کر جاتے۔ جب وطن لوٹتے کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے اور یہی حال حاجی امداد اللہ صاحب سے تھا۔“

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔
 "مولانا مملوک علی صاحب ہمیشہ دہلی آئے اور جاتے، جب کاندھلہ سے
 گزرتے تو باہر سڑک پر گاڑی کو چھوڑ کر ملنے آتے۔ حضرت مولانا مظفر حسین
 صاحب اول یہ پوچھتے کہ کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے؟ اگر کھا چکے تو کچھ نہیں،
 اور اگر نہ کھائے ہوتے تو کہہ دیتے کہ میں کھاؤں گا، تو مولانا پوچھتے کہ رکھا
 ہوا لا دوں یا تازہ پچو ا دوں؟ چنانچہ ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ رکھا ہوا لا دو۔ اس
 وقت صرف کھچڑی کی کھسرن تھی، اسی کو لے آئے اور فرمایا رکھی ہوئی تو یہی
 تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ بس یہی کافی ہے۔ پھر جب رخصت ہوتے تو مولانا
 مظفر حسین صاحب ان کو گاڑی تک پہنچانے جاتے تھے۔ یہی ہمیشہ کا معمول تھا۔
 بلاشبہ یہ حضرات خلوص و دیانت، نرمی و انکسار اور الفت و مودت کا
 نمونہ تھے اور ان کی حیات مستغاپ کا ایک ایک لمحہ ذکر الہی اور خدمتِ علم و علما
 میں گزرتا تھا۔ اب دنیا اس قسم کے سراپا عمل لوگوں سے خالی ہو گئی ہے اور
 ہر طرف مادیت کا دور دورہ ہے۔"

ترجمہ
 مولانا مملوک علی کے شب و روز درس و تدریس میں بسر ہوتے تھے اور ہر وقت
 ان کے گرد حصولِ علم کے شائقین کا مجمع رہتا تھا۔ تصنیف و تالیف سے انھیں
 دلچسپی بھی نہ تھی اور اس کے لیے فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ البتہ دہلی کالج کی طرف سے
 جن کتابوں کا کسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرایا جاتا تھا، ان میں سے زیادہ تر کی
 نگرانی ان کے سپرد تھی اور ان پر نظر ثانی بھی وہی کرتے تھے۔ کالج کے زمانے میں
 انھوں نے جن کتابوں کے خود ترجمے کیے وہ مندرجہ تحت ہیں۔
 ۱۔ جامع ترمذی :- یہ کتاب دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ لہذا انھوں

نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔

۲۔ تحریر اقلیدس :- دہلی کالج کے ایک انگریز پرنسپل کے کہنے پر ۱۸۴۴ء میں اس کے ابتدائی چار مقالوں اور آخر کے دو مقالوں (گیارہویں اور بارہویں) کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ مولوی کریم الدین پانی پتی اس ترجمے کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”ترجمہ اردو زبان میں پانی پتی کرنا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا۔“

یہ کتاب صرف دوسرے نمبر چھپی۔ ۱۸۴۹ء میں ایک سو بیچاس کا پیاں اور ۱۸۵۱ء میں تین سو کا پیاں طبع ہوئیں۔

۳۔ تاریخ مسینی : یہ کتاب بھی دہلی کالج میں داخل نصاب تھی۔ مولانا ممدوح نے اس کا بھی اردو ترجمہ کیا۔

۴۔ عربی خط (غیر منقوط) مولوی کریم الدین پانی پتی نے ”فرائد الدھر“ میں ان کا ایک عربی خط نقل کیا ہے جو غیر منقوط ہے اور شہزادہ فیروز شاہ کے نام ہے۔

وفات

دیار ہند کے اس عالم اجل پر مرض برقان کا حملہ ہو گیا تھا۔ گیارہ دن اس مرض میں مبتلا رہے اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو علم جاوہلی کی راہ لی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندانی قبرستان مہندیوں میں شیخ عبدالعزیز شکر بار کے پائیں میں دفن ہوئے۔ انھوں نے دہلی میں علم حاصل کیا، دہلی میں ہمیشہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور دہلی ہی کی سر زمین میں ابدی نیند سو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ دہلی کالج کے پرنسپل نے ۱۳ اکتوبر ۱۸۵۱ء کو مولانا کے انتقال کی اطلاع مجلس انتظامیہ کو دی۔

مولانا محمد حسن نانوتوی، ص ۱۸۸۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی

مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے عالی قدر فرزند تھے۔ انھوں نے بھی باپ کی طرح بڑی شہرت پائی اور بہت ندریسی خدمت انجام دی۔ ۱۳- صفر ۱۲۳۹ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ محرم ۱۲۶۰ھ میں جب کہ ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی، ان کو اور مولانا محمد قاسم کو مولانا مملوک علی بغرض تعلیم نانوتہ سے دہلی لے گئے تھے۔ محمد یعقوب دہلی کالج کے طالب علم رہے اور علوم متداولہ اپنے والد گرامی (مولانا مملوک علی) سے پڑھے۔ علم حدیث کی تحصیل شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا احمد علی سہارن پوری سے کی۔ باپ کی وفات کے بعد تقریباً ایک سال اپنے مکان (کوچہ چلیاں، دہلی) میں رہے۔ اس کے بعد چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پر گورنمنٹ کالج اجمیر میں معلم مقرر ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی پانچ سال وہاں رہے۔ بعد ازاں عہدہ سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ اسی اثنا میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ اس دوران میں وہ اپنے وطن نانوتہ میں مقیم رہے۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم (دیوبند) قائم ہوا تو اس میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں وہ سرکاری ملازمت سے علیحدہ ہو چکے تھے اور میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے چھاپہ خانہ میں ملازم تھے۔ دارالعلوم (دیوبند) کے وہ سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے، اور تنخواہ تیس روپے ماہانہ تھی۔ انیس سال یہ خدمت انجام دی۔ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ طلبانے ان سے حصول علم کیا جو اپنی بوقلموں خصوصیات کی بنا پر اپنے دور کے اعظم رجال میں شمار ہوئے۔

جلیل القدر باپ کی طرح مولانا محمد یعقوب بھی زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ تصنیف تالیف سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تحریری صورت میں ان کی صرف تین چیزیں دست یاب ہیں (۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی (۲) مکتوبات مولانا محمد یعقوب (حصہ اول) اور (۳) مکتوبات یعقوبی و

بیاض یعقوبی۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔

اس عالم اجل نے ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۲۱ دسمبر ۱۸۸۴ء) کو ہسپتے کی بیماری سے اپنے وطن نانوتہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

تذکرہ نگاروں کا اظہار عقیدت

سر سید احمد خاں مرحوم نے جب "آثار الصنادید" لکھی اس وقت مولانا مملوک علی زندہ تھے۔ وہ مولانا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"شاگرد رشید مولوی رشید الدین خان صاحب، علم معقول و منقول میں استعداد کامل۔ اور کتب و درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینہ عالم عالی ہو جائے تو ان کی لوح حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔ ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و علم احاطہ تقریر سے افزوں۔ اگرچہ نئی دنیا داروں کی ہے، لیکن سیرت اور سرسیرت میں درویشانہ..... اب کسی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں کہ مدرسہ اقل اس سے عبارت ہے۔ انشاءً و نظم و نثر کی طرف کم توجہ ہے۔ اگر ایسا فاضل اس طرف بھی متوجہ ہوتا تو یقیناً ہے کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا۔"

"واقعات دارالحکومت دہلی" کے مصنف بشیر الدین احمد تحریر کرتے ہیں "شیخ عبدالعزیز صاحب شکر بار کے پائیں میں آپ کی قبر کھدی ہے۔ جب تک کوئی نہ بتائے نہیں مل سکتی۔ ناقدردانی زمانہ ملاحظہ ہو کہ آپ کے ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار تھے، مگر استاد کو کسی نے بھی نہ پوچھا اور اتنا بھی نہ کیا کہ ایک ہاتھ بھر کا پتھر کا ٹکڑا لگا دیتے کہ اس خاک کے ڈھیر پر سے گزرنے والے فاتح تو پڑھ لیتے۔ آپ کا اصل وطن نانوتہ ضلع سہارن پور ہے، مگر جب سے دہلی میں مدرس ہوئے اب وہاں کی کشش نے جانے نہ دیا۔ آپ مولانا رشید الدین

خاں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تمام ہندوستان آپ کے فیض سے مملو ہے۔^{۱۱۶}

نواب محمد صدیق حسن خاں ان کے بارے میں رقم طراز ہیں :-

”اذاعیانِ دہلی بوند، تلمذِ ایشان در علومِ درسیہ با مولوی رشید الدین خاں است، و از طرفِ فرنگیان تدریس درجہ اول مدرسہ دہلی بالیشان تعلق داشت۔“^{۱۱۷}

یعنی وہ (مولانا مملوک علی) دہلی کے اکابر میں سے تھے اور علومِ درسیہ میں مولانا رشید الدین خاں کے شاگرد تھے۔ مدرسہ دہلی میں انگریزوں کی طرف سے جماعتِ اول (عربی) پڑھانے کے لیے مقرر تھے۔

مولوی کریم الدین پانی پتی جو مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے، اُستاد کے فضل و کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اور اردو اور

عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم اور فن سے جوان زبانوں میں

ہیں، مہارتِ تامہ ان کو حاصل ہے، اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی

سے ترجمہ ہوتی ہے، اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو

جاتا ہے۔ گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے، اور جس کار پر مامور ہیں،

اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے تصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کی ذات

بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو۔“^{۱۱۸}

مولوی کریم الدین پانی پتی نے اپنی ایک اور کتاب ”تذکرہ فرائد الدھر“

میں بھی مولانا مملوک علی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کا تمام

وقت درس و تدریس میں گزرتا تھا اور سیکڑوں طلباء ان سے تعلیم پاتے تھے، جو طالب علم

^{۱۱۶} واقعات دارالحکومت دہلی، ج ۲، ص ۵۸۴،

^{۱۱۷} تاریخ قنوج (قلمی) از نواب صدیق حسن ص ۱۰۰ (مرتبہ ۱۲۷۸ھ) مخزنہ مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ۔ حبیب کنج کلکشن۔

^{۱۱۸} تذکرہ طبقات الشعرائے ہند ص ۴۶۳۔

بھی حصولِ علم کے لیے آتا، وہ اس کو مایوس نہ کرتے اور اس کے دل کو رنج نہ پہنچاتے۔ پوری وسعتِ قلب اور حُسنِ اخلاق سے پیش آتے اور اُسے وہ علم پڑھاتے جو وہ پڑھنا چاہتا۔ گھر میں بھی اور مدرسے میں بھی ان کے گرد طلباء کا ہجوم رہتا۔ اس ضمن میں مولوی کریم الدین کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

”گھر اس کا محط الرجال طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علما وفضلا، صد ہا شاگرد اس ذاتِ بابرکات سے فیض اُٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے..... سوائے درسِ دہی طلبائے مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں..... تمام اوقاتِ گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہیں..... ان کی خدمت میں صد ہا طالب علم اطراف و جوار میں سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حُسنِ اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں۔“

مولانا مملوک علی کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں مولانا رشد احمد گنگوہی بھی شامل ہیں۔ مولانا گنگوہی کے حالات میں مولانا عاشق علی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ مولانا مملوک علی کے اسلوبِ تدریس کے بارے میں مولانا گنگوہی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

”ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھنے تھے، لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی، کبھی سبق مٹوڑا ہوتا تھا اور کبھی شبہات کا جواب نہ ملتا تھا، مگر جب مولانا مملوک علی صاحب کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصے میں کتابیں ختم کر لیں، گویا استاد نے گھول کر پلا دیا، (مولانا گنگوہی) فرمایا کرتے تھے کہ ”اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے، مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواعِ مختلفہ سے تفریر کر کے

شاگرد کے ذہن نشین کر دیں، ایک ہمارے استناد مولانا مملوک علی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین صاحب تھے ارحمۃ اللہ علیہما۔^{۱۲۰}

مولانا محمد یعقوب ناتوتوی جو مولانا مملوک علی کے فرزند گرامی تھے اور اپنے دور کے جید عالم تھے، اپنے والد کرم کے اسلوب تدریس کے متعلق لکھتے ہیں:-
 ”ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرز عبارت سے سمجھ لیتے تھے تاہم مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں؟“^{۱۲۱}

سید عبدالحی حسنی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں:-
 مولانا مملوک علی صدیقی ناتوتوی شیخ اور عالم کبیر تھے مولانا رشید الدین خان علوی کے شاگرد تھے فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے، منطق و فلسفہ میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ تمام عمر درس و تدریس میں مشغول رہے اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔^{۱۲۲}
 مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں:-

”انھوں (مولانا مملوک علی) نے مولانا رشید الدین سے اخذ علم کیا اور علوم عربیہ فقہ اور فہم کے حصول میں اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ اپنے استاد مولانا رشید الدین کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیے گئے۔“^{۱۲۳}

^{۱۲۰} تذکرۃ الرشید، ج ۱ ص ۳۰، ۳۱

^{۱۲۱} سوانح عمری مولانا محمد قاسم ناتوتوی، ص ۱۸

^{۱۲۲} نزہۃ الخواطر، ج ۱ ص ۲۸۷

^{۱۲۳} شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۸۱۔ مولانا سندھی کا یہ کہنا درست نہیں کہ مولانا مملوک علی کو ان کے استاد مولانا رشید الدین خاں کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک علی کو ایک ساتھ ہی یہ منصب تفویض کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مولانا رشید الدین خاں کو شعبہ عربی کا صدر مدرس بنایا گیا تھا اور سوردیپے ماہرہ تنخواہ تھی۔ مولانا مملوک علی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

۱۰۶۔ علامہ ہدی مازندرانی

ہندوستان کے خلیفہ علماء و فقہاء میں علامہ ہدی بن محمد شیخ استرآبادی مازندرانی اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا مولد و منشا ایران کا ایک شہر مازندران ہے۔ سید علی طباطبائی اور بعض دیگر اہل علم سے تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۲۴۰ھ کو غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں لکھنؤ پہنچے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ یہ لکھنؤ میں شاہان اودھ کا دور تھا اور بہت سے اہل سنت اور شیعہ اصحاب علم وہاں موجود تھے اور ان کے باہم مباحثے اور مناظرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ لیکن علامہ ہدی نے ان مباحث و مناظرات میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ وہ ایک فاضل مجتہد تھے اور سب علاقے سے منقطع ہو کر تدریس و تصنیف میں مشغول رہتے تھے۔ ان کا گھر ہی ان کا مدرسہ تھا اور وہیں طلباء کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے اور گھر ہی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ عام لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور کسی کے ہاں آمد و رفت تھی۔

علامہ ہدی مازندرانی نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

- ۱۔ قاطبیں العقول فی قواعد الاصول۔
 - ۲۔ ثبائیں الفرعیات فی نوا میں الشرعیات۔
 - ۳۔ حاشیہ مطول۔
 - ۴۔ اصول دین سے متعلق ایک رسالہ جو فارسی زبان میں ہے۔
- اس کے علاوہ انہوں نے بعض رسائل بھی تحریر کیے جو ان کے دور میں کافی مشہور ہوئے اور اہل علم کے مطالعے میں رہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے، کانقر نائب مدرس کی حیثیت سے ہوا تھا اور تنخواہ پچاس روپے تھی۔ تاریخ تقرری یکم جون ۱۸۲۵ء ہے۔

اس شیعہ مصنف و فقیہ نے ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۹ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی اور قبرستانِ حسینہ مجتہد میں دفن ہوئے ^{۱۲۴ھ}

۱۰۶۔ سید مہدی لکھنوی

سید مہدی لکھنوی شیعہ عالم و فقیہ تھے اور صاحب تصنیفات تھے۔ ان کا مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: مہدی بن ہادی بن مہدی بن دلدار علی حسینی لکھنوی۔

سید مہدی اکابر علمائے شیعہ میں سے تھے اور مجتہد کے درجے پر فائز تھے۔ اپنے زمانے کے شیخ اور فاضل شخص تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ ان کے آبا و اجداد علم کی دولت سے مالا مال تھے۔ اپنے والدِ مکرم (سید ہادی) سے حصولِ علم کیا اور والد کے عمِّ محترم سید محمد بن دلدار علی سے سند لی۔ سید مہدی تقریر و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شوق بھی رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے صرف دو کتابوں کا پتہ چل سکا ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تحفة الصائم۔

۲۔ رسالہ فی الاجتہاد والنقلید۔

سید مہدی حسینی لکھنوی نے اپنے والد سید ہادی کی وفات کے دو سال بعد ۱۲۷۷ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی ^{۱۲۵ھ}

^{۱۲۴ھ} کے نجوم السامعین — زمبہ الخواطر ج ۷ ص ۲۹۰، ۲۹۱

۱۲۷ھ کے نجوم السامعین — زمبہ الخواطر، ج ۷، صفحہ ۲۹۱

ن

۱۰۸۔ سید ناصر حسین جون پوری

صوبہ یوپی کا شہر جون پور کسی زمانے میں اہل علم کا مرکز اور اصحاب فضل کا مسکن تھا۔ اس میں جہاں اہل سنت کے علما کثیر تعداد میں فروکش تھے، وہاں شیعہ علما بھی آباد تھے۔ اس شہر کو شیراز ہند کہا جاتا ہے، اس لیے کہ مختلف اوقات و ادوار میں بے شمار مصنفین و مؤلفین، متعدد مدرسین و معلمین اور بہت سی فقہاء و علما اس میں اقامت گزین رہے اور ہر مسلک و مذہب کے اصحاب کمال یہاں جمع ہو گئے تھے۔

تیرھویں صدی ہجری میں جن علما و فقہانے اس شہر کو رونق بخشی، ان میں ایک عالم و فقیہ سید ناصر حسین تھے جو سید مظفر حسین حسینی جون پوری کے فرزند تھے اور شیعہ عالم تھے۔

سید ناصر حسین حسینی جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بعض درسی کتابیں اپنے شہر کے ممتاز حنفی عالم مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری سے پڑھیں اور بعض کی تکمیل مولانا عبدالعلیم انصاری لکھنوی سے کی۔ پھر جون پور کے ایک ممتاز شیعہ عالم گلشن علی کے درس میں حاضر ہوئے۔ ان سے شیعہ امامیہ کی فقہاء و علم کلام کی کتابیں پڑھیں۔

اس کے بعد لکھنؤ گئے، وہاں سید محمد تقی کا سلسلہ درس جاری تھا جو اس دور کے شیعہ مجتہد تھے، ان سے اخذ علم کیا۔ پھر حرمین شریفین کا قصد کیا اور سعادت حج حاصل کی۔ وہاں سے عازم عراق ہوئے اور مختلف مقامات میں گھومے پھرے۔ بعد ازاں ہندوستان آئے۔

سید ناصر حسین نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں جو درج ذیل ہیں :

۱۔ علم الادب فی مناہج کلام العرب : یہ عربی محاورات سے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔

۲۔ ایک رسالہ عربی ادب کے بارے میں۔

۳۔ رشتق الثبالی : یہ اثباتِ متعہ اور تخلیفِ قرآن سے متعلق ہے۔

۴۔ ایک رسالہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق۔ اردو میں۔

۵۔ ایک رسالہ آیت تطہیر کی تفسیر میں۔ اردو میں۔

۶۔ ایک رسالہ نجاستِ مشرکین کے اثبات میں۔ یہ رسالہ فارسی زبان

میں ہے۔

۷۔ اہل بیت کے مصائب و آلام کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب اردو میں۔

ان کے علاوہ کچھ اور رسائل بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

۱۰۹۔ سید نثار علی ظفر آبادی

سید نثار علی بن محمد صادق حسینی واسطی ظفر آبادی، جلیل القدر عالم، مشہور شیخ اور ممتاز محدث تھے۔ ان کی ولادت و تربیت ظفر آباد میں ہوئی۔ جون پور کے قریب صوبہ لوہی کا ایک شہر ہے۔ ابتدائی کتابیں ظفر آباد اور جون پور کے اساتذہ سے پڑھیں، پھر لاہور آئے، وہاں شاہ خوب اللہ کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور شاہ صاحب سے استفادہ کیا۔ شاہ برکت اللہ سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ پھر دہلی گئے۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا زمانہ تھا اور دہلی کو اس عہد میں گواراۃ علم کی حیثیت حاصل تھی۔ سید نثار علی نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور چار سال ان کے

لے تنجی نوری ج ۲ ص ۸۱ تا ۸۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۴۲۷، ۴۲۸۔

نزمیۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۹۳، ۲۹۴۔

حلقہ درس میں شامل رہے۔ اس اثنا میں انہوں نے شاہ صاحب سے خوب استفادہ کیا پیمیل علم کے بعد اپنے شہر جون پور گئے اور درس و افادہ کی مسند بھپائی بہت سے علما و طلباء ان سے مستفید ہوئے اور ان کی شہرت گرو ذراچ میں پھیل گئی۔

سیدنا علی حدیث و فقہ کے جید عالم تھے اور فلسفہ و منطق میں بھی انہیں درک حاصل تھا۔ متواضع، حسن اخلاق سے مالا مال، شیریں گفتار اور عالی کردار تھے۔ لوگوں سے منہایت اچھے مراسم رکھتے تھے اور سب سے حسن ظن کا اظہار کرتے تھے۔

اس عالم کبیر اور فقیہ نامدار نے جمعۃ المبارک کے دن ۲۷۔ شوال ۱۲۱۵ھ کو میاں پورہ میں وفات پائی جو اعمال آباد میں ایک گاؤں ہے۔

۱۱۰۔ قاضی نجم الدین علی خاں ثاقب علوی کا کوری

سلطنت مغلیہ کے دور زوال کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا تو انہیں ایسے علما و فقہاء کی تلاش تھی جو مسلم پرسنل لا "تیار کر کے مسلمانوں کے فقہی مسائل کو ان کے ذہن و فکر کے مطابق نافذ کر سکیں۔ اس عہد کا ہندوستان اپنے علم و فضل میں مشہور تھا۔ خصوصاً صوبہ اودھ کے قصبات و دیہات کو اس ضمن میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ اسی صوبے کے مشہور و مردم خیز قصبہ کا کوری کے ایک عالم دین پران کی نظر پڑی اور انہیں قاضی القضاة کا منصب عطا کیا گیا۔ ان کا کام قرآن و حدیث اور فقہ کے ائمہ اربعہ کے فتاویٰ کی روشنی میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات کے فیصلے کرنا تھا۔ اس عالم و فقیہ کو قاضی القضاة مولانا نجم الدین علی خاں علوی بہادر اشرف جنگ ثاقب کا کوری کے نام سے

۲ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۹۷۸، ۹۷۹۔ ————— نزہۃ الخواطر

ج ۷، ص ۲۹۲

سچا ناجاتا ہے۔

عہد انجری سے قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) میں علویوں کے دو ممتاز خاندان آباد ہیں، جن میں ایک خاندان مخدوم زادگان کا ہے جس کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم نظام الدین القاری المعروف بہ شاہ بھکاری کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ دوسرا خاندان ملک زادوں (مولوی زادوں) کا ہے، جس کے نسب کا سلسلہ ملک بہار الدین کیتباد بن ملا البکر جامی کے ذریعے حضرت علی پرمنٹی ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں خاندانوں میں ہر دور میں بڑے بڑے مشاہیر فضلاء و علما، فقہاء و فقراء، ارباب دولت و ثروت اور صاحبان دل پیدا ہوتے ہیں۔

نام و نسب

قاضی القضاة نجم الدین علی خاں ملک زادگان کے اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کے اسلاف جس قدر باعثِ رشک ہوئے، اسی قدر اس کے اخلاف قابلِ فخر ہوتے ہیں۔ سلسلہ نسب تیس واسطوں سے حضرت علیؑ تک اس طرح پہنچتا ہے۔ نجم الدین علی خاں ثاقب (۱) بن ملا حمید الدین محدث (۲) بن ملا غازی الدین شہید (۳) بن ملا محمد غوث (۴) بن ملک ابوالخیر (۵) بن ملک عبدالغفار معروف بہ ملک ابوالمکارم (۶) بن ملک عبدالسلام (۷) بن ملک مسطی (۸) بن ملک حافظ چاند (۹) بن ملک حسام الدین (۱۰) بن ملک نظام الدین (۱۱) بن ملک بہار الدین کیتباد (۱۲) بن ملا البکر جامی (۱۳) بن خواجہ درویش علی محمد (۱۴) بن خواجہ شیخ احمد جام زندہ فیل (۱۵) بن خواجہ شیخ جامی (۱۶) بن خواجہ ابوطالب جامی (۱۷) بن خواجہ

۳۳ ملا البکر جامی کی شادی ملک اسعد الدین سالاری وزیر اعظم سلطان حسین شرقی فرماں روا کے سلطنتِ جون پور کی بیٹی کے ساتھ ہوئی جن کے بطن سے بہار الدین کیتباد پیدا ہوئے۔ اس وقت سے ناہیلیاں نسب کے لحاظ سے ان کا لقب ملک قرار پایا۔ اسی بنا پر ان کی اولاد ملک زادے کہلائی۔

محمد شاہ جامی (۱۸) بن خواجہ محمد رضا جامی (۱۹) بن خواجہ موسیٰ جامی (۲۰) بن خواجہ عمران جامی (۲۱) بن خواجہ عثمان (۲۲) بن خواجہ ابو حنیف (۲۳) بن خواجہ اسفندیار (۲۴) بن خواجہ ابوالحسن کوفی (۲۵) بن خواجہ ابوتراب (۲۶) بن خواجہ محمد رضی کوفی (۲۷) بن خواجہ محمد (۲۸) بن حضرت ابوالقاسم (۲۹) بن حضرت محمد ابن الحنفیہ (۳۰) بن حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

ولادت اور تعلیم

قاضی نجم الدین کی ولادت ۱۵۔ ربیع الاول، ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) کو کاکوری میں ہوئی۔ مادہ سال ولادت کسی نے نجم ثاقب نکالا۔

تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد ملا حمید الدین محدث (۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء) ملا حسن فرنگی محلی اور مولانا غلام بیچی بہاری سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے بڑے ذہین و طباع تھے۔ صاحب سفر نامہ لندن رقم طراز ہیں کہ: ”پندرہ برس کی عمر میں معقولات و منقولات کی کتابوں سے فارغ ہوئے۔ یہ علم حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندھی سے حاصل تھی۔ صاحب نزمیہ الخواطر نے ان کے بارے میں جو الفاظ تحریر فرماتے ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ و فاضل قاضی القضاة نجم الدین علی خاں ہندوستان کے مشہور علما میں سے تھے۔ ۱۵۔ ربیع الاول، ۱۱۵۷ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ اپنے والد سے علم حاصل کیا، پھر شیخ عبدالرشید جون پوری سے جو لکھنؤ میں مدفون ہیں اور شیخ غلام بیچی بن نجم الدین بہاری اور ملا حسن بن غلام مصطفیٰ لکھنوی سے تحصیل علم کی اور شاید فنون ریاضی کا اکتساب علامہ تفضل حسین کشمیری (م ۱۲۱۵ھ)

۱۔ باقیات الصالحات۔ مولوی ممتاز الدین حیدر (مخطوطہ)

۲۔ سفر نامہ لندن۔ مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ (مخطوطہ) ۳۶۴

۳۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری۔ حافظ شاہ علی حیدر قلندر۔ ص ۳۳۷

سے کیا تھا۔

علم و فضل

یوں تو تمام علوم و فنون میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، لیکن علم حضورِ اہل اور ریاضی میں بڑی دست گاہ تھی۔ سفرنامہ مولوی مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ کے مندرجہ ذیل واقعے سے آپ کی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

”نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۷ء) کو خود علمِ جبر کا بڑا شوق تھا۔ نواب مذکورہ کو اتفاق سے اس فن میں حکیم ماشاء اللہ خاں سے ایک کتاب مل گئی تھی، جسے وہ نہایت عزیز رکھتا تھا۔ اس کی تصحیح کے لیے فیض آباد اور فیض آباد سے باہر کے علما مقرر ہوئے، مگر کسی سے اس کی صحت نہ ہو سکی۔ قاضی القضاة نجم الدین صاحب کو بھی اس کی تصحیح کے لیے طلب کیا گیا۔ انھوں نے محض یادداشت پر اس کی تصحیح شروع کر دی اور ساتھ ہی ایک بسیط شرح بھی لکھنی شروع کر دی۔ خود نواب موصوف روزانہ آکر اس کو دیکھتا اور بہت خوش ہوتا۔ اکثر یہ ہوتا کہ نواب کو آتے دیکھ کر یہ تعظیماً کھڑے ہو جاتے مگر وہ باصران ان کو بٹھا دیتا اور خود کھڑے ہو کر ان کا کام دیکھتا رہتا۔ نواب نے اپنی تخت نشینی کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ اب کسی کو معافی نہ دی جائے گی، چنانچہ جن جن اشخاص کو معافیاں دی گئی تھیں وہ بھی ضبط کر لی گئیں۔ ملا حمید الدین محدث کا کوڑی کو بھی ایک موضع ہو گیا۔ ”دکھیا“ معاف ہوا تھا، وہ بھی ضبط ہو گیا۔ قاضی القضاة نجم الدین نے اپنے حسنِ خدمت

۷۷ نزهة الخواطر، ج ۷، ص ۲۹۷

۷۸ حاجی مسیح الدین خاں (بن قاضی علیم الدین خاں بن قاضی القضاة نجم الدین علی خاں) سفیر شاہ اودھ و میرفتی گورنر جنرل بہادر (م ۱۲۹۲ھ) کا یہ سفرنامہ اس عہد کے اودھ کی حالت اور انگریزوں کے مستند و دلچسپ حالات میں ایک نادر و نایاب مخطوط ہے۔ چودہ سو صفحات پر مشتمل یہ مخطوط پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ اس کے ایک باب میں مولف موصوف نے اپنے اہل خاندان کے حالات تحریر کیے ہیں۔

اور کاڈگزارے کو پیش نظر رکھتے ہوئے معافی کی درخواست دی۔ بظاہر اس موضع کی واپسی کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن نواب نے ان کی ذاتی لیاقت اور حسن عمل کی بنا پر وہ موضع دوبارہ معافی میں دے دیا۔ چنانچہ یہ معافی کا پروانہ لے کر گھر آئے اور حسب دستور سابق درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔^{۱۹}

قاضی نجم الدین علی خاں کے علم و فضل اور کمال کا شہرہ سن کر الماس علی خاں نے ان کو اپنے مدرسے کا منصب مدرسہ قبول کرنے کو کہا، جسے انہوں نے قبول کر لیا۔

منصب قاضی القضاة

تذکرہ مشاہیر کوری میں مرقوم ہے کہ "آغاز تیرھویں صدی ہجری میں بجانب ایسٹ انڈیا کمپنی جب عہدہ قاضی القضاة پر تقرری کی تجویز کلکتہ میں ہوئی تو اس زمانے میں علامہ تفضل حسین خاں نے (جو آصف الدولہ بہادر ۷۵، ۷۶ تا ۷۹ء) کے وقت میں کلکتہ میں سفیر تھے، ان کے فضائل و کمالات علمی کا تذکرہ گورنر جنرل بہادر سے کیا، اس وقت اس عہدے میں تقرر کا مستند سرکار انگریزی میں درپیش تھا۔ بہت سے علما کے نام سامنے تھے، خوش قسمتی سے یہی منتخب ہو کر مالک محروسہ سرکار کمپنی کے اول قاضی القضاة مقرر ہوئے۔"

انگریزوں نے ان کی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے منصب قاضی القضاة پر ان کو متعین کیا۔ علامہ تفضل حسین خاں نے ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں گورنر جنرل بہادر کے حکم سے تقرری کا خط بھیجا، لیکن والد ماجد نے لائق بیٹے کو اتنی دُور کلکتہ نہ جانے دیا۔ مگر جب علامہ معروف نے بہت اصرار کیا تو اجازت دے دی چنانچہ آپ کلکتہ پہنچے۔ اس زمانے میں سر جان شور گورنر تھا، وہ استقبال کے لیے

^{۱۹} سفر نامہ لندن، ص ۵-۳۶۷

^{۲۰} تذکرہ مشاہیر کوری، ص ۲۳۳

آیا۔ قاضی صاحب کو خود پاکی سے اتارا اور معاف کر دیا۔ آپ جب تک وہاں رہے
بڑی عزت و احترام کے ساتھ رہے۔ گورنر جنرل عبیدین کے مواقع پر خود ان کے پاس آتا
اور معاف کرتا تھا۔^{۱۱}

باوجودیکہ آپ ایسے منصب پر فائز تھے جس سے درس و تدریس کے لیے وقت
نکالنا مشکل تھا، لیکن کلکتے کے دوران قیام میں آپ نے یہ مشغلہ برابر جاری رکھا،
چنانچہ صاحب تذکرہ علمائے ہند آپ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ :-
بمنصب قضی القضاة کلکتہ ممتاز بود، مع بذات تدریس و افادۃ طلبائے علوم
لبایت می کوشید^{۱۲}

رہا وجودیکہ کلکتے کے قاضی القضاة کے منصب پر ممتاز تھے، لیکن
درس و تدریس اور طالبان علم کے افادہ کے لیے کوشاں رہتے۔
ہندوستان کے تمام صوبوں مثلاً اودھ، الہ آباد، اکبر آباد، اوڑیسہ، بنگال اور
بہار اور ڈھاکہ وغیرہ تمام جگہوں پر آپ کے فتوے پر مسلمانوں کے فیصلے ہوتے تھے۔
پچیس سال عہدہ قاضی القضاة پر متمکن رہے اور نہایت خوبی سے اپنے فرائض
منصیبی انجام دیے۔ اس کے بعد یہ سبب کہ سستی اس عہدے سے مستعفی ہوئے۔^{۱۳}
فولاً القضاة الاکابر فاستقل بہ خمساً و عشرين سنة^{۱۴}
گورنر جنرل نے ان کو قاضی القضاة بنا دیا، اس عہدے پر وہ پچیس سال فائز رہے،
نواب علی حسن خاں سلیم نے تذکرہ صبح گلشن میں ان کے بارے میں جو کچھ فارسی
میں لکھا ہے اس کا اردو ترجمہ یہ ہے :-
”ثائب قاضی القضاة محمد نجم الدین خاں بہادر لکھنؤ سے دس میل کے فاصلے پر قصبہ

^{۱۱} سفرنامہ لندن، ص ۳۷۰ -

^{۱۲} تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۳ -

^{۱۳} سفرنامہ، ص ۱ - ۳۷۰ - ^{۱۴} تذکرہ نزهة الخواطر، ص ۶، ص ۲۹۷

کا کوری کے رئیس تھے۔ قرب و جوار کے تمام قصبات سے زیادہ یہاں صاحبانِ فضل و کمال و مردمِ خوش رفتار اور نیک کردار، سچے لوگ تھے۔ آپ کے والد ملا حمید الدین علوم ظاہری و باطنی میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ دادا ملا محمد غوث صاحبِ فضل و کمال اور علم حدیث میں شہنشاہ عالم گیر کے استاد تھے اور آپ دنیاوی و دینی اعتبار سے نجم ثاقب تھے۔ اخلاق و کردار، علوم عقلیہ و نقلیہ، موزوں طبعی و سخن سنجی میں ممتاز تھے۔ کلکتے میں کوئی بھی اہل علم آپ کے مرتبہ قاضی القضاة پر نہ پہنچا۔ آخر عمر میں عمدہ قصائے مستعفی ہو کر تین سو روپے ماہوار پنشن قبول کر کے قناعت کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کلکتے سے وطن روانہ ہوئے۔ راستے میں بنارس کے قریب گویا عالم قدس سے یہ آواز سنی کہ اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف جا۔ ناچار اجل موعود کے تقاضے سے وطنِ اصلی کی طرف رخ پھیرا۔ یہ واقعہ ۱۲۲۹ھ کا ہے۔

لیاقت اور حسن انتظام کی بنا پر آپ کی وفات کے بعد اعزازِ خطاب اور کل تنخواہ بطور پنشن ملی اور پھر آپ کی اہلیہ کو وہ پنشن ملتی رہی۔

گورنر جنرل کا تعزیتی خط

گورنر جنرل بہادر نے قاضی نجم الدین کی وفات پر ان کی اہلیہ کو تعزیتی خط لکھا۔ اس تعزیتی خط سے آپ کی وہ قدر و منزلت جو ان کے دلوں میں تھی، متبرش ہوئی ہے۔

خط یہ ہے: آپ کے شوہر قاضی القضاة بہادر کی وفات کا سدھہ سرکار دولت آباد کھپنی کو آپ سے کم نہیں ہوا کہ جس نے ایسے اپنے متمول اور لائق شخص اور فاضل بے بدل کو گم کیا، چونکہ کارخانہ قضا و قدر میں بجز صبر اور تسلیم کے کوئی چارہ نہیں، لہذا یقین ہے کہ آپ بھی صبر جمیل اختیار کریں گی، اگرچہ آپ کے

۱۵۰ تذکرہ صبح گلشن، نواب علی حسن خاں سلیم، ص ۹۶

۱۵۱ بیاض ڈپٹی امیر حسن صدیقی کا کوری (مخطوطہ) ص ۳۸۳

چاروں بیٹے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، آپ کو اپنے بسراوقات میں احتمال تکلیف کا نہیں، مگر سرکار نے براہِ قدر وانی و نام آوری آپ کے شوہر کے ڈیڑھ سو روپیہ یا سو روپیہ آپ کی پنشن تا حین حیات مقرر کی ہے۔
تصانیف

- قاضی القضاة نجم الدین علی خان نے درج ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں :
- ۱۔ شرح کتاب الجنایات والجرائم قادی عالمگیری :۔ یہ بسیط شرح انھوں نے جناب گورنر جنرل کی ایما و فرمائش پر لکھی، تمام انگریزی عدالتوں میں جس قدر فیصلے ہوتے تھے وہ سب اسی شرح کی بنا پر ہوتے تھے۔ یہ شرح سرکار انگریزی کے حکم سے کلکتہ میں فارسی زبان میں طبع ہوئی تھی۔
 - ۲۔ رسالۃ السنۃ الجبریۃ فی الجبر والمقابلہ : اس رسالے میں اہم مسائل جبر و مقابلہ کا حل لکھا ہے اور خود ہی اس رسالے کی فارسی شرح بھی لکھی جو مع اصل متن کے کلکتہ سے طبع ہوئی۔
 - ۳۔ رسالہ در بیان تناسب اعننائے انسانی۔
 - ۴۔ رسالہ در بیان سعد و نحس۔
 - ۵۔ شرح اخلاق جلالی۔
 - ۶۔ رسالہ انساب۔
 - ۷۔ کشکول موسوم بہ بیاض رشک ریاض : یہ غیر مطبوعہ ہے۔ سفر نامہ لندن کے مولف لکھتے ہیں کہ افسوس ہے یہ بیاض چھپ نہ سکی یاور نہ بڑی مفید عام تالیف

۷۔ چاروں بیٹے یعنی (۱) ممتاز العلماء قاضی محمد سعید الدین خاں بہادر (۲) مفتی حکیم الدین خاں (۳) قاضی علیم الدین خاں (۴) مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہِ اودھ۔
۸۔ یہ پنشن پابندی سے آپ کی اہلیہ کو ان کی زندگی (۱۲۲۹ھ) تک ملتی رہی۔ دیکھیے سفر نامہ لندن، ص ۳۷۲۔

ہوتی کیونکہ اس میں متعدد علوم و فنون کے بہت سے بسیط مضامین و مباحث درج ہیں۔ اس میں ان کے عربی و فارسی اشعار اور قصاید بھی مرقوم ہیں۔ اس بیاض کو پندرہ محافل پر منقسم کیا ہے۔ مثلاً محفل اول علم تفسیر سے متعلق اور محفل دوم علم حدیث سے متعلق ہے۔ ان تصانیف و تالیفات کے علاوہ معتولات کی کتابوں پر ان کے حواشی بھی ہیں۔

عربی نثر بے تکلفی سے لکھتے تھے۔ عربی میں ان کا ایک مقالہ جو انھوں نے شاہ غلام قطب الدین الہ آبادی کی وفات پر لکھا، نواب رضا حسن خاں علمی

گاکوروی (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء تا ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء) نے مطارح الاذکیاء و ہدایۃ الاحباء (صفحہ ۷، تا ۸۰) پر نقل کیا ہے۔ اس مقالے سے جہاں نثر نگاری پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تاریخ گوئی میں وہ کتنا مکر رکھتے تھے۔

تعمیر سے تاریخیں ایسی عمدہ تالیفات کرتے تھے کہ انتہائی تعجب ہوتا۔ نمونہ دو درج ذیل کی جاتی ہیں :-

آپ کے شیخ طریقت حضرت کلید عرفان سیدنا شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی

۱۷ شاہ غلام قطب الدین الہ آبادی، مولانا شاہ محمد فاخر الہ آبادی کے بیٹے اور مولانا شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے پوتے تھے۔ یکم محرم ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) کو پیدا ہوئے۔ علوم ظاہری کی تعلیم مولانا برکت اللہ الہ آبادی سے حاصل کی۔ اپنے والد اکرم مولانا محمد فاخر کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مثنوی نان و قلیہ (در جواب نان و حلوہ) اور بستنان الحنفیہ نیز ایک فارسی دیوان ان کی یادگار ہیں۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے کہ عمرہ کر کے مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ جب مقام تنعیم پر پہنچے تو ذیقعدہ کی آخری تاریخ ۱۲۸۷ھ کو وفات پا گئے۔ امام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ کی قبر کے دامنی جانب مدفون ہوئے۔ مولانا نجم الدین نے ان پر عربی میں دردناک مقالہ لکھا اور ان کی تاریخ وفات بھی نکالی۔

اور ان کی اہلیہ کا انتقال ایک ہی روز اور ایک ہی وقت ہوا۔ مولانا نجم الدین نے فاسکن انت وزوجك الجنة ابد سے سال وفات ۱۱۹۶ھ نکالا۔ شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی اور ان کی اہلیہ کے مرقد پر یہی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کا کوڑی ان کے برادر طریقت کی وفات ۱۲۲۱ھ میں ہوئی، جس پر انھوں نے یہ تعمیم تاریخ نکالی۔ ہو خالدا فی الجنات۔

شاعری

فاضل القضاة نے اپنے صاحبزادوں اور سبق الذکر تالیفات کے علاوہ عربی اور فارسی کلام بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کا کلام اپنے اندر شوخی، لطافت، رقت قلب، سلاست، برجستگی لیے ہوئے ہے۔ معاصر علما کے نزدیک ان کا مقام بہت بلند تھا۔

وفات

کلکتہ سے مستعفی ہو کر وطن آنے کا قصد کیا۔ چنانچہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں بیمار پڑے اور بنارس پہنچ کر یکایک ۳ ماہ ربیع الاول روز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ کو ۷۳ سال ۱۱ ماہ ۱۹ یوم کی عمر میں وفات پائی، چونکہ وصیت تھی کہ میری نعش منتقل نہ ہو لہذا وہیں باغ فاطمان میں دفن ہوئے۔ تذکرہ علمائے ہند اور زہد الخواطر کے مؤلفین کا ماخذ "مجمع العلماء" منظور الدین خاں علوی (مخطوطہ) ہے، اسی لیے صاحب زہد الخواطر نے تحریر کیا ہے:

مات یوم الثلاثاء لثلاث عشرة خلون من ربیع الثانی
سنة تسع وعشرين ومائة والف

۱۲۷ سفرنامہ لندن، ص ۳۷۰ — تذکرہ مشاہیر کا کوڑی، ص ۲۳۷۔

۱۲۸ زہد الخواطر، ج ۷، ص ۳۹۸۔

۱۳۔ ربیع الثانی بروز شنبہ ۱۲۲۹ھ کو وفات پائی۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند لکھتے ہیں :

بروز شنبہ سیزدہم ربیع الثانی یک ہزار و دو صد و بست و نہ ہجری رحلت فرمود^{۲۲}

۱۳۔ ربیع الثانی بروز شنبہ ۱۲۲۹ھ کو وفات پائی۔

ڈپٹی امیر حسن صدیقی اپنی بیاض میں لکھتے ہیں :

قاضی القضاة مولوی نجم الدین علی خاں بہادر مغفور نہایت زبردست فاضل

اور بڑے ادیب، بلیغ اور صاحب تالیفات گزرے ہیں۔ ترجمہ فارسی ہدایہ کا جو

بحکم گورنمنٹ کیا گیا تھا، آپ کی مشہور ویادگار تالیف ہے۔ جب کلکتہ میں صد

عدالت قائم ہوئی آپ اودھ کے علما میں بذریعہ نواب آصف الدولہ اودھ منتخب

ہو کر حسب الطلب گورنمنٹ کلکتہ بھیجے گئے۔ عہدہ قاضی القضاة بنگال اور

ممالک مغربی و شمالی پر مامور ہوئے اور پچیس برس تک اپنی خدمت کو نہایت

اعزاز اور نیک نامی کے ساتھ انجام دیا۔ آخر عمر میں پنشن حاصل فرما کر روانہ ہوئے

اور بنارس میں پہنچ کر ۳۔ ربیع الاول ۱۲۲۹ھ کو انتقال فرمایا اور مقام ظہیر

میں دفن ہوئے^{۲۳}

آپ کی وفات پر مختلف لوگوں نے قطعہ ہائے تاریخ کہے، جن میں سے منشی

فیض بخش علوی کا کو روی مولف تاریخ فرح بخش "اور مولوی فتح علی جون پوری کے

قطعے شامل ہیں۔

اولاد

قاضی نجم الدین کے چار صاحب زادے تھے جو سب کے سب آپ کے اہل کمال

^{۲۲} تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۵

^{۲۳} بیاض، ص ۲۸۳

اور آلوند سیر لابیہ کی صحیح و بین تصویر تھی۔ تذکرہ علمائے ہند کے مولف نے لکھا ہے کہ آپ کے تین صاحب زادے ہوئے، یہ درست نہیں ہے۔

ممتاز العلماء قاضی محمد سعید الدین خاں بہادر

۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد قاضی القضاة

نجم الدین خاں، ملا عماد الدین کبکنی اور مولوی فضل اللہ نیوتنی سے حاصل کی تعلیم ختم کرنے کے بعد قاضی مقرر ہوئے۔ تمام اصناف کا دورہ کرتے تھے۔ بغیر آپ کے فتوے کے

فوجداری مقدمات کے حکم کا نفاذ نہیں ہوتا تھا۔ اپنے علم و فضل، معاملہ فہمی، ذکاوت و طبع کی بنا پر حکام اعلیٰ کی نظروں میں بڑی وقعت تھی۔ ۱۵۔ شعبان ۱۲۲۱ھ سال یکم جوس

کو ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی نے ممتاز العلماء و خان بہادر کا خطاب دیا۔ پھر اپنی قابلیت کی بنا پر انگریزی حکومت کی جانب سے خور و سال نواب فرخ آباد کے ہاں چھ سو روپیہ ماہوار پر نائب مقرر ہوئے۔

شعر و سخن کا ذوق بڑا اعلیٰ تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

۲۱۔ ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) کو کاکوری میں وفات پائی اور اپنے مکان محلہ

قاضی گڑھی کے قریب دفن ہوئے۔

مصنفی حکیم الدین خاں

آپ قاضی القضاة کے دوسرے صاحب زادے تھے۔ ۱۱۹۴ھ (۱۷۷۸ء) کو

کاکوری میں پیدا ہوئے۔ جملہ علوم کی تکمیل اپنے والد اور ملا عماد الدین کبکنی اور مولوی فضل اللہ

نیوتنی سے کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ حجتی میں سررشتہ دار ہوئے۔ پھر صدر امینی کے عہدے

پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد عہدہ صدر الصدوری سے پیش لے کر کاکوری میں

منتقل قیام کیا۔ مطالعے کا بہت شوق تھا۔ انتقال کے وقت بھی ہدایہ کی شرح

فتح القدر پاس تھی۔ ۱۰۔ جمادی الاولیٰ بروز شنبہ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) کو وفات پائی

اور اپنی والدہ کے حظیرہ واقع محلہ کھاری کنواں چاند محل کا کوری میں جانب مغرب دفن ہوئے۔^{۲۶} آپ کے صاحب زادے محی الدین خاں ذوق نے تاریخ کہی:

زیں جہاں باد سفر بست ہوئے وارثاً
روز شنبہ دہم از شہر جادوی الاولی
۱۲۶۰ھ

الحق ان قبوریں قدوۃ خاصانِ خدا
گفت سال و قائلش بہ صد آلامِ نبشت
ست ۱۹۰۹ء

قاضی علیہم السلام خاں

خلف سوم قاضی القضاۃ نجم الدین، اپنے عہد کے جید عالم تھے، کتب درسیہ کی تکمیل اپنے والد ماجد، مولانا عبدالواحد خیر آبادی، مولوی فضل اللہ نیوتنی اور ملا عماد الدین کبکنی سے کی۔ کچھ عرصہ عدالت میں مفتی رہے، پھر قاضی مقرر ہو گئے، جس وقت قضا کا محکمہ تخریف میں آیا تو دیانت داری، ذہانت و ذکاوت، قوت استدلال کامل اور حُسن کارکردگی کے صلے میں صدر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ بیشتر وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔ ۱۷۵۷ھ ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۲ء) کو کوری میں وفات پائی اور اپنے بھائی مفتی حکیم الدین خاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔^{۲۶}

مفتی خلیل الدین خاں بہادر سیف شاہ اووہ

یہ قاضی نجم الدین کے چوتھے بیٹے تھے۔ ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) کو کوری میں پیدا ہوئے۔ بدوشعوری سے بہت ذہین و طباع تھے۔ کچھ درسی کتابیں اپنے والد ماجد سے اور متوسطات اور انتہائی کتابیں مولوی روشن علی جون پوری سے پڑھیں۔ اپنے والد کے ہمراہ کلکتے بھی رہے۔

قاضی نجم الدین نے فتاویٰ عالمگیری کی کتاب الجنایات والجرائم کی شرح گورنر جنرل کی فرمائش پر مرتب کی تو بیٹے (مفتی خلیل الدین خاں) نے ممبر کونسل مسٹر ہانگٹن کی فرمائش پر جو قاضی نجم الدین خاں کا علوم عربیہ میں شاگرد تھا، درمختار کے باب التعزیرات کی

۲۶ سفرنامہ لندن، ص ۳۷۲۔ تذکرہ مشاہیر کوری، ص ۱۳۲

۲۶ العنا، ص ۲۷۳۔ ایضاً ص ۹ - ۲۸۷

شرح فارسی میں لکھی۔ باب بیٹے کی یہ دونوں شرحیں گورنر جنرل کے حکم سے طبع ہوئیں۔
 مفتی خلیل الدین خاں کو عربی کی نثر نگاری میں بڑا ملکہ تھا۔ علوم حکمت و ریاضی اور
 ہیئت و فلکیات کے ماہر تھے۔ حکام اعلیٰ نے ان کو ٹھہر کر ضلع کانپور میں عہدہ قضا
 پر متمکن کروایا تھا۔ نہایت ذہین اور لائق تھے۔ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) کو اڑتیس سال کی عمر
 میں فازی الدین حیدر (۱۸۱۴ تا ۱۸۲۷ء) کے عہد میں پانچ ہزار روپے ماہوار پر سلطنتِ اودھ
 کے عہدہ سفارت سے سرفراز ہوئے مفتی ممدوح نے بہت سے رفاہ عامہ کے کام
 کیے، تقویٰ و زہد کی نعمت سے بھی متمتع تھے تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے،
 ان کی تصانیف درج ذیل ہیں :-

- ۱۔ شرح باب التعزیرات دَرِ مَخْتَار: فارسی
- ۲۔ رسالہ فی تحقیق مرضِ هیضہ: عربی
- ۳۔ مرآة الاقبا لعیو: علم ہیئت کے قواعد سے متعلق غازی الدین حیدر کی
 فرمائش پر فارسی میں تحریر کی۔
- ۴۔ رسالہ در بیان جغرافیہ طرق و شوارع احاطہ اودھ: فارسی۔
- ۵۔ رسالہ طول البلد و عرض البلد و غایۃ النهار:
- مفتی خلیل الدین خاں نے ۱۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) کو اٹھبیس
 برس کی عمر میں کاکوری میں وفات پائی اور خالقانہ کاظمیہ کے قریب اپنے باغ میں
 مدفون ہوئے۔

تاریخ وفات مولوی محی الدین خاں ذوق نے ان اشعار سے نکالی۔
 نغان کا مروڑ مولانا خلیل الدین ذوقا نہادہ داغ حسرت بردل آں عم جلیل ما
 بسال جلت آں خاند منزل زور تم کلکم بلے گلپیں زانوار جنباں آمد خلیل ما
 زفاضی القضاة نجم الدین علی خاں کاکوری کے حیات و سوانح کی ترتیب و تسوید

کے سلسلے میں زیادہ استفادہ جناب مسعود الزورعلوی کا کو روی کے مضمون سے کیا گیا ہے جو
جولائی ۱۹۸۳ء کے "المعارف" (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔

۱۱۔ مولانا نصر اللہ مارہروی

مولانا نصر اللہ بن ہدایت اللہ بن محمد مارہروی فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے
ماہرین میں سے تھے۔ کنوہ برادری سے تعلق رکھتے تھے اور حنفی المسک تھے۔
تیرھویں صدی ہجری کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔

نصر اللہ کی جائے ولادت مارہرہ (صوبہ لوئی) ہے۔ وہیں انہوں نے تربیت کی
منزلیں طے کیں۔ کچھ بڑے ہوتے تو مولوی محمد باقر اور مولوی محمد نجابت مشرقی سے
حصولِ علم کا آغاز کیا اور درسیات کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید
آل محمد حسینی مارہروی سے اخذِ طریقت کیا۔ سید آل محمد اپنے عہد کے بہت بڑے
عالم اور صوفی تھے۔ ۱۰۷۱ھ ربيع الاول ۱۲۳۵ھ کو فوت ہوئے۔ ان کی وفات
کے بعد ان کے بیٹے سید حمزہ نے باپ کی جگہ تصوف و طریقت کی مسند سنبھالی،
یہ بھی تدین و تقویٰ میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ مارہرہ اور اس کے قرب و جوار
میں باپ بیٹا دونوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ صاحبِ ترجمہ
مولانا نصر اللہ نے پہلے تو سید آل محمد مارہروی سے اکتسابِ فیض کیا، پھر ان کی
وفات کے بعد ان کے فرزند گرامی سید حمزہ کی صحبت اختیار کی اور عمر بھر ان سے
والبتہ رہے۔ درس و افادہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع
تھا۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کی تمام مروجہ کتابیں ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے اور
طلباء ان کے طرزِ تعلیم سے بہت متاثر تھے۔

مولانا نصر اللہ مارہروی نے ۱۰۷۱ھ۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۹۵ھ کو اپنے آبائی شہر
"مارہرہ" میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

۸۰ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰

۱۱۲۔ مولانا نصر اللہ خوجوی

مولانا نصر اللہ خاں بن محمد سمرخویشکی خوجوی اپنے وقت کے عالم کبیر اور شیخ کامل تھے۔ افاغنے کے مشہور قبیلے خویشگی سے تعلق رکھتے تھے اور فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ۱۲۲۶ھ کو خوجہ راپنی میں پیدا ہوئے۔ مولانا احمد علی عباسی چریاکوٹی اور دیگر علمائے عصر سے حصول علم کیا۔ حکیم منصور علی نجیب آبادی سے علم طب پڑھا اور شیخ عبدالعلیم لوہاری سے اخذ طریقت کیا۔ جب تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے اور کامل استعداد حاصل ہو گئی تو انگریزی حکومت سے تقریب پیدا کیا اور ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ یہ ایک بڑا عہدہ تھا جس پر انھیں فائز کیا گیا۔ کافی عرصہ یہ منصب ان کے سپرد رہا۔

اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ حیدرآباد دکن (چلے گئے وہاں ان کی نہایت پذیرائی ہوئی اور ریاست حیدرآباد کے شمالی علاقوں کے منصب قضا پر متمکن کیے گئے۔ بعد ازاں مغربی علاقوں کے قاضی بھی انھیں مقرر کر دیا گیا۔ ریاست حیدرآباد میں ان کو بہت اعزاز حاصل ہوا اور بہت سی مراعات سے سرفراز ہوئے۔

مولانا نصر اللہ خاں خوجوی جلیل القدر عالم اور بہت سے مروجہ علوم و فنون میں ماہر تھے اور سرکاری ذمہ داریوں کے باوجود درس و افادہ میں انتہائی دلچسپی رکھتے تھے، ان سے علما و طلباء کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔

ان میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے انھوں نے جو تحریری خدمت انجام دی، وہ مندرجہ تحت کتابوں کی صورت میں محفوظ ہے؛

- ۱۔ ارشاد البلید فی اثبات التقلید۔
- ۲۔ شرح خلاصہ کیدانی: یہ مسائل فقہ میں ہے اور فارسی میں ہے۔
- ۳۔ شرح رباعیات یوسفی: یہ علم طب کے بارے میں ہے۔
- ۴۔ تاریخ دکن۔

علاوہ ازیں اور بھی کئی کتب و رسائل ان سے یادگار ہیں۔
اس عالم کبیر اور فقیہ نامدار نے ۱۲۹۹ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔

۱۱۳۔ سید نصیر الدین حسینی برہان پوری

ہندوستان کا شہر برہان پور کسی زمانے میں علم کا گہوارہ اور علما کا مرکز تھا۔ ان کے تراجم فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر بیان ہو چکے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے برہان پوری علما و فقہاء میں ایک بزرگ سید نصیر الدین گزرے ہیں جن کا لقب عبید اللہ تھا۔ یہ سید جلال الدین حسینی برہان پوری کے بیٹے تھے جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے اور اپنے علاقے کے علمائے اکابر میں گردانے جاتے تھے۔ نہایت زاہد و عارف شخص تھے اور ”اللہ والے صاحب“ کے عرف سے معروف تھے۔

سید نصیر الدین حسینی برہان پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی کچھ بڑے ہوئے تو اپنے والد گرامی سید جلال الدین حسینی کے حلقہ درس میں شمولیت کی اور علوم مروجہ اور فنون متداولہ سے بہرہ مند ہوئے۔ والد کے علاوہ بعض دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا اور فقہ و حدیث اور دوسرے علوم میں مہارت حاصل کی۔ فقہی مسک کے اعتبار سے حنفی تھے اور فروعی اختلافی مسائل میں نہایت متشدد تھے۔ اس زمانے میں ”وہابیت“ کا بہت چرچا تھا اور انگریزی حکومت نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ”وہابی“ اور ”باغی“ کو مترادف قرار دے دیا تھا۔ جس کو وہابی کہا جاتا، اسے انگریز مخالف اور باغی سمجھا لیا جاتا تھا۔ بہت سے علمائے وقت بھی وہابیوں کے مخالف ہو گئے تھے اور ان کے فقہی اور مسکی رجحانات کو شدت سے بد تنقید ٹھہرانے لگے تھے۔ سید نصیر الدین برہان پوری کا شمار بھی انہی حضراتِ علما میں ہوتا تھا جو تحریر و تقریر میں

۲۹ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۰، ۵۰۱

وہا بیت کی سخت الفاظ میں مخالفت کرتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے دو کے نامور فقیہ اور ممتاز عالم تھے۔

سید نصیر الدین تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں:

- ۱۔ ذریعة الاستشفاع فی سیر سید المطاع۔
- ۲۔ الصائقة الرابیه علی فرقة الوهابية الكذابه۔
- ۳۔ روضة الريحان فی فضائل رمضان۔
- ۴۔ مستوفی الحقوق فی ذم العقوق۔
- ۵۔ ایضاع الارتداد۔
- ۶۔ ساطع الانوار من کلام سید الامراء۔
- ۷۔ التییر فی مہمات التفسیر۔
- ۸۔ برهان الہدی فی تفسیر الرحمن علی العرش استوی۔
- ۹۔ لباب النعائج فی احکام الذبائح۔
- ۱۰۔ البراہین الساطعة فی اثبات مذهب اہل السنة اللامعة۔
- ۱۱۔ تنبیہ الاغنیاء فی فضائل سید الاصفیاء۔
- ۱۲۔ کشف المغضلات فی ذکر لساء المحرمات۔
- ۱۳۔ ترفیہ المجاہدین وترغیم المعاندین۔
- ۱۴۔ هل من مزید فی جواز اللعن علی یزید۔
- ۱۵۔ الیکیات فی اخبار الشہداء بالطف۔
- ۱۶۔ لطائف التہذیب۔
- ۱۷۔ معیار الافراس۔
- ۱۸۔ شعب الامیان۔
- ۱۹۔ رسالہ فی تعداد الایات والحروف والسور والسجودات فی القرآن الکریم۔

۲۰۔ رسالہ عالیہ۔

۲۱۔ تکیلۃ منافع المسلمین۔

آخر عمر میں عربین شریفین گئے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو دنات پاگئے۔ یہ ۱۵۔ محرم ۱۲۹۳ھ کا واقعہ ہے۔

تذکرہ علمائے ہند میں مرقوم ہے کہ ۱۲۹۲ھ کو برہان پور میں انتقال ہوا۔

۱۱۴۔ سید نصیر الدین دہلوی

جو علمائے کرام اور فقہائے عظام امیر المجاہدین سید احمد شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت مجاہدین سے وابستہ ہوئے اور باقاعدہ میدانِ جہاد میں نکلے ان میں مولانا سید نصیر الدین دہلوی متعدد وجوہ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ دھبیال کی طرف سے حضرت سید ناصر الدین حسینی سوئی پتی کی اولاد سے تھے اور ننھیال کی جانب سے حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے نواسے تھے۔ آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی اور وہیں پلے بڑھے۔

ابتدا میں تحصیل علم سے بے اعتنائی

ان کے حالات میں یہ عجیب بات مرقوم ہے کہ دہلی میں اپنے ننھیال میں پرورش پائی اور وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں، جہاں علم کے دریا بہ رہے تھے فضیلت کے چشمے ابل رہے تھے اور ہندوستان کے طول و عرض سے آکر لوگ اس سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ لیکن نصیر الدین کو اپنی عمر کے دورِ اول میں اس سے دلچسپی نہ تھی اور حصولِ علم کی طرف اعتناء نہ تھا۔ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کا غلغلہ درس بلند تھا اور بے شمار علما و طلبا ان سے تحصیل علم میں مشغول تھے، مگر نصیر الدین اس دولت سے بے بہرہ تھے۔ اسی اثنا میں والدہ نے شاہ محمد اسحاق سے ان کی صاحبزادی

تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۹، ۲۴۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۱، ص ۵۰۲۔

کے رشتے کے لیے درخواست کی مگر علوم مردوجہ سے عدم التفات کی بنا پر درخواست منظور نہ ہوئی۔

حصولِ علم کا شوق

درخواست کی عدم منظوری نے نصیر الدین کے قلب و ضمیر کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ انتہائی ذوق و شوق سے تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے۔ پھر اس قدر محنت و توجہ سے پڑھنا شروع کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں حدیث و فقہ اور دیگر علوم و فنون کی تمام کتابیں ختم کر لیں اور اپنے عہد کے جلیل القدر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔

حصولِ علم کی غرض سے وہ پورب کے متعدد شہروں میں گئے اور وہاں کے مشاہیر اساتذہ کے حضور زائونے شاگردی تہ کیا۔ بلکنے کا عزم بھی کیا اور وہاں کے بعض نامور علماء سے تحصیل کی۔ جس زمانے میں سید احمد شہید قصبہ جج کے لیے کلکتے تشریف لے گئے تھے۔ سید نصیر الدین اس زمانے میں وہیں تھے اور طالبِ علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔

جب فارغ التحصیل ہو گئے اور علوم متداولہ میں کمال حاصل کر لیا تو شاہ محمد اسحاق نے اپنی صاحبِ زادی کا نکاح ان سے کر دیا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ ۱۲۳۰ھ میں شاہ اسحاق وعظ فرماتے اور جہاد کے لیے چندے کی اپیل کرتے تو سید نصیر الدین بدر سے کے دروازے میں کھڑے ہو کر مجاہدین کے لیے فراہمیِ ذرائع کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس کے بعد حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ جہاد کے لیے انھوں نے خود ہی سرحد پار جانے کا عزم کر لیا۔

مجاہدین کی تنظیم

سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے واقعہ شہادت کے بعد مجاہدین پر کسی عجیب و غریب درد آئے اور ان کے سرشتہ نظم کے ٹوٹ جانے کا خطرہ بھی پیدا ہوا۔ لیکن قدرتِ الہی سے پھر ایسے حالات ابھر آئے جن سے خطرات کے بادل چھٹ جاتے اور مالوسی کی فضا ختم ہو جاتی۔ لیکن اب معاملہ بالکل دگرگوں ہو گیا تھا اور اس پر عظمت

جماعت کا محض ایک ہلکا سا نشان باقی رہ گیا تھا۔ حالات نہایت تکلیف دہ اور انتہائی مایوس کن تھے۔ یاس و قنوط اور چاروں طرف پھیلی ہوئی افسردگی کے اس عالم میں صاحبِ ترجمہ مولانا سید نصیر الدین دہلوی کا جوش و جذبہ حرکت میں آیا اور انہوں نے کمر ہمت باندھی اور امیر المجاہدین سید احمد شہید کی طرح ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ لوگوں کو اپنے اندازِ خاص سے دعوتِ جہاد دی اور تھوڑی مدت میں ایک ایسی جماعت تیار کر لی جس کے تمام ارکان اس بنیادی فرض کی انجام دہی کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہتے۔

اختلاف سے نفرت

اجیانے دین، رو بدعات، دعوتِ اسلام اور اشاعتِ توحیدان کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل و معاملات کے متعلق مسلمانوں میں جھگڑے اور نزاع کی جو صورت پیدا ہو جاتی ہے، اس سے انہیں شدید نفرت تھی۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے باہمی اختلافات ختم کر دیں اور اسلام کے اصول و اساسیات پر کامل طور سے متحد ہو جائیں۔ ایک مرتبہ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی کہ کسی نے کہا، مذہبی معاملات میں اختلاف کوئی نئی بات نہیں ہے، صحابہ کے زمانے میں بھی اختلاف موجود تھا۔ سید نصیر الدین نے اس کا نہایت شاندار جواب دیا۔ فرمایا ہمیں اکابر کی لغزشوں پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلاشبہ صحابہ میں یہ تقاضائے بشریت اختلاف کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ہمیں ان کے مکارم و محاسن کی پیروی کرنی چاہیے۔ ان کے اختلافات کو تلاش کرنا اور پھر ان کو بنیاد بنا کر اپنے لیے اختلاف کی گنجائش پیدا کرنا ہمارا کام نہیں ہونا چاہیے۔

امیر دوست محمد خاں سے تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ

سید نصیر الدین عالی ہمت، آدمی تھے، وہ بہت بلند مقاصد رکھتے تھے، دور رس نگاہ کے مالک، نہایت مستعد اور صاف ذہن تھے۔ طبیعت میں سلجھاؤ اور سوچ بچاؤ کے پیمانوں میں بڑی وسعت تھی۔ پرانے جھگڑوں میں الجھ کر وقت ضائع کرنا اور

احوال و ظروف سے چشم پوشی کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا! انہیں معلوم تھا کہ آزاد قبائل کس فطرت کے مالک ہیں اور ان کے کن کن سرداروں نے سید احمد شہید کے زمانے میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ وہ پرانی رنجشوں کو بھلا دینا چاہتے تھے اور نئے حالات کی روشنی میں آگے قدم بڑھانے کے خواہاں تھے۔

بعض وجوہ سے والی افغانستان دوست محمد خاں بھی مجاہدین کی حمایت اور ہمدردی سے دست کش ہو گیا تھا۔ لیکن اب وقت نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ سید نصیر الدین اس سے مراسم پیدا کرنے اور تعلقات استوار کرنے کے متمنی تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امیر دوست محمد خاں ایک طرف سکھوں سے برسرِ بیچارہ تھا تو دوسری طرف انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا، اور یہ دونوں طاقتیں مجاہدین کی حریف تھیں اور انہی سے ان کا مقابلہ تھا۔ یعنی جو کام دوست محمد خاں کر رہا تھا، وہی مجاہدین کا نقطہ نظر تھا۔ اس لیے سید نصیر الدین کی شدید خواہش تھی کہ موجودہ حالات میں امیر دوست محمد خاں سے حلیفانہ اور دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں تاکہ دونوں کے مشترکہ دشمنوں اور حریفوں کا باہمی تعاون سے مقابلہ کیا جاسکے۔

جب سید نصیر الدین یہ منصوبہ بنا رہے تھے اس زمانے میں وہ دہلی میں تھے اور زیادہ تر دہلی کی اکبری مسجد میں ان کے شب و روز گزرتے تھے۔ یہ وہ مسجد ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزند ان گرامی شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث کے درس و تدریس کے سلسلے جاری رہے تھے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید نے تنظیم جہاد کا کام اسی مسجد میں بیٹھ کر شروع کیا تھا۔

سید نصیر الدین نے بھی اسی مسجد میں بیٹھ کر اپنے رفقاء سے خاص سے مشورے کیے اور امیر دوست محمد خاں کے پاس سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے تمام انتظامات مکمل کر لیے اور ابو احمد علی اور تید ابراہیم سواتی کے نام اس سفارت کے لیے تجویز ہوئے لیکن اچانک بعض ایسے ناخوش گوار واقعات پیش آ گئے کہ اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا، اور امیر دوست محمد خاں کے پاس سفارت نہ بھیجی جاسکی۔ اگرچہ اس وقت سفارت

کی تجویز معروض عمل میں نہ آسکی، تاہم یہ واقعہ ہے کہ سید نصیر الدین میدانِ جہاد میں اتر آنے کے بعد امیر دوست محمد خاں کی دفاعی کوششوں میں ہمیشہ اس کے معاون و مددگار رہے۔

قصدِ ہجرت

جیسا کہ پہلے گزر چکا، سید نصیر الدین نہایت باہمت اور عزم و ارادے کے پختے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے آزاد علاقے میں جانے اور وہاں از سر نو سلسلہ جہاد شروع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ ملک کے ان حصوں میں دورے کیے جائیں جہاں زیادہ تبلیغ جہاد نہیں ہو سکی تھی، وہاں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جہاد کے لیے آمادہ کیا جائے لیکن یہ وقت طلب کام تھا اور اس میں بہت تاخیر کا اندیشہ تھا، لہذا فیصلہ کیا گیا کہ جو کام جس قدر جلدی ہو سکتا ہے، کیا جائے اور تاخیر سے بچا جائے۔ پھر یہ بات بھی ان کے پیش نظر تھی کہ پہلے سے جو بعض ممتاز نقیب مختلف علاقوں میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان کی مساعی مخلصانہ سے بھی لوگ متاثر ہوں گے اور میدانِ جہاد میں پہنچیں گے۔ مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی حیدرآباد (دکن) میں، مولانا عنایت علی مشرقی بنگال میں، مولانا سید محمد علی رام پوری مدراس میں اور مولانا سید اولاد حسن قنوجی اپنے علاقے میں مشغول دعوتِ جہاد میں اور ان کی کوشش سے مجاہدین کی آمد کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں قائم رہے گا، اور بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ یہ سلسلہ قائم رہا۔

والدہ سے اجازت

سید نصیر الدین کی والدہ مکرمہ زندہ تھیں، سفرِ جہاد سے قبل ان سے اجازت لینا ضروری تھا۔ والد کی تمنا تھی کہ کسی دن ماہِ رمضان میں دہلی کی جامع مسجد (یعنی شاہ جہانی مسجد) میں جا کر نماز ادا کی جائے۔ سعادت مند بیٹے نے رمضان ۱۲۵۰ھ (جنوری ۱۸۳۵ء) میں

ایک رات نماز تراویح کے بعد والدہ کو ساتھ لیا اور جامع مسجد گئے انہوں نے نہایت اطمینان سے نماز پڑھی اور کافی دیر مسجد میں رہیں۔ دعا کی اور بہت خوش ہوئیں۔ اسی دوران بیٹے نے ماں سے عرض کیا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ - (ال عمران : ۹۲)

یعنی تم اس وقت تک نیکی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ جو چیز تمہیں پیاری ہے، وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

یہ آیت پڑھ کر عرض کیا کہ آپ کو میرے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے۔ میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس کا رخصت کر کے مجھے اجازت دیں اور ہماری جدائی پر صبر و شکیب سے کام لیں۔ یہ الفاظ سننے ہی بلند نعت ماں نے نہایت خوشی سے بیٹے کو جہاد پر جانے کی اجازت دے دی اور

یہ مشکل مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔

لمبا سفر اور نہایت مختصر سامان

والدہ کی اجازت کے بعد سفر کی تیاری شروع کر دی۔ وہ بہت لمبے سفر پر جا رہے تھے، مگر سامان سفر اتنا مختصر کہ اسے طوالت سفر سے کوئی ادنیٰ نسبت بھی نہ تھی۔ ایک چھوٹا سا بستر، چند برتن اور ایک کپڑوں کی جوڑی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں :

(۱) قرآن مجید (۲) تفسیر جلالین (۳) سنن ابی داؤد (۴) مشکوٰۃ (۵) جملہ مکتب

اور (۶) حجۃ اللہ البالغہ میں سے کتاب الاحسان

یہ تھا اس جید عالم، ممتاز فقیہ، نامور غازی اور مجاہد کاکل سامان سفر۔

تاریخ روانگی

حادثہ بالاکوٹ سے چار سال بعد، مجاہدین کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ

وہ ۳ — ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ (۲۰ — اپریل ۱۸۳۵ء) کو گھر سے نکلے اور دہلی سے چار میل کے فاصلے پر عرب سرائے میں پہلا پڑاؤ کیا۔ وہاں تین دن اقامت گزیں رہے۔ ۶ — ذی الحجہ کو وہاں سے چلے اور قطب صاحب میں "حوض شمس" کے کنارے "مسجد اولیا" کے متصل قیام کیا۔ ۷ — ذی الحجہ کو مسجد اولیا سے روانہ ہوئے اور راستے میں تھوڑا بہت قیام کرتے ہوئے ریلواری جا پہنچے، وہاں ایک باغ میں ٹھہرے اور عید اضحیٰ کی نماز ادا کی۔ ۱۵ — ذی الحجہ کو ریلواری سے جے پور کا عزم کیا وہاں ابھی پہنچے نہ تھے کہ راستے میں ایک مجاہد سید اسحاق وفات پا گئے اور ان کی میت کو جے پور کے قریب واصل خاں کے باغ میں لے جایا گیا۔ تجہیز و تکفین کے بعد نماز جنازہ سید نصیر الدین نے پڑھائی اور اس موقع پر نہایت پُر اثر تقریر کی۔ گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور راجپوتانے کا انتہائی تکلیف دہ سفر درپیش تھا۔ وہ اس علاقے کے مختلف مقامات ٹونک، اجمیر، جودھ پور اور جیسلمیر سے ہوتے اور قیام کرتے ہوئے سندھ پہنچ گئے۔ راستے کی تفصیلات بہ درجہ غایت عجیب و غریب ہیں، جنہیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

پیرکوٹ میں قیام

سندھ میں انھوں نے جس مقام پر قیام کیا، اس کا نام "پیرکوٹ" ہے۔ یہ وہی پیرکوٹ ہے جسے "پیر جو گوٹھ" کہا جاتا ہے۔ یہ عرصہ دراز سے راشدی سادات کے اس خاندان کا مرکز ہے جو "پیر پگاڑو" کے لقب سے مشہور ہے اور دہتری سے سولہ سترہ میل جنوب میں اور خیر پور سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہلا او اصل پیرکوٹ دریائے سندھ کی خوف ناک لہروں کی زد میں آکر تباہ ہو گیا تھا۔ پھر اس مقام سے پانچ چھ میل دُور مشرق میں موجود پیرکوٹ آباد کیا گیا۔

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں پیر صفت اللہ شاہ راشدی پیرکوٹ کی مسند شد و ہدایت پر متمکن تھے جو نہایت متوزع اور متقی بزرگ تھے۔ سید احمد شہید ان کے ہاں پہنچے تو انھوں نے سید صاحب سے پورے تعاون کا عہد کیا اور پھر اس

عہد کو نبھانے میں ہمیشہ مستعد اور سرگرم رہے۔ سید صاحب کی شہادت سے چار سال بعد ان کا انتقال ہوا۔

حُروں کی تحریک

پیر صبغت اللہ شاہ راشدی نے اپنے ارادت مندوں اور عقیدت کیشوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کرنے کی از حد کوشش کی اور اس میں کامیاب رہے۔ وہ متبع سنت بزرگ تھے اور غیر شرعی رسوم و رواج کے شدید مخالف تھے۔ یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ وہ مسند نشین ہوتے تو ان کے بعض قرابت دار مخالفت پر اتر آتے اور ان پر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اصحاب ارادت نے مرشد کی حفاظت و مدافعت کے لیے ایک تنظیم قائم کی جو حُروں کی جماعت کے نام شہرت پذیر ہوئی۔

پیر صاحب مدوح نے یہ منصب نبایا تھا کہ حُروں کے اس نظام کو اس طرح پھیلا یا اور وسیع کیا جائے کہ علاقہ سندھ اجنبی اقتدار اور غیر ملکی طاقت کے تسلط سے قطعی طور پر محفوظ ہو جائے اور پھر اس نواح میں خالص اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کی جائے۔ سید احمد شہید جب جہاد کے لیے سرحد جاتے ہوئے سندھ پہنچے تو پیر صبغت اللہ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور اشتراک مقاصد کی بنا پر پیر صاحب نے سید صاحب سے کامل تعاون کا فیصلہ کر لیا، لیکن قدرت الہی کے فیصلے کچھ اور تھے۔

سید احمد شہید اور پیر صبغت اللہ کے درمیان جو گفت و شنید ہوئی، اس سے سید صاحب اس درجے اثر پذیر ہوئے کہ اپنے اہل و عیال کے قیام و سکونت کے لیے پیر کوٹ ہی کا انتخاب فرمایا۔ حالانکہ اس سے قبل والی ٹونک نواب امیر خاں اور بعض امیران سندھ بھی اپنے ہاں ان کے قیام کے لیے مناسب انتظام کرنے پر بول چال آمادہ تھے، لیکن سید صاحب کے قلب و ذہن پر پیر صاحب کے دینی جذبات و عواطف کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے اسی مقام کو ترجیح دی۔ واقعہ بالاکوٹ کے

بعد بھی کئی سال ان کے اہل و عیال پیرکوٹ میں مقیم رہے۔ یہی وجہ تھی کہ سید نصیر الدین دہلوی نے سندھ میں پیرکوٹ کو اپنی پہلی منزل قرار دیا۔

پیرکوٹ کا کتب خانہ

اس زمانے میں پیرکوٹ کا کتب خانہ جو پیر صیغت اللہ شاہ کی تحویل میں تھا، نہایت نادر و نایاب کتابوں پر مشتمل تھا۔ افسوس ہے پیر صیغت اللہ ثانی کی گرفتاری اور سزائے موت کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں اس کو شدید نقصان پہنچا۔ سید نصیر الدین دہلوی نے یہ کتب خانہ دیکھا تھا۔ ان کے بقول اس کتب خانے میں قرآن مجید کا ایک ایسا مترجم نسخہ تھا، جس کے حاشیے پر چار تفسیریں تمام کمال درجہ تھیں۔ اول تفسیر نیشاپوری، دوم بیضاوی، سوم مدارک، چہارم کشاف۔ علاوہ ازیں تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر نیشاپوری، تفسیر مقدسی، تفسیر قرطبی، تفسیر قشیری، درمختصر وغیرہ بہت سی تفسیریں الگ الگ اس کتب خانے کی زینت تھیں۔

کتب حدیث میں صحاح ستہ کے علاوہ مشکوٰۃ، سنن بیہقی، روضۃ الصالحین اس میں محفوظ تھیں۔

شروح حدیث میں سے فتح الباری، قسطلانی، عینی اور کرمانی سے یہ کتب خانہ مزین تھا۔

ذخیرۃ فقہ میں سے زلعی مکمل، بحر الرائق، فتح القدر، جموی شرح الاشبہ والنظائر موجود تھیں۔

یہ وہ کتابیں تھیں جو صرف مذہبیات سے متعلق تھیں۔ تاریخ و سوانح اور ادب و شعر کی بھی بہت سی کتابیں پائی جاتی تھیں۔ فارسی دیوانوں کے اس میں تقریباً ایک سو مطلقاً نسخے تھے۔ مختلف تفسیروں کی پینسٹہ جلدیں تھیں۔ "شامنامہ" کے پانچ نسخے نہایت عمدہ تصویروں سے مزین تھے۔ احیاء علوم الدین اور فتوحات مکبہ کے کئی کئی نسخے موجود تھے۔

بعد میں سندھ کا پیراشدی خاندان اختلافِ مسالک کی بنا پر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک کو پیر گھاڑو کے نام سے موسوم کیا گیا اور ایک کو پیر جھنڈا کے نام سے۔ اپر آن جھنڈا کے دو کتب خانے سندھ کے بہت بڑے کتب خانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ایک پیر محرب اللہ راشدی کا کتب خانہ اور ایک ان کے چھوٹے بھائی پیر بدیع الدین راشدی کا۔ ان دونوں کتب خانوں میں مخطوطات بھی کثیر تعداد میں ہیں اور مطبوعہ کتابیں بھی۔ یہ دونوں بھائی خود بھی جلیل القدر عالم ہیں اور علما کے انتہائی قدردان بھی۔ اہل علم بتاتے ہیں کہ ان کے کتب خانوں میں ہر موضوع کی کتابیں موجود ہیں۔ ان سطور کا راقم اکتوبر ۱۹۸۱ء میں وہاں گیا تھا۔ فقط ان حضرات سے ملنا اور ان کے کتب خانے دیکھنا مقصود تھا۔ پہلے نیر سعید آباد گیا جہاں پیر بدیع الدین اقامت گزیں ہیں، معلوم ہوا کہ وہ حیدرآباد تشریف لے گئے ہیں، وہاں سے کراچی جائیں گے اور کئی دن بعد واپسی ہوگی۔ وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ان کے بڑے بھائی پیر محبت اللہ صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ بھی موجود نہ تھے اور واپسی کا بھی ایک دو دن میں امکان نہ تھا۔ سخت ذمہنی کوفت ہوئی اور میں کسی کو کچھ بتائے اور رُکے بغیر واپس لاہور آ گیا۔

سلسلہ دعوت و تبلیغ

سندھ کے موضع کھڑہ کے پیر بھی اس زمانے میں مشہور تھے، جن میں مخدوم عبدالخالق کو بالخصوص اس نواح میں قدر و منزلت حاصل تھی۔ اسی طرح کھڑہ سے صرف ایک کوس کے فاصلے پر موضع گبٹ تھا، وہاں کے سید ابراہیم شاہ کی بڑی شہرت تھی، یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد سے تھے۔ سید نصیر الدین کے ان دونوں سے مخصوص مراسم قائم ہو گئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی بہت تکمیل کرتے تھے۔ سید نصیر الدین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سلسلہ دعوت و تبلیغ میں ہر وقت سرگرم رہتے اور خلاف سنت کوئی بات برداشت نہ کرتے۔ مخاطب

اگرچہ کتنا بڑا آدمی ہوتا اس کی انھیں ذرہ پروانہ ہوتی اور دلائل شرعیہ سے اپنی بات اس کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے۔ اس سلسلے کے بہت سے واقعات میں دو واقعے ملاحظہ ہوں :-

خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ مخدوم عبدالخالق کے ہاں گئے، دیکھا کہ عام لوگوں کی طرح نیز ذکر و شغل میں اٹہاک کے باعث مخدوم صاحب نماز تاخیر سے پڑھتے ہیں۔ یہ بات انھیں ناگوار گزری اور مشکوٰۃ کی احادیث اور فقہ کی دو مختار کی روایات ان کے سامنے پیش کیں اور کہا کہ نماز اول وقت میں پڑھنی چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ مخدوم صاحب نے ان کی بات مان لی اور نماز میں تاخیر ترک کر دی۔

سید ابراہیم شاہ، ختم قادیہ میں ایک تسبیح "یا شیخ عبدالقادر شیباً لعلہ" کی بھی پڑھتے تھے۔ سید نصیر الدین نے ان کے خلیفوں کو جو اچھے خاصے عالم تھے، ایسے دلنشین طریقے سے مسئلہ سمجھایا کہ انھوں نے اس کے ممنوع ہونے کا اقرار کر لیا۔ علاوہ ازیں سید ابراہیم شاہ نماز بھی تاخیر سے پڑھتے تھے، مخدوم عبدالخالق کی طرح انھیں بھی اول وقت میں نماز ادا کرنے کی تاکید کی اور اس کی فضیلت بیان کی۔ وہ یہ بات بھی مان گئے اور اول وقت میں نماز پڑھنے لگے۔

سندھ کے لوگ بہت نیک طبیعت اور صحیح فطرت تھے۔ قرآن و حدیث کی رو سے کوئی مسئلہ بیان کیا جاتا تو فوراً مان لیتے اور اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے۔ اس ضمن میں سندھی عوام کی نفسیات اور وہاں کے پیروں کے طرز عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے سید نصیر الدین لکھتے ہیں :-

مردمانِ این جا بسیار سلیم الطبع اند و ہرگز ہرگز، مقابلہ شریعت نمی کنند، گو کسے مخالف طبیعت ایشان بگوید، مگر مردان حق گوایں جانیستند و پیرانِ این جارا جزا ہتمام گرفتن بیعت مطلبیہ و گریخت۔ بعضے از پیران حمیت اسلامی ہم دارند، مگر ہتمام در امر بالمعروف و نہی کنند۔

۱۱۔ اخبار مولوی سید نصیر الدین (مخطوطہ) ص ۱۱۔

”یہاں کے لوگ بہت سلیم الطبع ہیں، شریعت کی مخالفت قطعاً نہیں کرتے، اگرچہ کوئی شخص ان کی مرضی کے خلاف بات کہے۔ البتہ یہاں حق گو آدمی نہیں ہیں۔ یہاں کے پیروں کو بیعت لینے کے سوا کوئی غرض نہیں۔ بے شک بعض پیروں میں حمیتِ اسلامی بھی ہے، مگر وہ امر بالمعروف کا اہتمام نہیں کرتے۔“

سید نصیر الدین سندھ کے بہت سے مقامات میں گئے اور وہاں کے مختلف میروں اور پیروں سے ملے۔ رانی پور، ہالہ، مٹاری، نوشہرو، خیر پور، حیدرآباد وغیرہ متعدد بلاؤں و قصبوں اور دیہات کے چکر لگاتے اور وہاں کے بڑے لوگوں سے ملاقات کی۔ وہ دراصل سندھ کے کسی علاقے میں بیٹھ کر سکھوں سے جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی اور وہ آہستہ آہستہ سندھ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ بھی سندھ کے امیروں اور حاکموں نے کچھ معاہدے کر رکھے تھے جو مستقبل میں ان کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئے۔ سید نصیر الدین کا ارادہ یہ تھا کہ سندھ کے والی، حکمران، پیر اور سرکردہ لوگ ان کے ساتھ تعاون کریں تو مسلمانوں کی مخالف طاقتوں — انگریزوں اور سکھوں — سے جہاد کیا جائے اور ان کے قدم سندھ کی طرف بڑھنے سے روکے جائیں۔ لیکن سچی لیا کے باوجود وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مزاریلوں کے علاقے میں

سید نصیر الدین اور ان کے ساتھی فقط جہاد فی سبیل اللہ کا عزم لے کر گھر سے نکلے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی اور حکمران رنجیت سنگھ تھا جو سندھ پر بھی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ انگریز ہندوستان پر عملاً قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ کچھ معاہدے کر رکھے تھے، وہ بھی سندھ پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے مزاریل قبیلے کے لوگ سکھوں کے بھی شدید مخالف تھے اور انگریزوں کے بھی۔ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نے چونکہ سکھوں سے لڑتے ہوئے درجہ شہادت پایا تھا اور بالا کوٹ میں ان کے اور بھی بہت سے ساتھی شہید ہو چکے

تھے، اس لیے قدرتی طور پر مجاہدین کو سکھوں سے نفرت تھی۔ انگریز سکھوں کے حامی تھے، اس بنا پر وہ ان کے بھی دشمن تھے۔ ان حالات میں انہوں نے مزاروں کی طرف دستِ تعاون بڑھایا جو کہ ان کے دونوں دشمنوں — سکھوں اور انگریزوں — کے مخالف تھے۔ مزاروں نے بھی ان کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور اشتراکِ مقاصد نے مزاروں اور مجاہدین کو اتحاد کی سلک میں پرو دیا۔

مزاروں کا علاقہ خیر پور سندھ کے حدود سے متصل ضلع ڈیرہ غازی خان کے جنوبی حصے پر محیط ہے، جہاں سید نصیر الدین اور ان کے رفقاء نے قیام کیا۔

یہاں ایک لطیفہ بھی سنتے جاتے۔ سید نصیر الدین دہلوی اور وہ مجاہدین جو دہلی اور ہندوستان کے بعض علاقوں سے ہجرت کر کے بغرضِ جہاد یہاں آئے تھے، وہ بچے موجد اور متبعین کتاب و سنت تھے، غیر شرعی رسوم سے انہیں سخت نفرت تھی، بدعات و محدثات کے شدید مخالف تھے اور امورِ شریک سے کہوں دور بھاگتے تھے۔ یہ لوگ ”وہابی“ مشہور تھے اور ان کی تحریک کو ”تحریک وہابی“ کہا جاتا تھا۔ سید نصیر الدین کو تو معلوم تھا کہ ”مزاری“ ایک قبیلے کا نام ہے، لیکن ان کے جن رفقاء کو اس کا علم نہ تھا، وہ لفظ ”مزاری“ پر بدکے، انہیں شبہ ہوا کہ یہ قبر پرست اور مزاروں کو پوجنے والے لوگ ہیں، ان سے رسم و راہ کیوں پیدا کی جائے۔ پھر جب ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو پتا چلا کہ سید نصیر الدین نے مزاروں کے ہاں سگونت اختیار کر لی ہے تو انہیں بھی اس سے پریشانی ہوئی۔ سید نصیر الدین کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے رفقاء کی غلط فہمی بھی دور کی اور ہندوستان کے حضرات کو بھی خطوط کے ذریعے اصل معاملے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مزاری ایک قوم کا نام ہے، ہزار پستی سے اسے کوئی تعلق نہیں، یہ داسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ زبان کے پگے اور عہد کے سچے ہیں۔ ایک خط میں جو ہندوستان کے ایک شخص کے نام بھیجا، لکھتے ہیں کہ کرم خاں مزاری نے اقرار نامہ لکھ کر دے دیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کریں گے اور شریکِ جہاد ہوں گے۔ یہ خط فارسی میں ہے۔ اس میں مزاروں کے عہد و پیمان

کے بارے میں سید نصیر الدین لکھتے ہیں:-

ہر کہ درخانۂ ایشان برو دنا جان در تن ایشان ہست، رفاقتِ اومی کنند و در
العہد و صادق الميثاق بدون ایشان مشہور است۔ چنانچہ بعضے اقوام ایشان در میان خود
دشمنی دارند و جنگ در میان خود می کنند۔ ہر گاہ کہ عدلہ کنند کہ دو سال صلح ہست ہرگز
در میان خود غدر نمی کنند۔^{۳۵}

یعنی جو شخص ان کے گھر چلا جائے، جب تک جان بدن میں رہے، یہ اس کا ساتھ دیتے
ہیں اور ان کا وعدے پر قائم رہنا اور با وفا ہونا مشہور ہے۔ چنانچہ ان کے مختلف گروہوں
میں آپس کی دشمنی کی وجہ سے لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، مگر جب عہد کر لیتے ہیں کہ (مثلاً) دو
سال کے لیے صلح ہے تو اس کی قطعاً خلاف ورزی نہیں کرتے۔

مزاری دراصل بلوچوں کی ایک مشہور اور بڑی قوم ہے۔ یہ لوگ سترھویں صدی
عیسوی کے آخری یا اٹھارھویں صدی کے ابتدائی دور میں اپنے پہلے ٹھکانوں سے
اٹھ کر نئی جہاںوں کی تلاش میں نکلے۔ اس زمانے میں دریائے سندھ کے دونوں
کناروں پر ناہر "قوم کا قبضہ تھا۔ ناہر دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے جو آپس میں
لڑتے رہتے تھے۔ ایک گروہ کا صدر مقام "کن" اور دوسرے کا "بھاگر" تھا۔
مزاریوں نے ایک لڑائی میں ناہر قوم کے ایک گروہ کی مدد کی اور اس کے بدلے
میں وہ علاقہ اس سے لے لیا جو ضلع ڈیرہ غازی خان میں روہان اور دریائے
سندھ کے درمیان واقع ہے اور پھر مستقل طور پر اس علاقے میں آباد ہو گئے۔

یہیں یہ یاد رہے کہ صوبہ پنجاب کے بعض زمیندار اور جاگیردار جن زمینوں
اور جاگیروں پر تاجن ہیں وہ انھیں انگریزی حکومت کی طرف سے کسی نہ کسی خدمت
کے صلے میں ملی ہیں۔ لیکن مزاریوں کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی جانوں
کو خطرے میں ڈال کر، ایک گروہ کی مدد کے زور بازو سے وہ علاقہ حاصل کیا

۳۵ جبار مولوی سید نصیر الدین (علی)، ص ۲۰ -

ہے جو ان کی زمینوں اور جاگیروں پر مشتمل ہے۔ ان کا پنجاب کی سبھی حکومت سے بھی سلسلہ جنگ جاری رہا اور انگریزوں سے بھی یہ لڑتے رہے۔

سوال یہ ہے کہ ان کو مزاری کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کے متعلق عام طور پر دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے بڑے کا نام مزار تھا، اس کے اخلاف، اس کی نسبت سے مزاری کہلائے۔ دوسری یہ کہ ابتدا میں یہ قوم جس ندی پر آباد تھی، اس کا نام "مزار" تھا، اس لیے قوم کا نام مزاری پڑ گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۶ء میں پاکستان کے مشہور سیاسی لیڈر سردار شیر باز خاں مزاری لاہور آئے تو میری ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے مزاری کی وجہ تسمیہ پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ سب سے پہلے ہمارے اسلاف جس علاقے میں رہتے تھے، وہاں شیر کو مزار کہا جاتا تھا۔ ایک معرکے میں ہمارے ایک بزرگ نے بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے تو اس سے متاثر ہو کر وہاں کے سردار نے انہیں "مزار" کا خطاب دیا جس کے معنی وہاں کی بولی میں شیر کے ہیں۔ اس کے بعد پوری قوم کو "مزاری" کہا جانے لگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں، یہ قوم بہت بہادر اور جرأت مند تھی۔ سید نصیر الدین دہلوی کو میدان جنگ میں بھی اس سے واسطہ رہا اور عام حالات میں بھی۔ انہوں نے اپنے تجربے کی بنا پر ہندوستان میں ایک صاحب کو خط لکھا۔

مزاریاں بہ شجاعت و شہامت ضرب المثل اند، و نیز در اجیر و جو دھ پور بذریعہ اخبار انگریزی معلوم شدہ بود کہ دریں ولایت قوم مذکورہ بعض محروسہ و مقبوضہ سکھ افارہ کر دند و چار پائے ہا بسیار بہ غارت بردند۔ بہ طرفیہ ایں قوم رغبتی می یافتہ۔^{۳۶}
یعنی مزاری بہادری اور شجاعت میں ضرب المثل ہیں۔ ان کے بارے میں اجیر و جو دھ پور میں انگریزوں کے ذریعے سے جو خبریں پہنچائی گئیں، ان سے معلوم ہو چکا تھا

^{۳۶} اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۲۹

کہ مزارلوں نے سکھوں کے بعض علاقوں پر حملے کیے اور ان کے بہت سے مولشی لوٹ لیے گئے، لہذا اس قوم کے لیے میرے دل میں ایک کشش اور رغبت پیدا ہو گئی ہے۔ سید نصیر الدین یہ بھی تحریر فرماتے ہیں۔

چوں میران خیر پور زبردستانِ فرنگیاں و آشتی داران سکھاں اند، قرار خود در محروسۂ ایشیاں مقرون صلاح نمی بنیم۔ اگرچہ متوقع چناں است کہ بفضد سجانہ، مسلمانانِ ایں دیار بسیارے از بسیار ہمراہ خواہند شد۔ بخلاف قوم مزاری کہ نہ از سکھاں خوف دارند، نہ از فرنگیاں^{۳۱}۔

یعنی والیان خیر پور چونکہ انگریزوں کے زیر اثر ہیں اور سکھوں سے بھی ان کی صلح ہے، اس لیے ان کے علاقے میں قیام میرے نزدیک خلاف مصلحت ہے۔ تاہم امید کی جاتی ہے کہ اس علاقے کے مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ والیان خیر پور کے برعکس، مزارلوں کی یہ حالت ہے کہ نہ وہ سکھوں سے ڈرتے ہیں نہ انگریزوں سے۔ سید نصیر الدین دہلوی، جس زمانے میں مزارلوں کے علاقے میں گئے، اس زمانے میں ان کا سردار، میر بہرام خاں مزاری تھا جو اپنے باپ میر حمل خاں مزاری کی وفات کے بعد ۱۸۰۱ء میں مزاری قوم کا سردار بنا۔ اس نے سید نصیر الدین اور ان کے رفقا کی بے حد پذیرائی کی اور ان کے ساتھ مل کر سکھوں اور انگریزوں کے

خلاف جہاد کیا۔
بہرام خاں کی شخصیت

بہرام خاں مزاری بہت عقل مند، نہایت مدبر اور فہیم و فرس آدمی تھا۔ ایک شخص مومن لال دہلوی نے انگریزی حکومت کے ملازم کی حیثیت سے مارچ ۱۸۳۶ء میں، ان علاقوں کا دورہ کیا تھا جن میں سکھوں اور مزارلوں کے درمیان لڑائیوں اور جھڑپوں کا سلسلہ جاری تھا۔ مومن لال نے بہرام خاں سے بھی ملاقات

^{۳۱} اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۳۰، ۳۱

کی تھی۔ وہ اپنے سفر نامے (ص ۲۲۵، ۲۲۶) میں لکھتا ہے۔
 ”بہرام خاں دہلا پتلا آدمی ہے اور قد درمیانہ۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص گہرے خیالات میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس کی طبیعت میں وہ شہادت اور پستی نظر نہیں آتی جو عام طور پر اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ وہ سرداروں کا سالباکس مانتا ہے، میں نے سنا ہے کہ اس کے پاس بہت روپیہ ہے۔“

سکھوں سے لڑائیاں

مجاہدین اور مزاری متحد ہو چکے تھے اور انہوں نے سکھوں کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا تھا۔ ”روحان“ اور ”کن“ اس نواح میں فوجی نقطہ نگاہ سے دو اہم مقام تھے، مجاہدین نے مزاریوں کے تعاون سے وہاں سکھوں پر شدید حملے کیے اور انہیں شکست دی۔ ”کن“ کے مقام سے سکھ بھاگے تو ان کو کافی نقصان پہنچا اور ان کے بعض بڑے بڑے فوجی مارے گئے۔ ایک شخص متورام نے ”باغ و بہار“ کے نام سے ۱۸۷۱ء میں صنلع ڈیرہ غازی خاں کی تاریخ شائع کی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کتاب کے صفحہ ۷۵ء سے ”روحان“ کی لڑائی کے بارے میں ایک اقتباس درج کیا ہے جو یہ ہے :-

”مولوی نصیر الدین غازی ہندوستانی، علاقہ قندھار سے پھرتا ہوا، بہ جمعیت ایک نثار سوار و پیادہ وارد علاقہ سندھ ہوا۔ تین دار مزاری نے مولوی مذکور کو حامی خود بنا کر علاقہ ”روحان“ کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا مگر کاردار متعینہ قلعہ روحان بہ سبب پناہ اس قلعے کے نزع کیا۔ مردمان مزاری علاقہ روحان کو مارتباہ کر کے واپس چلے گئے۔“

۳۸ سرگزشت مجاہدین ص ۱۹۲۔ سید نصیر الدین کے بارے میں متورام کا یہ کہنا غلط ہے کہ وہ قندھار سے علاقہ سندھ میں وارد ہوئے تھے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا، وہ مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ دہلی سے سندھ آئے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

سکھوں اور مزاروں کی صلح

زمانہ ہمیشہ کراٹ بدلتا رہتا ہے، کبھی کسی کے حق میں اور کبھی کسی کے مخالف۔ اب وقت نے ایسی انگڑائی لی کہ مزاروں اور سکھوں کے درمیان مصالحت ہو گئی جو اس زمانے کے حالات کی رُو سے مزاروں کے حق میں جاتی تھی اور مجاہدین کے خلاف۔ ایہ بات اخبار مولوی سید نصیر الدین میں بھی مذکور ہے اور تھورام نے بھی اپنی کتاب "باغ و بہار" (صفحہ ۱۷۵) میں ذکر کی ہے۔ ان کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر "سرگزشت مجاہدین" (صفحہ ۲۰۰) میں لکھتے ہیں۔

سید نصیر الدین نے لکھا ہے کہ (گورنر ملتان) دیوان ساون مل مجاہدین سے مرعوب ہو کر روحبان، مزاروں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مستند تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان مذکور مزاروں کی پوریشوں سے بہت پریشان ہو گیا تھا جو مجاہدین کی اعانت کے باعث خاص خطرناک صورت اختیار کر گئی تھیں۔ لہذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان سے مصالحت کی کوئی صورت پیدا کر کے کش مکش ختم کر دی جائے۔ چنانچہ رحیم خاں لغاری کے ذریعے گفت و شنید ہوئی۔ مزاروں کے تمام سابقہ حقوق بحال کر دیے گئے اور انھوں نے یہ منظور کر لیا کہ اپنے آپ کو سکھوں کی رعایا سمجھیں گے۔ میر بہرام خاں مزاری کو پہلے ملتان بلا یا گیا اور دیوان ساون مل نے اسے ایک ہزار روپے کا خلعت دیا، پھر اسے رنجیت سنگھ نے لاہور بلا یا۔ میر بہرام خاں کو طلانی گڑوں کی ایک جوڑی، ایک ہزار روپے نقد اور خلعت، نیز اس کے ساتھ جو پچاس مزاری سوار تھے، انھیں ریشمی کپڑے دیے گئے۔

نئی قیام گاہ

اب حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ سید نصیر الدین اور ان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) اور پھر مزاروں کے علاقے میں داخل ہوتے تھے۔ یہاں آکر انھوں نے سکھوں سے جہاد کیا۔

ساتھیوں کے لیے مزاروں کے ہاں قیام کرنا ممکن نہ رہا اور وہ "کشمور" چلے گئے لیکن یہاں یہ معاملہ تھا کہ کشمور سکھوں کی عمل داری کے بالکل قریب تھا اور اس کا حاکم خنیہ طور پر ملتان کے گورنر ساون مل سے ساز باز رکھتا تھا۔ ساون مل، مجاہدین کا دشمن تھا اور اس کے فوجی ٹھکانوں پر مجاہدین اور مزاری کئی مرتبہ شب خون مار چکے تھے۔ لہذا سید نصیر الدین نے وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا اور کسی اور مقام پر چلے گئے۔ اس زمانے میں مجاہدین سے سکھ فوجی نہایت خوف زدہ تھے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مجاہدین جب کشمور میں مقیم تھے، ساون مل نے جو مجاہدین کے قریب ہی فوج لیے بیٹھا تھا، ایک روز اپنی فوج کے ایک دستے کو مجاہدین کے ٹھکانے پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔ اس کا جواب اس کے خود اپنے فوجیوں کی طرف سے اسے ان صاف الفاظ میں دیا گیا۔

۳۹
تو پیش ماروی، ماہم ہمراہ تو می رویم، والا مجال ندریم کہ برغازیاں شب خون زیم۔
یعنی تو ہمارے آگے چل، ہم تیرے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔ ورنہ ہماری یہ مجال نہیں کہ غازیوں پر شب خون ماریں۔

اس جواب سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مجاہدین اگرچہ بہت کم تعداد میں تھے اور ہندوستان کے دور دراز علاقے سے آئے تھے، لیکن سکھ اپنی طاقت اور حکومت کے باوجود ان سے خائف تھے۔

مجاہدین کی یہ قیام گاہ اگرچہ سندھ کے کسی حاکم کی عمل داری میں تھی، مگر ریاست بہاول پور کی سرحد کے قریب تھی۔ لہذا نواب بہاول خاں اس سے گھبرا اٹھا، اور خطرہ محسوس کرنے لگا کہ مجاہدین اس کے علاقے میں دست درازی کریں گے حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی اور مجاہدین کو نواب بہاول خاں سے کوئی پر خاشش نہ تھی۔ تاہم وہ فوج لے کر آیا اور مجاہدین کے ٹھکانے سے صرف تین کوس کے فاصلے پر

آبیٹھا۔ نیز سندھ کے حکمرانوں کے پاس اپنے آدمی بھیجے کہ مجاہدین کو وہاں سے ہٹا لیا جائے اور ادھر نہ آنے دیا جائے۔

نواب بہاول شاہ کے پیغام کے بعد سندھ کے حکمرانوں نے سید نصیر الدین کو پیغام بھیجا کہ :

اے صاحب لشکر خود را برداشته در ملک مایاں بر مقام روپاکہ ضلعیت یا جائے و گر بہ آں لب و ریائے اباسین یعنی بہ طرف شکار پور سر جاتے کہ پسند خاطر افتد، چھاؤنی لشکر خود اندازند۔

آپ اپنے لشکر کو یہاں سے ہٹا کر ہمارے ملک کے موضع روپا میں آجائیں جو دریائے سندھ کے اس طرف یعنی شکار پور کی جانب ہے یا کسی اور مقام پر جو آپ کو پسند ہو قیام کر لیں اور اسے اپنی فوج کی چھاؤنی بنالیں۔

چنانچہ سید نصیر الدین وہاں سے اٹھ کر ایک جگہ "مہرود" چلے گئے جو شکار پور سے بارہ سپدرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سید صاحب مدوح فرماتے ہیں، یہ جگہ بڑی عمدہ اور کشادہ ہے، یہاں غلہ بھی مطلوبہ مقدار میں میسر ہے، پانی بھی عام ہے، گھاس اور لکڑی بھی بہت ہے، گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے یہاں اچھی چراگا ہیں بھی ہیں۔ یعنی ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔

سید نصیر الدین اور ان کے رفقا کا اصل اور بنیادی مقصد جہاد تھا اور اس سلسلے میں وہ وہاں کے رئیسوں، امیروں، حاکموں اور پیروں کا تعاون چاہتے تھے، اور یہ بھی چاہتے تھے کہ مجاہدین مقامی مسلمانوں پر بوجہ نہ بنیں، انہیں محنت مزدوری کے مواقع میسر ہوں تاکہ وہ کچھ کھا کر گزارا وقت کر سکیں۔ اس ضمن میں بھی وہ وہاں کے

۱۴۳۳ء اخبار مولوی سید نصیر الدین صفحہ ۱۴۳ — منقول ہے کہ شکار پور کے شمالی حصے اور جکی آباد کے تھوڑے سے جنوبی حصے کو قدیم زمانے میں روپا کہتے تھے۔ اب سرکاری طور پر اس کا یہ نام نہیں ہے، لیکن بتایا جاتا ہے کہ سندھ کے عوام اس خطے کو اب بھی روپا ہی کہتے ہیں۔

مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کے متمنی تھے اور مہارو کا محل وقوع ایسا تھا کہ وہاں یہ سہولتیں حاصل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

امیرانِ سندھ در صورتِ اقامتِ بایاں دریں ملک و جنگ کردن با کفار سگھار
قراہم آوردن مسلماناں بہ بیچ وچہ مانع و مزاحم نیستند، و از سکونت لشکر اسلام خواہ
از روئے تجارت باشد یا کسب دیگر، کسے ناخوش نیست، زیرا کہ زمینِ سندھ صد ہزار
ویران و غیر آباد افتادہ است۔ ہر قدر آبادی بہ عمل آید، خوشنودی رہیسانِ این
نواح است۔

یعنی سندھ کے امرا و رؤسا اس علاقے میں مجاہدین کے قیام کرنے، کافر سکھوں
سے جنگ کرنے اور وہاں سے جنگ جو مسلمانوں کی فراہمی میں قطعی طور سے مزاحمت
نہیں کریں گے۔ ہمارے سامنے یہاں رہ کر تجارت کریں یا کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع
کریں یا کوئی اور پیشہ اختیار کریں، اس سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ اس کی وجہ یہ
ہے کہ سندھ میں سیکڑوں کوس زمین ویران اور غیر آباد پڑی ہے، یہاں جتنی
آبادی ہوگی، اس علاقے کے رہنسیوں کے نزدیک خوشنودی کا باعث
سمجھی جائے گی۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سید نصیر الدین اور ان کے سابق مجاہدین کتنا عرصہ مہرو میں

اقامت گزریں رہے۔

قلات کے وزیر اعظم کا اصرار

سید نصیر الدین کے قیامِ سندھ کے زمانے میں اور اس دور میں جب کہ وہ مزار پور
کے پاس مقیم تھے اور سکھوں سے برس پیکار تھے، قلات کا وزیر اعظم مختار الدولہ محمد بن
بھی انھیں خطوط لکھتا اور قلات تشریف لانے پر اصرار کرتا رہا۔ اپنے خطوط میں وہ ان سے

انتہائی عقیدت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ان کا ادنیٰ خادم ہے۔ ایک خط میں جو انھیں مہر کے دوران قیام میں ملا، لکھا ہے۔

ابن فدوی خدائی دائرہ خود را غائبانہ یکے از غلامان و دامن گرفتگان خادمان عالی می داند۔^{۲۲}

کہ خدا گواہ ہے، میں اپنے آپ کو آپ کے غلاموں اور منوسلوں میں شمار کرتا ہوں ایک اور خط میں ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کا پختہ عہد کرتا ہے۔

اصلاً خود را از بوئیات این امر شریف دین نبوی حتی الامکان دریغ نہ خواهد

داشت۔^{۲۳}

میں دین نبوی کے اس اہم حکم یعنی جہاد کی تائید و حمایت میں کوئی کسر اٹھانہ رکھوں گا۔ لیکن ان خطوط و مواعید کے باوجود کہا جاتا ہے کہ محمد حسن نہایت چالاک اور زباز آدمی تھا۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ سید نصیر الدین ان خطوط سے کہاں تک متاثر ہوئے اور وہ اس کے پاس قلت گتے یا نہیں گتے۔

بلوچستان میں

جب سید نصیر الدین کو کسی طرف سے کوئی امید نہ رہی اور سندھ یا اس نواح کے کسی اور علاقے میں محاذ قائم کرنے کے مخالفین اسلام کے ساتھ جنگ و جہاد کا امکان ختم ہو گیا تو بلوچستان کو روانہ ہوئے اور سی، ڈوہارڈ، تھل اور چیتالی وغیرہ میں کچھ مدت قیام کیا۔ شاہ دوزئی، غلزی، کاکڑ، استرانی اور بزدار وغیرہ قبائل میں تھوڑا عرصہ سکونت اختیار کی۔ کچھ بھی کچھ دن ٹھہرے۔ لورالائی، زوب اور کوتلہ کے کوہستانی علاقوں میں بھی مقیم رہے۔ ان تمام مقامات پر جانے کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ تھا جہاد فی سبیل اللہ۔ سکھوں کے مقبوضات بہت وسیع ہو چکے تھے اور مسلمان ان کے

^{۲۲} اخبار مولوی سید نصیر الدین (قلمی) ص ۱۳۴

^{۲۳} ایضاً ص ۱۳۸

ہاتھوں سخت مصائب میں مبتلا تھے۔ سید مدوح اور ان کے ساتھی، ان سے جہاد کے لیے لے تے تھے مگر سیاسی حالات میں اس درجے تغیر رونما ہو چکا تھا کہ جہاد کے لیے حجم کم بیٹھنے کی کوئی صورت پیدائے ہو سکی۔ اس طول طویل سفر میں متعدد زقافات پاگئے بعض راستے میں غیر مسلموں سے جھڑپوں میں شہید ہو گئے اور بعض ادھر ادھر چلے گئے یہ حضرات پھرتے پھرتے ستھانہ پنچے جہاں مجاہدین کا پہلا مرکز بننا اور وہاں بھی اب چند لوگ باقی تھے مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ ان حالات میں انہوں نے ازمیر نو کام شروع کیا اور مجاہدین کی فراہمی اور تنظیم کو مرکز توجہ ٹھہرایا۔ لوگوں کو دعوت جہاد دی اور اس کے لیے باقاعدہ کام کی طرح ڈالی۔

انگریزوں سے جہاد

اس آشنا میں ناگہاں حالات میں تبدیلی آئی اور گرد و پیش کی سیاسیات نے انگریزوں کی توتیا چلا کہ انگریزوں نے افغانستان پر قابض ہونے اور اس کی آزادی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے والی افغانستان امیر دوست محمد خان کو سخت پریشانی لاحق ہوئی اور اس نے میدانِ مقابلہ میں اترنے کا عزم کر لیا۔ سید نصیر الدین اپنے ساتھیوں کی معیت میں وہاں پہنچے اور امیر دوست محمد خان کی کمان میں انگریزوں سے لڑائی کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے افغانستان کے حکمران خاندان میں اختلاف پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، جس میں وہ کامیاب رہے اور نتیجتاً پورے ملک میں خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا جس نے ایک ہولناک صورت اختیار کر لی۔ دوست محمد خان کو مجبوراً انگریزوں کے سامنے جھکنا پڑا۔

پھر ایک موقع آیا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان غزنی کے مقام پر سخت جنگ شروع ہو گئی۔ سید نصیر الدین فوراً اپنے مجاہد رفقا کی معیت میں وہاں پہنچے۔ یہاں انہوں نے خوب داد و شجاعت دی اور انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس دوران میں یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا کہ امیر دوست محمد خان کا ایک قیدی غزنی انگریزوں سے مل گیا اور اس نے قلعہ غزنی کے تمام اندرونی اور جنگی راز ان کو بتا دیے۔

اس کے بعد انگریزوں نے رات کے اندھیرے میں قلعے کے ایک دروازے پر بارود کے تھیلے رکھے اور انھیں آگ لگا دی۔ اس سے خوف ناک دھماکہ ہوا اور دروازہ اُڑ گیا۔ انگریزی فوج فوراً قلعے میں داخل ہو گئی۔ اس موقع پر دست بہ دست جنگ ہونے لگی، جس میں سید نصیر الدین کے بہت سے ساتھی جام شہادت نوش کر گئے۔ یہ واقعہ ۲۱ جولائی ۱۸۳۹ء کو پیش آیا۔

بعض انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ سید نصیر الدین ایک ہزار آدمی لے کر کابل کی طرف بڑھے۔ ڈھاڈر کے مقام سے انھوں نے تین سو مجاہدوں کی جمعیت امیر دوست محمد خان کی امداد کے لیے بھیجی۔ یہ لوگ غزنی کی حفاظت پر متعین ہوئے تھے اور وہیں جاں بحق ہو گئے۔

ستھانہ میں

اس کے بعد سید صاحب اوعمان کے بچے کچھ مجاہد ساتھی سخت مصائب کی منزلیں طے کرتے اور آلام کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے ستھانہ پہنچے، جہاں مولوی نصیر الدین شگوری کو مجاہدین نے اپنا امیر مقرر کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی سید نصیر الدین کو مجاہدین نے امیر مقرر کر لیا۔ یہ ۱۸۳۹ء کے اواخر یا ۱۸۴۰ء کے اوائل کی بات ہے۔

عادات و اطوار

سید نصیر الدین دہلوی نہایت عمدہ عادات و اطوار کے مالک تھے۔ انتہائی نرم مزاج، حلیم الطبع اور بلند کردار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سب لوگ ان کی عزت کرتے اور تحریم سے پیش آتے تھے۔ تمام طبقوں میں سہولت و عزیز اور عوام و خواص میں احترام کا مقام رکھتے تھے۔ عام و فاضل اور عابد و زائد تھے۔ معقول و منقول پر گہری نظر تھی۔ اور حدیث و فقہ میں ماہر تھے۔ کثیر الدعاء اور کثیر البکا بزرگ تھے۔ دعا کے لیے بارگاہِ خداوندی میں ہاتھ اٹھاتے تو اس الحاح و عجز سے دعا کرتے کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ یہ دعا ضرور درجہ قبولیت حاصل کرے گی۔ ایک مرتبہ سندھ کے کسی مقام پر بہت بڑے مجمعے میں دعا کی، جس کی اثر انگیزی سے حاضرین زار و قطار رونے لگے۔ اکثر لوگوں

پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی یعنی لوگ مجذوبیت کے عالم میں کپڑے پھاڑ کر صحرا کی طرف نکل بھاگے۔

ان کی دعوت و تبلیغ بھی انتہائی پُر تاثیر تھی۔ اُونچے مرتبے کے حق پرست ، کتاب و سنت کے عاشق صادق اور خلوص و للہیت کے پیکر تھے جہاد فی سبیل اللہ کی تلقین فرماتے تو لوگ اثر میں ڈوب جاتے۔

مازہ بہت ہی خشوع و خضوع سے پڑھتے اور تمام ارکانِ مٹھر ٹھہر کر ادا کرتے۔ تدبیر و صلاحیت میں اپنی مثال آپ تھے۔

فقہی مسائل پر عبور و استحضار کا یہ عالم تھا کہ دورانِ سفر اور دورانِ قیام میں اس سلسلے میں لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے۔

ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ واقعہ بالاکوٹ کے بعد جہاد کے سلسلے میں لوگوں پر جو افسردگی طاری ہو گئی تھی، مسلسل محنت و کوشش اور بے حد بھاگ دوڑ سے اُسے ختم کیا۔ مجاہدین کی جماعت کو منظم کیا اور جو لوگ مایوسی کا شکار ہو گئے تھے، ان میں از سر نو روحِ جہاد پیدا کی۔ سررشتہ نظم و نسق کو مضبوط کیا اور لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی زوردار الفاظ و اسلوب میں دعوت دی اور اس میں اللہ نے ان کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔

وفات

سید نصیر الدین دہلوی نے مرکزِ مجاہدین سھانہ سے والی امب پانڈہ خاں تنولی کو خط لکھا کہ وہ مجاہدین سے تعاون کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان کی امداد کرے۔ خط پڑھ کر پانڈہ خاں نے انھیں اپنے ہاں امب تشریف لانے کی دعوت دی، وہ امب گئے اور کئی دن وہاں مقیم رہے۔ مشہور ہے کہ پانڈہ خاں نے انھیں زہر دلوادیا تھا یعنی بعض لوگ اس بات کو صحیح نہیں قرار دیتے۔ بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو،

۱۹۶۳ء سرگزشتِ مجاہدین، ص ۲۰۹ بحوالہ وزیر الدولہ ج اول، ص ۲۴۳، ۲۴۴

پانڈہ خان نے انھیں زہر دلوادیا ہویا نہ دلوادیا ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ امب ہی میں بیمار ہوئے، حالت بیماری ہی میں ستھانہ آئے اور چند روز بعد وفات پا گئے۔ وفات کے مہینے کا تعین نہیں ہو سکا، البتہ سن وفات ۱۸۴۰ء تھا۔ انھیں ستھانہ میں دفن کیا گیا۔ اس سے اگلے سال ۱۸۴۱ء کو دریائے سندھ میں سیلاب آیا تو ان کی قبر سیلاب میں بہ گئی۔ اسی سیلاب میں مجاہدین کا مرکز ستھانہ بھی تباہ ہو گیا، جسے شید نصیر الدین نے بڑی محنت سے آباد کیا تھا۔ مجاہدین جو بہت کم تعداد میں باقی رہ گئے تھے، انھوں نے میر اولاد علی کو اپنا امیر مقرر کر لیا جو اس سے قبل مولوی نصیر الدین منگوری کی شہادت کے بعد تھوڑی سی مدت کے لیے منصبِ امارت پر متمکن رہ چکے تھے۔

اہل و عیال

سید مرحوم کی شادی حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی اور ہجرت کے وقت ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عبداللہ تھا، دوسرے کا عبدالحکیم۔ جہاد کے لیے گھر سے نکلے تو دونوں بیٹے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بعض مکاتیب میں ان کی تعلیم کے لیے تاکید فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں:

”امید از مالک خود قوی دارند کہ او جل جلالہ ما و شمار اور در دنیا بہ مراد ملاقی کنند و در سہ امر توکل بر خدا بایں کرد، و استقامت بر نماز مفروضہ و تلاوت قرآن بایں نمود، و غفلت در زکوٰۃ نہ بایں کرد، و در تعلیم عبداللہ و عبدالحکیم بایں کوشید، و دل را باہر دو فرزند اں بایں چسپانید، و در وقت نشست و برخاست و قیام و قعود نام خدا بایں گرفت“

”یعنی خدا سے قوی امید رکھیے کہ وہ ہم اور آپ کو اس دنیا میں حسب مراد ملائے گا۔ ہر کام میں خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ فرض نماز اور تلاوت قرآن پر استقامت ضروری ہے۔ ادائے زکوٰۃ میں غفلت نہ ہو۔ عبداللہ اور عبدالحکیم کی تعلیم کے لیے کوشش کیجیے۔ دل و ذہن بیڑوں میں لگائیے۔ اٹھتے بیٹھتے خدا کا نام لیتے رہیے۔“

۱۵ اخبار مولوی سید نصیر الدین (دہلی) ص ۱۵

یہ ان کے ایک مکتوب کے الفاظ ہیں، لیکن ہجرت سے لے کر وفات تک اس دنیاے فانی میں اپنے اہل و عیال سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی، جس طرح کہ ہجرت کے بعد سید احمد شہید اپنے بال بچوں سے نہیں مل سکے۔ غالب خیال یہ ہے کہ ان کے بیٹے اور بیوی شاہ محمد اسحاق کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر رقم طراز ہیں کہ مولانا سید عبدالحی راتے بریلوی نے لکھا ہے کہ مولانا سید نصیر الدین کے اولاد نہ چلی۔ البتہ ان کے بھائی سید ناصر الدین کے ایک فرزند سید معز الدین تھے اور سید معز الدین کے فرزند سید ظہیر الدین احمد تھے، جن سے مولانا سید عبدالحی نے ۱۸۹۵ء میں ملاقات کی تھی۔ انہی سید ظہیر الدین احمد نے ولی اللہی خاندان کی بیشتر تصنیفات چھپوائی تھیں، بلکہ اس غرض سے ایک مطبع قائم کر لیا تھا۔

۱۱۵۔ مفتی نظام الدین سورتی

ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ایک شہر "سورت" ہے، جسے کئی سو سال قبل علم کی حیثیت حاصل رہی اور بے شمار علما و فقہانے وہاں جنم لیا اور مساندتدیس آراستہ کیں۔ وہ تصنیف و تالیف میں بھی شہرت یاب ہوئے اور تصوف و طریقت کے میدان میں بھی درجہ کمال حاصل کیا۔ غرض وہ تمام اصنافِ فضیلت اور تمام اقسامِ علم میں ممتاز ہوئے اور ہر شعبہ فن میں ان کا جھنڈا بلند رہا۔ ان حضراتِ عالی مقام کے تذکار سلسلہ فقہائے ہند کی تمام جلدوں میں بہت سے مقامات میں احاطہ تحریر میں آچکے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری کا سورت بھی علم و علما اور فقہ و فقہائے سلسلے میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس صدی میں اس سرزمین کے جن اہل علم اور اصحابِ فقہ نے نام پیدا کیا، ان میں مفتی نظام الدین سورتی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے۔ یہ سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والدِ محترم مفتی خیر الدین سورتی سے حصولِ علم کیا اور طویل عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سورت کے منصبِ افتا پر فائز ہوئے۔ تمام فقہی مسائل کے لیے سورت اور اس کے قرب و جوار کے لوگ انہی سے رجوع کرتے تھے اور ان کا مطالعہ علم فقہ نہایت وسیع تھا۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سورت کے اس عالم و فقیہ نے ۲۸۔ رجب ۱۲۲۰ھ کو سورت میں وفات پائی۔

۱۱۶۔ مفتی نظر محمد سہسوانی

سید مفتی نظر محمد حسینی مودودی سہسوانی علم و فضل اور شخصیت و صالحیت میں عالی مرتبت لوگوں میں سے تھے۔ مولانا سید مفتی محمد ہاشم کے فرزند اور مفتی محمد عاقل حسینی سہسوانی کے پوتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ کے لگ بھگ سہسوان میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ان کے والد مفتی محمد ہاشم سہسوانی کا شمار اپنے دور کے جید علما میں ہوتا تھا اور سہسوان میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ لائق بیٹے نے اپنی سے اکتساب علم کیا اور مرتبہ بلند پر فائز ہوئے۔ ولایت و معرفت اور شریعت و طریقت کے رموز سے آگاہ تھے اور اس میں خاص شہرت رکھتے تھے۔

مفتی نظر محمد بہت ذہین اور انتہائی فہم بزرگ تھے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں علومِ رسمہ سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ اسی اثنا میں والدِ مکرم مفتی محمد ہاشم نے وفات پائی جو مغلیہ حکومت کی طرف سے سہسوان اور اس کے اردگرد کے منصبِ افتا پر مشتمل تھے۔ والد کی وفات کے بعد اس اہم منصب پر مفتی نظر محمد کو متعین کیا گیا۔ اگرچہ یہ کم عمر تھے اور منصبِ افتا بہت ذمہ دارانہ منصب تھا، لیکن مفتی نظر محمد نے اپنے مفوضہ فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیے۔ کافی عرصہ اس منصب پر مامور رہے۔

اس دوران میں ان کی زندگی ایک عجیب انقلاب سے دوچار ہوئی اور وہ

۳۶ حقیقت سورت، ص ۱۰۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۵۰۳۔

ذکر و فکر اور مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ ایک دور ایسا آیا کہ آبادی سے نکل بھاگے اور صحرا میں ڈیرہ لگالیا۔ کافی مدت بعد گھر آئے اور تہجد و انزوا کی زندگی اختیار کر لی۔ ہر وقت مشغول عبادت رہتے، کسی سے قطعاً کوئی رابطہ نہ تھا۔ کچھ طبیعت سنبھلی تو دور و نزدیک سے بے شمار لوگ حصول فیض کے لیے حاضر ہونے لگے۔ فقرا و مساکین اور مہانوں کا سہراں جھگھٹا رہتا۔ تمام جاتا و عزابو مساکین اور یتامی و مستحقین میں بانٹ دی۔ اعزہ و اقارب کو بھی بہت کچھ عنایت کیا۔ وہ مغل بادشاہ محمد شاہ کا زمانہ تھا اور یہ بادشاہ علما و فقہا اور مشائخ و صلحا کا عقیدت مند تھا۔ اس کو مفتی نظر محمد کی کیفیت کا پتا چلا تو اس نے چار زر خیز گاؤں بہ طور جاگیر عطا کیے۔

مفتی محمد نظر سہسوانی جب جذب و حال کی وجہ سے منصب افتا سے علیحدہ ہو گئے تو مغل حکمران نے اس منصب پر ان کے بیٹے سید مفتی نور احمد کو متعین کر دیا۔ مفتی نظر محمد سہسوانی نے جمعے کے دن ۱۴ — ذیقعدہ ۱۲۳۶ھ کو وفات پائی۔

۱۱۷ — مفتی نعمت اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلی میں مفتی نعمت اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی کو کبار فقہا اور مشاہیر اساتذہ میں گردانا جاتا تھا۔ ہیبت، ہندسہ، حساب وغیرہ فنونِ رضیہ میں لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

مفتی نعمت اللہ لکھنوی میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ تمام گھرانہ دولتِ علم سے مالا مال تھا، خود ان کے والد مفتی نور اللہ انصاری کا سلسلہ تدریس جاری تھا، ان کے عم محترم مفتی ظہور اللہ انصاری بھی مسند تدریس پر رونق افروز تھے۔ نعمت اللہ نے انہی دونوں سے تعلیم پائی اور

مختلف اصنافِ علم میں ممتاز ہوتے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد یوپی کے ایک شہر فیض آباد کا منصب افتا ان کے سپرد ہوا۔ یہ ایک عہدہ جلیلہ تھا جو حکومت کی طرف سے اسی عالم کو تفویض کیا جاتا تھا جو علم فقہ میں مہارت رکھتا ہو۔ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیے گئے اور ایک مدت تک فیض آباد اور لکھنؤ کی مسند افتا پر مامور رہے۔

بعد ازاں علاقہ گجرات کے رئیس کی دعوت پر ”بڑودہ“ گئے، پھر علاقہ بہار کے ایک مقام ”بیا“ تشریف لے گئے۔

مفتی نعمت اللہ ذکاوت و حلالت، حلم و تواضع اور دیانت و منانت میں خاص شہرت رکھتے تھے، گفت گو میں نہایت نرم تھے۔ طلباء کو درس بھی ٹھہر ٹھہر کر دیتے، جو کتاب پڑھانا ہوتی، اس کے متعلق تمام تفصیلات بیان کرتے اور جو مقام پڑھاتے، اس کے حواشی و تشریحات وغیرہ اچھی طرح طلباء کے ذہن نشین کراتے۔ نجیب الجثہ بزرگ تھے اور اس قدر آہستہ بات کرتے کہ قریب بیٹھا ہوا شخص بھی مشکل سے سمجھ پاتا۔ بہت سے علما و طلباء نے ان سے استفادہ کیا جن میں مولانا عبدالحکیم انصاری ان کے بیٹے مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا محمد فاروق چریا کوٹلی اور خود مفتی نعمت اللہ کے صاحب زادے مولانا فضل اللہ انصاری شامل ہیں۔

مفتی نعمت اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۲۹۹ھ کو وفات پائی۔

۱۱۸۔ مولانا مفتی علی خاں بریلوی

مولانا مفتی علی خاں بریلوی تیرھویں صدی ہجری میں اپنے نواح کے معروف عالم اور فقیہ تھے۔ مسلک احنفی تھے۔ پٹھان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ مختصر سلسلہ نسب

۳۹۴ تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۸۳ تا ۱۸۵۔ احوال علمائے فرنگی محل، ص ۸، ۹۔

تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۶۔

یہ ہے نقی علی بن رضا علی بن کاظم علی بن اعظم شاہ بن سعادت یار۔ !
 نقی علی غزہ رجب ۱۲۴۶ھ کو بانس بریلی میں پیدا ہوئے اور تمام کتب درسیہ
 اپنے والد ماجد مولانا رضا علی سے پڑھیں۔ سید آل رسول مارہروی سے اخذ طریقت
 کیا اور ۱۲۹۴ھ کو ان سے سند حدیث لی۔ ۱۲۹۵ھ میں حج بیت اللہ کیا اور
 مکہ مکرمہ میں شیخ احمد زین و حلان سے حدیث کی سند حاصل کی۔
 اہل حدیث کے شدید مخالف تھے، مولانا اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان
 کے رد میں ایک کتاب تصنیف کی۔ اپنے مخالفین پر سخت تنقید کرتے۔ ان کی
 تصنیفات یہ ہیں :-

- ۱۔ الکلام الاوضح فی تفسیر الم نشرح۔ سورۃ الم نشرح کی تفسیر میں یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔
- ۲۔ وسیلۃ النجاة: یہ کتاب آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ سے متعلق ہے۔
- ۳۔ سرور القلوب فی ذکر المحبوب: یہ وسیلۃ النجاة کی تلخیص ہے۔
- ۴۔ جواہر البیان فی اسرار الارکان: نماز روزہ وغیرہ ارکان دین کے بارے میں۔
- ۵۔ اصول الرقاد فی تصحیح مبانی الفساد: نجدیوں کے رد و ابطال میں۔
- ۶۔ ہدایۃ البریۃ الی الشریعۃ الاحمدیہ: ان متعدد فرقوں کے رد میں جو
 ان کے نزدیک فساد انگیزی میں مصروف تھے۔
- ۷۔ اذاتۃ الاثام لما نعی السولید والقیام:
- ۸۔ ازالۃ الاوهام: نجدیوں کے رد میں۔
- ۹۔ تزکیۃ الایقان فی سرائر تقویۃ الایمان: مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی
 کتاب (تقویۃ الایمان) کی تردید میں۔
- ۱۰۔ فضل العلم والعلماء:
- ۱۱۔ الکواکب لزہراء فی فضائل العلم واداب العلماء:
- ۱۲۔ الروایۃ الرویہ فی اخلاق النبویہ:
- ۱۳۔ النقادۃ النقویہ فی الخصال النبویہ:

- ۱۲ - لمعة النبراس في آداب الاكل واللباس -
 - ۱۵ - التمكن في تحقيق مسائل الترشين -
 - ۱۶ - احسن الرعاء لاداب الدعاء -
 - ۱۷ - خيرا للمخاطبه في المحاسنة والبراقبه -
 - ۱۸ - هداية المشرق الى سير الانفس والافاق -
 - ۱۹ - ارشاد الاحباب الى اداب الاحتساب -
 - ۲۰ - اجبل الفكر في مباحث الذكر -
 - ۲۱ - عين المشاهده لحسن المجاهده -
 - ۲۲ - تشوق الاواة الى طرق محبة الله -
 - ۲۳ - نهاية السعادة في تحقيق الهمة والارادة -
 - ۲۴ - اقوى الذريعة الى تحقيق الطريقة -
 - ۲۵ - ترويح الارواح في تفسير سورة الانشراح -
- مولانا الفتی علی خاں بریلوی نے سلخ ذیقعدہ ۱۲۹۷ھ کو وفات پائی۔

۱۱۹ - مفتی نور احمد سہسوانی

سہسوان (لوہی) کے تیرھویں صدی ہجری کے علما و فقہاء میں سید مفتی نور احمد حسین سہسوانی کا نام نامی بہت مشہور ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مفتی نظر محمد اور جد امجد کا مفتی ابو محمد تھا مغل دور میں اس خاندان کے علما اپنے شہر سہسوان کے مفتی تھے اور یہ سلسلہ عہدِ مغلیہ کے آخر تک جاری رہا۔ مفتی نور احمد بھی افاکے عہدِ عالی پر متمکن تھے اور اپنے وقت کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ تدین و صالحیت میں بھی شہرت رکھتے تھے۔

۱۱۹ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۳۳، ۲۳۵ - نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۰۸، ۵۰۹ -

نور احمد ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ سہسوان میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ چند سال کی عمر کو پہنچے تو حصول علم کے لیے مراد آباد، رام پور اور لکھنؤ کا سفر کیا، وہاں کے مختلف علما و اساتذہ سے ملے اور ان کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں خاص طور سے لائق تذکرہ شخصیت مکرالعلوم عبدالعلی انصاری فرنگی محلی کی ہے۔

نور احمد سہسوانی کی ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ زمانہ طالب علمی ہی میں حواشی و تعلیقات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس کے لیے درسیات کی مشکل ترین کتابوں کا انتخاب کیا۔ مثلاً "تاضی مبارک کی شرح سلم" پر تعلیقات سپرد قلم کیں، ملا محمود جون پوری کی "شمس البازغہ" پر تعلیقات و حواشی تحریر فرمائے۔

تعلیم سے فراغ کے بعد اپنے والد مفتی نظر محمد کی جگہ سہسوان کے مفتی مقرر ہوئے اور چالیس برس تک نہایت حسن و خوبی سے یہ نازک ترین خدمت انجام دیتے رہے۔

فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ایک مثنوی گلشنِ عشق لکھی جو یوسف زلیخا کی طرز پر ہے۔

مفتی نور احمد دینی اور دنیوی و جاہلت کے مالک تھے، امارت و ثروت سے بہرہ ور اور علم و کمال سے سرفراز تھے۔ ہر حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور لوگ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

اس عالم اجل اور ممتاز فقیہ نے ۱۲۸۰ھ کے قریب سہسوان میں انتقال کیا۔

۱۲۰ — مفتی نور اللہ لکھنوی

لکھنؤ کے فرنگی محلی علما کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آسانی سے اس کا احاطہ نہیں

کیا جاسکتا۔ ان میں سے بہت سے حضرات کا تذکرہ اس کتاب کے مختلف مقامات میں ہو چکا ہے۔ انہی بزرگوں میں ایک بزرگ مفتی نور اللہ انصاری فرنگی محلی تھے جو مولانا محمد ولی کے فرزند گرامی اور مولانا غلام مصطفیٰ انصاری کے پوتے تھے۔ اپنے دور کے عالم و فقیہ اور شیخ تھے۔

اس نامور عالم کی ولادت اور تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے والد مولانا محمد ولی اور مفتی عبدالواحد خیر آبادی سے حصول علم کیا۔ حساب و ریاضی وغیرہ علوم میں بہت ماہر تھے۔ لکھنؤ کے منصب قضا پر متعین رہے اور یہ اہم کام بڑی خوب صورتی اور احتیاط سے انجام دیا۔ درس و افادے کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری رکھا۔ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ مختلف کتب درسیہ پر حواشی و تعلیقات ان سے یادگار ہیں۔ جبر و مقابلہ کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا۔

توضیح مطالب میں ان کی بہت شہرت تھی۔ طالب علم اور رسائل کے سامنے اس اسلوب سے بات کرتے کہ تمام مطالب اچھی طرح اس کے ذہن کی گرفت میں آجاتے۔

مفتی نور اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۲۶۱ھ کو وفات پائی ہے

۱۲۱۔ مولانا نور محمد سوتری

ہندوستان کا ضلع "حصار" آزادی سے قبل متحدہ پنجاب میں شامل تھا۔ آزادی کے بعد یہ مشرقی پنجاب میں آیا۔ بعد ازاں حکومت ہند نے اپنی انتظامی اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر مشرقی پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ صوبہ "ہریانہ" کے نام سے موسوم ہوا، ایک "ہماچل پردیش" کے نام سے اور ایک مشرقی پنجاب کے نام سے۔ اس تقسیم کی رو سے ضلع حصار کو صوبہ ہریانہ

میں شامل کر دیا گیا۔

اضلاع پنجاب میں ابتدا ہی سے حصار کا ضلع مال و دولت اور زراعت کے اعتبار سے پسماندہ ضلع تھا اور عام طور پر قحط کی زد میں رہتا تھا۔ بایں ہمہ اس کے بعض مقامات علمی اعتبار سے پُر ثروت تھے اور ان میں علما و فضلاء اور صوفیاء و اقلیاء کے مساکن و مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ان مقامات میں حصار، سرسہ، ڈوبی رائیاں، جلال آباد اور روڑی کے بلاد و قصبات قابل ذکر ہیں۔

ضلع حصار کی تحصیل سرسہ میں ایک "ندی" تھی جو خاصی چوڑی اور گہری تھی۔ یہ ندی عام طور پر خشک رہتی تھی۔ بارشوں کے موسم میں اگر کھل کر بارشیں ہوتیں تو ندی خوب بہتی اور کناروں سے اچھل پڑتی۔ وہاں کے لوگ اُسے "نالی" کہتے تھے۔ دراصل یہ دریا ئے گھاگرا تھا۔ اس کے اردگرد کے علاقے کو وہاں کی بولی میں سوتر کہا جاتا تھا۔ وہیں تحصیل سرسہ میں ایک گاؤں "رائیاں" تھا۔

صاحب ترجمہ مولانا نور محمد ۱۱۹۶ھ (۱۸۲۱ء) کو اسی گاؤں "رائیاں" میں پیدا ہوئے۔ ان کا تخلص نور تھا اور انھیں "نور محمد نور سوتری" کہا جاتا تھا۔ والد کا نام چوہدری جھنڈا تھا، جو تیبہ برادری سے تعلق رکھتے تھے جو راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔ چوہدری جھنڈا اپنے دور کا مشہور ڈاکو اور راہزن تھا۔ اس کی عادت تھی کہ امیروں کا مال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس لحاظ سے غریب اسے اچھا آدمی سمجھتے اور امیر سخت برا قرار دیتے تھے۔

اس کے بیٹے نور محمد کو بدوشو رہی سے اس کام سے نفرت تھی اور وہ باپ کے اس کاروبار کو غلط قرار دیتے تھے۔ وہ آٹھ نو سال کے ہوتے تو مسجد میں جانا اور قرآن مجید پڑھنا شروع کر دیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں "رائیاں" کے امام مسجد سے حاصل کی اور باپ ان کی راہ میں نہ صرف یہ کہ مزاحم نہیں ہوا بلکہ اس نے بیٹے کی حوصلہ افزائی کی۔

نور محمد جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتے گئے، جھول علم کا شوق افزوں سے افزوں تر

ہونا گیا۔ جب دیکھا کہ گاؤں اور اس کے جوار و نواح میں کوئی شخص اتنی قابلیت کا نہیں کہ انھیں مزید تعلیم دے سکے تو دہلی کا رخ کیا اور وہاں کے مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کرنے لگے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مستداولہ میں دسترس حاصل کی۔ دہلی سے بریلی گئے، وہاں کے بعض اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تڑکیا، لیکن ان دونوں شہروں — دہلی اور بریلی — میں کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں اور کن کن طلباء کے ساتھ مل کر پڑھیں؟ اس کا پتا نہیں چل سکا۔ اس میں البتہ کوئی شبہ نہیں کہ وہ معقولات و منقولات میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور نہایت ذہین اور فطین شخص تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کب فارغ التحصیل ہوئے اور کن بزرگوں سے سند فراغت حاصل کی — اگر وہ بیس سال کی عمر میں بھی دہلی گئے ہوں تو ملک کی حکمرانی کے اعتبار سے وہ مغلوں کا دور تھا اور درس و تدریس کی زمام حکمرانی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند ان گرامی اور ان کے ارشد تلامذہ کے ہاتھ میں تھی۔ کوئی حتمی بات کہنا تو مشکل ہے لیکن قرآن سے اندازہ ہوتا ہے کہ نور محمد نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا ہوگا۔

علوم سے فراغ کے بعد وہ وطن واپس آئے اور ضلع حصار کے ایک گاؤں "ہیکٹر" میں سکونت اختیار کی۔ وہیں سے انھوں نے وعظ و تبلیغ کی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اسی گاؤں یعنی ہیکٹر ہی کے دوران قیام میں ان کی شادی ہوئی۔

وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر اور معروف ترین مبلغ تھے۔ اسی زبان کو انھوں نے وعظ و ارشاد اور اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ وہ توحید الہی کی نشرو اشاعت میں بالخصوص بہت سخت تھے اور اس میں کسی کی پروا نہ کرتے۔ اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک اساتذہ کا اثر اور دوسرے اپنے علاقے کا ماحول۔

ان کا زیادہ وقت تبلیغ و اشاعت میں گزرنا اور عام طور پر سفر میں رہنے تھے۔ نہایت منوکل علی اللہ تھے اور رضائے الہی ان کا شیوہ تھا۔ اس ضمن میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کانی عرصے کے بعد گھر لوٹے تو بیوی نے شکایت کی کہ گھر میں کھانے

پکانے کے لیے کچھ نہ تھا، اگر بھینس نہ ہوتی تو ہم جھوک سے مر جاتے۔ آپ کی غیر حاضری میں بھینس کے دودھ اور گھی کی فروخت سے گزر بسر ہوتی رہی۔ بیوی کے یہ الفاظ سنتے ہی پھرا پکڑا اور بھینس ذبح کر ڈالی۔ فرمایا دینے والا تو اللہ ہے، تم نے بھینس پر بھروسہ کیا، لو آج میں نے اسے ختم کر دیا۔

حق گوئی اور راست بازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حصار کا نواب آپ کے پاس آیا اور کہا ”آپ لوگوں کو فرقرار دیتے اور سخت زبان استعمال کرتے ہیں“ فرمایا ”جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اور شریعت کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہو سکتا“

نواب نے پوچھا: ”ایسا کون شخص ہے؟“
فرمایا: ”تم۔“
بولا: ”کیسے؟“

فرمایا ”شریعتِ اسلامی نے بیک وقت چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی، لیکن تم نے چار سے زیادہ رکھ رکھی ہیں۔“

نواب خاموش ہو گیا، واپس آکر درباری علما سے پوچھا تو انھوں نے مولانا نور محمد کی تصدیق کی اور کہا ”ہم نے آپ کے ڈر سے آپ کو صحیح مسئلہ نہیں بتایا“
نواب نے اسی وقت چار بیویوں کے علاوہ باقی سب کو کچھ روپے دے کر آزاد کر دیا۔ یہ ان کی حق گوئی اور زبان کی اثر آفرینی کی ایک مثال ہے۔
مولانا نور محمد نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ کلمہ حق ان کا اڑھنا بچھونا تھا، ہر مسئلہ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کرتے اور اس ضمن میں کسی بڑے سے بڑے شخص کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیتے۔

ان کی ایک عادت یہ تھی کہ کپڑے کھڑوں کو خوراک متیا کرتے اور غربا و مساکین کی جہاں تک ممکن ہو تا امداد فرماتے۔

وہ پنجابی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی تمام کتابیں مسائل شرعیہ اور احکام فقہیہ

پر مشتمل ہیں۔ زبان و اسلوب کے اعتبار سے نہایت عمدہ کتابیں ہیں، جن میں ادبیت کی چاشنی بھی ہے اور بے پناہ روانی بھی۔ انھوں نے اٹھارہ کتابیں تصنیف کیں جو پنجابی نظم میں ہیں۔ ہمیں ان کی صرف چھ کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ شہباز شریعت :- یہ ان کی مشہور کتاب ہے جو سات ہزار سے زائد اشعار پر محیط ہے۔ یہ کتاب انھوں نے

۱۸۳۵ء میں مکمل کی۔ کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ اس کے مضامین و محتویات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ پنجاب کے ممتاز عالم و فقیہ اور کتب کثیرہ کے مصنف حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر فارسی زبان میں حواشی تخریر کیے۔ حافظ صاحب مرحوم کی تصنیفات میں ابواب الصوفیہ، الوداع محمدی، احوال الآخرت اور زینت الاسلام وغیرہ کے علاوہ تفسیر محمدی بھی شامل ہے جو سات ضخیم جلدوں میں ہے اور پنجابی نظم میں ہے۔ پنجابی زبان میں قرآن مجید کی یہ پہلی تفسیر ہے۔

شہباز شریعت کے علاوہ مولانا نور محمد سوتری کی پانچ کتابیں یہ ہیں :-

۲۔ آپ حیات -

۳۔ چراغ شریعت -

۴۔ خورشید شریعت -

۵۔ مفاد شریعت -

۶۔ خطبات عیدین -

مولانا نور محمد سوتری کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ عصر کی نماز پڑھ کر گھر آئے اور وفات پا گئے۔ اس وقت ان کی عمر اسی برس کی تھی۔ مہینے کا تعین نہیں ہو سکا، البتہ سن وفات ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۲ء) کے لگ بھگ تھا۔

انھوں نے اٹھارہ کتابیں، چار بیٹے اور چار بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔

۱۵۶، ۱۵۵، ص ۱۵۶

و

۱۲۲۔ مفتی واجد علی بنارسی

تیسرے صدی ہجری کے علمائے بنارس میں مفتی واجد علی بن ابراہیم بن عمر فاروقی بنارسی بہت بڑے شیخ، فاضل اور علامہ تھے، منطق و فلسفہ اور فقہ و کلام میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ تھا۔ ان کے والد ابراہیم کا شمار بھی جید علما میں ہوتا تھا، لائق بیٹے نے باپ سے اور دیگر علمائے عصر سے کسبِ علم کیا اور مرتبہ عالی پایا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حکومتِ انگریزی کی طرف سے لکھنؤ کے منصبِ افتا پر فائز کیے گئے۔ یہ اہم خدمت نہایت حسن و خوبی سے انجام دی۔ پھر علاقہ بہار کے ایک شہر بیتا گئے اور اس نواح کے امیر نے ان کے علم و کمال کی وجہ سے ان کو بعض اونچے مناصب پر متعین کیا۔

مفتی واجد علی یوں تو تمام علومِ رسمہ میں اونچا مرتبہ رکھتے تھے لیکن فلسفہ و منطق میں اپنے اقران و معاصرین سے فائق تر گردانے جاتے تھے۔ دس و تدریس میں بھی اس نواح میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ الشفا، الافق المبین کی تدریس میں یگانہ روزگار تھے۔ قدیم و جدید حواشی و تعلیقات پر عمیق نظر تھی اور نہایت محنت سے کتابیں پڑھاتے تھے۔ عمر بھر مصروفِ دس و افادہ رہے اور لائق و علما و طلبانے ان سے استفادہ کیا۔

اس عالمِ اجل اور فقیہِ نامدار نے ۲۳۔ ربیع الاول ۱۲۶۶ھ کو جمعہ المبارک کے دن وفات پائی۔

۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۵۲۱ بحوالہ حیات سابق۔

۱۲۳۔ سید وحید الحق پھلواری

مولانا سید وحید الحق بن وجیہ الحق بن امان اللہ ہاشمی جعفری پھلواری کبار اساتذہ ہند میں سے تھے۔ صوبہ بہار کے شہر پھلواری میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بعض کتب و رسد اپنے والد گرامی مولانا وجیہ الحق سے پڑھیں اور مسطولات کا درس اپنے ماموں شیخ مبین جعفری سے لیا جو پھلواری میں اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے اور ۱۲۳۲ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔ علوم معقول و منقول کی تحصیل سے فارغ ہوئے تو خود مسند تدریس آراستہ کی اور طلباء کی بہت بڑی جماعت ان کے گرد جمع ہو گئی۔

بہت بڑے شیخ، صدق مقال و حسن اخلاق کے مالک، عمدہ نضال، شیریں کلام، عابد و زاہد اور متقی تھے۔ مشتبہات سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ حکومت انگریزی کے ملازموں اور خدمت گزاروں کے گھر کا کھانا نہ کھاتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں پیش پیش رہتے۔ محرم کے دنوں میں جو رسوم کی جاتی ہیں، اور عاشورہ کے موقع پر جو کچھ پکایا اور کھلایا جاتا ہے، اس سے لوگوں کو سختی سے روکتے۔ کسی معاملے میں تصنیح اور تکلف کا اظہار نہ کرتے، نہایت سادہ زندگی بسر کرتے، فقرا کا لباس پہنتے اور چٹائی پر بیٹھتے۔ کسی سلسلے میں دوسروں کو تکلیف میں مبتلا نہ کرتے۔ ابتدا میں غنا سے متنفر تھے اور فقہائے احناف کی طرح اس قسم کی مجالس میں نہ جاتے۔ لیکن بعد میں جب وجہ و حال کی کیفیت طاری ہو گئی تو مجالس سماع میں حاضر ہونے لگے تھے۔

درس و افادہ ان کا اصل مشغلہ تھا، لا تعداد لوگوں نے ان سے تحصیل کی اور خلق کثیر نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ ذوق تھا، کچھ کتابوں پر حواشی تحریر کیے اور بعض کتابیں تصنیف کیں۔

۱ - حوثی ہدایۃ الفقہ

۲ - فرة العاشقین فی حلیۃ سید المرسلین یعنی شرح شمائل ترمذی -

۳ - تعلیقات بر تفسیر بیضاوی -

۴ - زاد الاخرت -

۵ - شرح کلمہ طیبہ -

۶ - ذکر الصلوۃ -

۷ - رسالہ تحقیق الامیان -

علاوہ ازیں بعض مسائل فقہ سے متعلق کچھ رسالے تحریر کیے۔

مولانا وحید الحق پھلواروی نے ۲۲ - صفر ۱۲۰۱ھ کو سفر آخرت اختیار

کیا ہے

۱۲۴ - مولانا ولایت علی عظیم آبادی

عظیم آباد (پٹنہ) کے محلہ صادق پور کے اصحاب علم اور ارباب فضل نے اشاعت دین، تبلیغ اسلام اور ترویج کتاب و سنت کے سلسلے میں جو جنگ و تازکی وہ تیرھویں صدی ہجری کے خطہ ہند کی تاریخ علماء کا ایک درخشندہ باب ہے۔ غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ جنگ و جہاد میں بھی ان کی عزیمت و استقلال کے نقوش صفحہ تاریخ میں ہر اعتبار سے ابھرے ہوئے اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ مجاہدین کے عالی ہمت گروہ کے فرد فرید تھے جو دھبیال اور ننھیال کی طرف سے نہایت بااثر اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اپنے عہد کے شیخ و امام، عالم و محدث اور فقیہ و متکلم تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا فتح علی، دادا کا وارث علی اور پردادا کا محمد سعید تھا۔ کباباشمی تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) میں ان کے گھرانے کو امارت و ریاست

۲۷ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۸۸ - نزمۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۳ :-

کا درجہ حاصل تھا۔

مولانا ولایت علی کے اسلاف میں ایک بزرگ احمد علی تھے جو صوبہ بہار کے ضلع "گیا" کے ایک قصبے اردول کے قاضی تھے۔ اس خدمت کے صلے اور منصبِ قضا میں حسنِ کارکردگی کی بنا پر مغل بادشاہ کی طرف سے انہیں ایک بہت بڑی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ ولایت علی کے نانا، جن کی آغوشِ شفقت میں ان کی پرورش ہوئی، رفیع الدین حسن خاں تھے جو صوبہ بہار کے دولت مند اور باوجاہت رئیس تھے۔ وہ مغل حکمران کی طرف سے صوبہ بہار کے آخری گورنر تھے۔

ولایت علی اسی ماحول میں ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۶۹۰ء) کو پیدا ہوئے۔ مشہور کی آنکھیں وا ہوئیں تو حصولِ علم کا آغاز اپنے شہر (عظیم آباد) کے اساتذہ سے کیا۔ عظیم آباد اس زمانے میں پٹنہ کو کہا جاتا تھا جو صوبہ بہار کا دار الحکومت ہے، جب مقامی اساتذہ سے اخذِ علم کر چکے تو مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ کا عزم کیا جو اس زمانے میں علوم کا گہوارہ اور علما کا مرکز تھا۔ وہاں مولانا محمد اشرف لکھنوی کا ہنگامہ درس جاری تھا، ولایت علی اس میں شامل ہو گئے۔

ولایت علی چونکہ دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کا طرز زندگی دوسرے طلباء سے مختلف تھا۔ امیرانہ ٹھاٹھ، عمدہ لباس اور تمام شکرانے درس سے ممتاز اسلوبِ حیات۔

سید احمد شہید سے پہلی ملاقات

ان کے دورِ طالبِ علمی میں امیر المجاہدین سید احمد شہید لکھنؤ گئے تو ان سے پہلی ملاقات وہیں ہوئی اور گفتگو کا سلسلہ چلا تو فوراً ان کے حلقہٴ ادارت میں شامل ہو گئے۔ چند روز میں ظاہر و باطن کی کیفیت بدل گئی اور اسی قالب میں ڈھل گئے جس میں سید صاحب کے متعلقین و معتقدین ڈھلے ہوئے تھے۔ سید صاحب کے ہم رکاب ہو کر رائے بریلی کا قصد کیا اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی سے ربط و ضبط پیدا ہوا۔ ان سے بعض درسی کتابیں بھی پڑھنا شروع کیں۔ عبادتِ الہی اور تعلیم

کے بعد جو وقت پہنچا وہ ساتھیوں کی خدمت گزاری میں بسر ہونے لگا اور رتیبانہ انداز حیات کو ترک کر کے، درویشانہ اور فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ جنگل سے کڑیاں کاٹ کر لانے اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے لگے۔ کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں کوئی غار محسوس نہ کرتے۔

ایک عجیب و غریب واقعہ

تذکرہ صادقہ میں جس کا ایک نام ”الدار المنتور“ ہے، اس سلسلے کا یہ عجیب و غریب واقعہ مرقوم ہے کہ جب مولانا ولایت علی کے والد ماجد مولانا فتح علی کو پتا چلا کہ ان کا بیٹا سید احمد بریلوی کے ساتھ رائے بریلی چلا گیا ہے تو اس کے لیے ایک ملازم کے ہاتھ چار سو روپے اور کچھ کپڑے بھیجے۔ اس زمانے میں سید صاحب مہانوں کے لیے ایک مہمان خانہ تعمیر کر رہے تھے۔ تمام عقیدت مند اور خود سید صاحب مہمان خانے کی تعمیر میں مصروف تھے اور مختلف کام کر رہے تھے۔ مولانا ولایت علی ان بزرگوں میں شامل تھے جن کے ذمے گارا تیار کرنا تھا۔ ملازم رائے بریلی پہنچا اور سید صاحب کے ہاں گیا تو مولانا ولایت علی نے ایک موٹا سا کالے رنگ کا تہمند پہن رکھا تھا اور تمام جسم گارے میں لہٹڑا ہوا تھا۔ ملازم نے خود اپنی سے پوچھا کہ ”مولانا ولایت علی کہاں ہیں؟“ انھوں نے جواب دیا ”میں ہی ولایت علی ہوں۔“ وہ انھیں پہچان نہ سکا بلکہ اظہارِ خفگی کیا کہ ایک پردیسی کے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ مولانا اس سے باتیں کر رہے ہیں اور اسے یقین دلا رہے ہیں کہ میں ہی ولایت علی ہوں، لیکن وہ نہیں مانا۔ بالآخر انھوں نے کہا کہ اگر میری بات تمہیں صحیح معلوم نہیں ہوتی تو کسی اور سے پوچھ لو کہ میں کون ہوں۔ جب لوگوں نے یقین دلایا کہ عظیم آباد کا رئیس زادہ یہی ہے تو ملازم نادم بھی ہوا اور سخت حیران بھی۔ اس نے مولانا کو گلے لگا لیا، معافی مانگی اور ان کی حالت دیکھ کر رونے لگا۔ باپ کے بھیجے ہوئے روپے اور کپڑے ان کی خدمت میں پیش کیے تو انھوں نے پکڑ کر اسی طرح دونوں چیزیں سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں۔

تبلیغِ دین اور وعظ و ارشاد

کچھ عرصہ رائے بریلی گزارنے کے بعد مولانا ولایت علی وطن گئے تو اپنے آپ کو تبلیغِ دین اور وعظ و ارشاد کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی شبِ روز کی کوششوں سے ان کے خاندان کے تمام افراد اور اعزہ و اقربا سید صاحب کے حلقہٴ بیعتِ ارادت میں داخل ہو گئے، جن میں ان کے والد مولانا فتح علی اور بھائی مولانا عنایت علی، مولانا طالب علی اور مولانا فرحت حسین شامل ہیں۔ باقی اعزہ و اقربا میں سے مولانا شاہ محمد حسین، مولوی الہی بخش، مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا فیاض علی، مولوی قمر الدین، مولوی باقر علی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ غرض ان کے متعلقین میں سے تمام لوگ سید سے وابستہ ہو گئے اور ان کی عقیدت و ارادت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔ پھر ان حضرات نے تحریکِ مجاہدین اور تحریکِ وہابیت میں جو قربانیاں دیں اور جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اس موضوع کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ ان حضرات میں سے بعض کے کارنامے ”فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری“ کی جلد اول میں اور بعض کے ”فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری“ کی جلد دوم کے مقدمے میں بیان کیے جا چکے ہیں اور بعض کے زیر مطالعہ کتاب میں مرقوم ہیں۔

خدماتِ دینی کی وسعت

مولانا ولایت علی کی خدماتِ دینی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ابتدا میں سید احمد شہید کے ساتھ ہجرت کر کے بغرضِ جہاد سرحد گئے، لیکن سید صاحب نے ان کو اس لیے واپس بھیج دیا کہ حیدرآباد (دکن) جا کر دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دیں۔ اس نواح میں وہ تقریباً چار سال رہے اور خوب کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد بالاکوٹ کا واقعہ پیش آیا اور سید صاحب اور ان کے رفقاء جامِ شہادت نوش کر گئے۔ اپنی دوز مولانا ولایت علی کے والد مولانا فتح علی کا انتقال ہو گیا۔ پھر وہ مختلف مقامات سے ہوتے اور فریضہٴ تبلیغ انجام دیتے رہے

عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ کچھ مدت وہاں رہے۔ اس کے بعد بہار، بنگال، اڑیسہ اور
الا آباد میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم کیا۔ طریق تبلیغ یہ تھا کہ مولانا خود اور ان کے
مقرر کیے ہوئے داعی ایک ایک قریبے اور ایک ایک گاؤں میں جاتے ہمسلمانوں
کو پابند شریعت بناتے، مسجدیں آباد کرتے اور ارشاد و ہدایت کا مستقل سلسلہ
جاری کر دیتے۔

تذکرہ صادقہ میں اس ضمن میں بتایا گیا ہے۔

”اشاعتِ دین میں آپ کی ان تھک کوششوں میں غرب و شرق، شمال و جنوب، کل کو
محیط تھی جموں اور سیلوں (مثلاً بہار کا چراغاں) میں بھی بغرض تبلیغ و پند پہنچتے اور نور باؤں
کو گاہ میں جا کر اور کسانوں کو ان کے کھیتوں پر پہنچ کر اللہ کی اطاعت و بندگی کی ترغیب
دیتے اور ان کی بدزبانی اور عنیظ و غضب کو شربت کی طرح نوش کر جاتے۔ آپ اپنے
دوروں میں قریب قریب فرود کش ہوتے جاتے اور اللہ کی باتیں پہنچاتے جاتے، اسی لیے اپنی
قیام گاہ تک پہنچنے میں میزوں اور برسوں کی آپ کو دیر لگتی تھی۔“

تعلیم و تدریس

قیام وطن کے دوران میں باقاعدہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا اور نظر
سے عصر تک لوگوں کو قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ تذکرہ صادقہ میں
مرقوم ہے۔

”مولوی عبداللہ آپ کے خلفِ اکبر قاری ہوتے۔ دوسرے علما ایک ایک تفسیر پڑھتے
میں لے کر بیٹھتے۔ علما کے علاوہ مریدوں کی بڑی بھاری صف ہوتی۔ قرآن مجید اور طبع المراء
کا لفظی ترجمہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے تاکہ لوگ اللہ کی مرضی اور غیر مرضی
(یعنی امر و نہی) سے آگاہ ہو جائیں۔ ان پڑھ بھی نمازوں میں اپنے پڑھنے کی سورتوں اور

۱۷ سرگزشتِ مجاہدین، ص ۲۲۸

۱۸ تذکرہ صادقہ، ص ۱۶

دُعاؤں کے معانی اور مطالب سے خوب آگاہ ہوتے تھے۔“

یہ بھی منقول ہے کہ جب وطن میں اقامت گزریں ہوتے تو سہر منگل کے دن نمازِ مغرب کے بعد اپنے گھر میں وعظ کہتے۔ ایک جانب پانچ چھ سو عورتیں جمع ہوتیں، دوسری جانب پانچ چھ ہزار مرد۔ وعظ میں بہت تاثیر تھی، جو سنتا اس کی قلبی حالت بدل جاتی۔

وعظ کی اثر انگیزی

ان کا وعظ نہایت مؤثر اور پُر تاثیر ہوتا تھا۔ جو بات کہتے دل کی گہرائیوں میں اُترتی جاتی۔ ان کے مواعظ حسنہ سے بے شمار لوگوں نے بدعات و محدثات سے توبہ کی اور کتاب و سنت پر عامل ہوئے۔ اس عالمِ باعمل کے مواعظ کی اثر آفرینی کے بارے میں سید نواب صدیق حسن خاں تحریر فرماتے ہیں۔

”مولوی ولایت علی قنوج میں تشریف لائے میرے مکان پر آئے۔ اپنے اہل بیت کو واسطے ملاقات والدہ مرحومہ کے بھیجا۔ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کیا۔ مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب ”بلوغ المرام“ ضرور پڑھنا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا ہوں گا۔ جو اثر مربع میں نے وعظ مولوی ولایت علی مرحوم میں پایا، کسی کے وعظ میں دیکھا نہ سنا۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل دنیا سے بالکل سرور جاتا تھا اور دین کا جوش تہ دل سے اُٹھتا تھا۔“

کتبِ دینیہ کی اشاعت کا اہتمام

مولانا ولایت علی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تبلیغ و دعوتِ دین میں گزرتا تھا انہوں نے وعظ و تقریر کو بھی اپنا معمول ٹھہرایا اور کتبِ دینیہ کی طباعت و اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ اس کے لیے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا ترجمہ قرآن اور شاہ

۱۶ تذکرہ صادق، ص ۱۶ -

۱۷ البقاء المنین، ص ۱۲ -

شاہ محمد اسحاق دہلوی اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی کے رسائل منگوائے اور انہیں لکھنؤ کے مطبع حُینی سے چھپوانے کی کوشش کی، وہاں یہ نہ چھپ سکے تو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزمان بردوانی کو اس اہم اور بنیادی کام کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ مولوی صاحب مدوح نے دس ہزار روپے میں ٹاٹپ کا پریس خریدیا اور بہت سی دینی کتابیں اس میں چھاپ کر شائع کیں۔

حج بیت اللہ

مولانا نے حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا۔ بنگال کا دورہ کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ پھر بہار میں سید تذیر حسین محدث دہلوی کے شہر سورج گرھ گئے، وہاں وعظ و نصیحت کی، جس میں سید تذیر حسین بھی شامل ہوئے اور ان کے مواعظ سے بہت متاثر ہوئے۔ بعد ازاں اہل و عیال سمیت کلکتہ سے بذریعہ جہاز بمبئی پہنچے۔ دو مہینے وہاں قیام رہا۔ پھر حجاز تشریف لے گئے اور حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ وہاں مشہور محدث شیخ عبداللہ سراج سے سند حدیث حاصل کی شیخ موصوف نے سند دے کر فرمایا، "مولانا ولایت علی نے حدیث کے الفاظ کی سند مجھ سے لی اور معافی کی سند میں نے ان سے حاصل کی۔"

حج کے بعد وہ نجد، عمیر اور یمن گئے اور قاضی محمد بن علی شوکانی سے طے اور ان سے سند حدیث لی۔ اسی اثنا میں حضر موت، منا، حدیدہ، مسقط اور سوڈان کے شہر سواکن کا سفر کیا۔ پھر بذریعہ جہاز کلکتہ آئے اور دارِ وطن ہوئے۔

چھوٹے بھائی کا کردار

مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی تھے۔ وہ بھی سید احمد شہید سے بیعت تھے۔ وعظ و تبلیغ اور اشاعتِ دین کے بارے میں ان کا کردار بھی بہت اونچا تھا۔ وہ بھی علاقہ سرحد میں سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے گئے

تھے، انھیں بھی سید صاحب نے بنگال میں دعوت کے لیے مامور کر دیا تھا۔ ان کا مرکز دعوت ضلع جسیور میں موضع ”حاکم پور“ تھا۔ بہت سے لوگ ان کے معاون و مددگار تھے۔ جسیور، ندیا، فریدپور، راج شاہی، مالده اور بوگرا کے علاقے ان کی تبلیغی تنگ و تاز کے خاص مراکز تھے اور ان علاقوں کے بے شمار لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ پھر وہ اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی کی ہدایات کے مطابق یہ خدمت دینی سرانجام دینے لگے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جہاں جاتے، پہلے یہ دیکھتے کہ مسجد ہے یا نہیں، اگر ہوتی تو کسی مناسب آدمی کو امام مقرر کر دیتے، اگر نہ ہوتی تو مسجد تعمیر کرا دیتے۔ اس طرح انھوں نے بہت سی مسجدیں آباد کیں اور تعمیر کرائیں۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ امام مسجد کا کام صرف نمازیں پڑھانا اور دینی کتابیں پڑھانا ہی نہ تھا، بلکہ اپنے علاقے کے نزاعی معاملات کے فیصلے کرنا بھی اس کے ذمے تھا۔ سید صاحب اور ان کے اصحاب عقیدت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انگریزوں کی عدالتوں میں نہیں جانا چاہیے، اس سے دل سیاہ ہو جاتے ہیں اور ایسا کمزور

پڑ جاتا ہے۔
سکھوں کی باہمی کشمکش

مولانا ولایت علی اور عنایت علی بنگال میں سرگرم دعوت و تبلیغ بھی تھے اور ساتھ ہی ان علاقوں سے مجاہدین بھی تیار کر رہے تھے، اس لیے کہ ان کا اصل مقصد سرحد کے مرکز مجاہدین میں جا کر سکھوں سے جہاد کرنا تھا۔ اس ضمن میں وہ موقع کی تلاش میں تھے کہ جیسے ہی حالات سازگار ہوں، سلسلہ جہاد شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ وقت نے پٹا کھایا اور حالات سازگار ہوئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ رنجیت سنگھ نے تقریباً چالیس برس پورے پنجاب اور سرحد کے بعض علاقوں میں حکومت کی۔ ۱۸۳۹ء میں اس

کی موت واقع ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا کھڑک سنگھ تھا جو بالکل نا اہل تھا۔ باپ کی موت کے بعد وہ تخت نشین ہوا، لیکن ڈیڑھ سال بعد مر گیا۔ اس کا بیٹا نونہال سنگھ تھا جو اسی دن ایک حادثے کی تذر ہو گیا، جس دن اس کا باپ کھڑک سنگھ مرا تھا۔ رنجیت سنگھ کے خاندان میں نونہال سنگھ سب سے قابل آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جنوری ۱۸۴۱ء میں رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ نے مسز حکومت سنبھالی۔ یہ ستمبر ۱۸۴۳ء میں اجیت سنگھ سندھاں والیہ کے ہاتھوں قتل ہوا، اس کے نو عمر بیٹے کو بھی موت کے گھاٹ اتا رہا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سکھوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے کو دھڑا دھڑ قتل کر رہے تھے اور سکھ حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ بالآخر ۱۸۴۳ء میں رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے دلپ سنگھ کو گدی پر بٹھایا گیا جو اس وقت صرف چھ سال کا بچہ تھا۔ کاروبار حکومت چلانے کے لیے ایک کونسل بنا دی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود سکھوں کی باہمی کشمکش اور لڑائیوں کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ سکھوں کی آپس کی لڑائیوں کو روکنے کے لیے ان کے بعض سرکردہ لوگوں نے انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی تاکہ توجہ اُدھر مبذول ہو جائے۔ انگریزوں سے انھوں نے پے در پے شکستیں کھائیں اور آخر صلح پر مجبور ہو گئے۔ انگریزوں کو پنجاب کے بہت سے علاقے بھی دیے اور تاوان جنگ بھی ادا کیا۔

اس اثنا میں انگریزوں نے پورا کشمیر اور مزارے کا بالائی حصہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا، جس نے سکھوں اور انگریزوں کی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور اسے انگریزوں کا سپرد سمجھا جاتا تھا۔

اس کے بعد انگریزوں اور سکھوں کی ایک اور جنگ ہوئی، جس کے نتیجے میں سکھوں کے باقی ماندہ علاقوں پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور سکھوں کی عمل داری کے نقوش صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں پر یہ سکھوں کی پہلی اور آخری حکومت تھی جو رنجیت سنگھ کی موت کے بعد ان کی باہی

خون ریزیوں کی وجہ سے چند سالوں میں ختم ہو گئی۔

سکھوں کے خلاف ہنگامے

جب سکھ حکومت کے مرکز پنجاب میں ان کو پے در پے شکست ہونے لگی اور آپس کی لڑائیوں نے ان کو کمزور کر دیا تو سرحدی علاقوں میں بھی ان کے خلاف ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہزارہ اور کانغان میں بالخصوص ان کی مخالفت میں شدت پیدا ہوئی۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں کے باشندوں پر سکھوں نے اپنے دو حکمرانی میں سخت مظالم ڈھائے تھے اور ان کو ہر اعتبار سے مبتلائے اذیت کیے رکھا تھا۔ اب سکھوں کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑی تو انہوں نے علم بغاوت بلند کر دیا اور سرحد کے مختلف بلاد و قصبات کے رئیس اور بااثر لوگ میدانِ عمل میں نکل آئے۔ اس سلسلے کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ مسلمان موقع کی تلاش میں تھے، جوں ہی انھیں موقع ملا، وہ سکھوں پر چڑھ دوڑے اور ان کے بعض عمال کا مقابلہ کر کے ان علاقوں سے مار بھگا یا۔ بعض علاقوں میں مسلمانوں نے اپنے عامل اور سردار بھی مقرر کر لیے۔ ان آزاد کردہ مقامات کے سرداروں میں سے ایک بزرگ سید اکبر شاہ ستھانوی تھے۔

مولانا ولایت علی کو دعوت

ان منتخب اور مقرر کردہ روسا میں سے کچھ حضرات نے مولانا ولایت علی کو دعوت بھیجی کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور فضا سازگار ہے، آپ تشریف لائیں، جہاں کہیں سکھ موجود ہیں، ان کے خلاف جہاد کریں اور ان کو یہاں سے نکال کر اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کوشاں ہوں۔ مولانا ولایت علی اس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں کا تبلیغی اور دعوتی دورہ کر رہے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی نیگال میں سرگرم دعوت و ارشاد تھے۔ مولانا ولایت علی نے سرحد کے روسا کا پیغام سنتے ہی مولانا عنایت علی کو اطلاع بھیجی، انھیں سرحد کی صورت حال سے باخبر کیا اور کہلا بھیجا کہ وہ سرحد جائیں اور

وہاں جا کر سلسلہ جہاد کا آغاز کریں۔ وہ بھائی کا پیغام ملتے ہی دو ہزار مجاہدین کے ساتھ اپنے گھر عظیم آباد پہنچے۔ اس سے انگریزی حکومت کے ہندوستانی کارکنوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت مولانا ولایت علی بھی عظیم آباد میں تھے۔ انھوں نے مصلحت و احتیاط کے پیش نظر دو ہزار مجاہدین کی یہ جمعیت منتشر کر دی اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کی ٹولیاں بنا کر انھیں سرحد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کو سرحد روانہ کرنے کا آغاز جماد الاخریٰ ۱۲۵۹ھ (جولائی ۱۸۴۳ء) سے ہوا جو کچھ عرصہ جاری رہا۔ یہ لوگ ٹولوں کی صورت میں پھیلی پہنچے جو نواح ہزارہ میں واقع ہے ان کے سرکردہ اور معروف حضرات میں سے مولانا عنایت علی، مولانا ولایت علی کے بیٹے مولانا عبداللہ، میرا اولاد علی سورج گڑھی، مولوی مقصود علی، مولوی کریم علی اور مولوی زین العابدین قابل ذکر ہیں۔

بالاکوٹ پر قبضہ

ان ہندی مجاہدین نے وہاں پہنچتے ہی مقامی لوگوں سے رابطہ پیدا کیا جو پہلے سے ان کے انتظار میں تھے اور جن کی دعوت پر یہ وہاں پہنچے تھے۔ سب نے مل کر جہاد شروع کر دیا، کاغان اور ہزارہ کے مختلف علاقوں کے لوگ ان کے معاون اور رفیق جہاد تھے۔ مجاہدین نے اس قدر شدید حملے کیے کہ شکپاری، بیرکھنڈ، گڑھی حبیب اللہ خاں اور اگرور کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے محافظ دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ان فتوحات کا دائرہ یہاں تک پھیلا کہ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) میں مجاہدین بالاکوٹ پر قابض ہو گئے اور اسی مقام پر انھوں نے مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو اپنا باقاعدہ امیر جہاد بنا لیا۔ بالاکوٹ کے آس پاس کے علاقوں کو بھی سکھوں کے قبضے سے آزاد کرانے کا عہد کیا اور اس کے لیے زبردست جہاد کا آغاز کر دیا گیا۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی، مولانا اسماعیل دہلوی اور ان کے بہت سے رفقاء نے

سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے شہادت پائی تھی، اس سے ساڑھے چودہ سال بعد اسی میدان میں مجاہدین نے سکھوں کو قتل کیا، انھیں شکست دی اور ان کے مقبوضہ علاقے پر قابض ہوئے۔

سکھوں کے علاوہ کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں نے بھی مسلمانوں کو نشانہ ستم بنایا تھا اور اب وہ کئی مسلمان علاقوں پر تسلط چلانے کی فکر میں تھے۔ مجاہدین نے ان سب کا مقابلہ ضروری سمجھا اور سب کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا۔ مسلمانوں نے تمام اہم مقامات پر سکھوں سے جنگ لڑی اور جنگی ذمیت کے ہر علاقے میں انھیں ہزیمت سے دوچار کیا۔ گڑھی حبیب اللہ کو مسخر کیا، منظر آباد پر یورش کی، فتح گڑھ میں ان سے برسریا ہوئے، غرض ہر جگہ ان پر تلوار اٹھائی اور انھیں اس درجے سے اسیر کی اور پریشانی میں مبتلا کر دیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ کہیں بھی جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

مسلمانوں کا نظم و نسق

سکھوں کے جو علاقے مجاہدین نے فتح کیے ان میں خالص اسلامی ذمیت کا نظام قائم کیا، حدود و احتساب کا سلسلہ شروع کیا، انسدادِ جرائم کو اولین حیثیت دی، نماز باجماعت کی پابندی عاید کی۔ جو شخص کسی عذر شرعی کے بغیر باجماعت نماز ادا نہ کرتا اس سے جرمانہ وصول کیا جاتا، عام لوگوں سے پانچ سیر غنہ اور امیروں سے ایک روپیہ فی کس لیا جاتا۔ نماز جمعہ میں کوتاہی کرنے والوں کے لیے بھی سزائیں مقرر تھیں۔ ڈاکوؤں کو قتل کی سزا دی جاتی، جو لوگ شادی اور غمی کے مواقع پر غیر شرعی حرکات کے مرتکب ہوتے، ان سے بھی جرمانہ لیا جاتا، جگہ جگہ مفتی مقرر کر دیے گئے تھے۔ بالا کوٹ میں خدمتِ افتا پر مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی مامور تھے۔ درہ کنہار میں بلا میر اسداخوندزادہ کو احتساب اور افتا کا کام سونپا گیا تھا۔ ان کے ماتحت بہت سے علماء مقرر تھے جو دیہات میں دوکے کرتے اور بے نمازوں کو نماز کی تعلیم دیتے تھے۔ محمد حی اخوندزادہ علاقہ درہ کنہار کے قاضی

تھے۔ محمد حسین اتو نڈزادہ پھلی میں وعظ و نصیحت کی خدمت انجام دینے پر مامور تھے۔

عرض اس مغتوحہ علاقے میں مسلمانوں نے باقاعدہ حکومت قائم کر لی تھی جو کتاب و سنت کے مقرر کیے ہوئے خطوط کے مطابق تھی۔ خراج وغیرہ کا نظام بھی جاری کر دیا گیا تھا۔ مرکز کے تعلقات

اس حکومت کا مرکز فتح گڑھ تھا جو سکھوں سے جنگ کر کے بزورِ شمشیر فتح کیا گیا تھا۔ مولانا عنایت علی جو اس حکومت کے سربراہ تھے، فتح گڑھ میں اقامت گزری تھی اور اس کا نام بدل کر اسلام گڑھ رکھ دیا گیا تھا۔ علاقے کے سرداروں اور خزانین کو مشیر مقرر کیا گیا تھا جن سے جہاد کے متعلق مشورے لیے جاتے تھے۔ کابل سے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد انگریزوں نے علاقہ کشمیر سکھوں سے چھین کر گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کیا تھا، اس وقت سکھ حکومت کی طرف سے کشمیر کا گورنر نواب شیخ امام الدین تھا۔ وہ ایسا بہادر اور جرات مند تھا کہ اس نے ابتدا میں گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور مولانا عنایت علی عظیم آبادی سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔

اس زمانے کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب مولانا غلام رسول مہر کو مولانا مسعود عالم ندوی نے دیا تھا جو انھوں نے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) سے حاصل کیا تھا۔ یہ مکتوب ۹۔ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ (۲۹۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کا مرقومہ ہے۔ اس میں محرم ۱۲۶۲ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) سے شوال ۱۲۶۲ھ (اکتوبر ۱۸۴۶ء) کے حالات جہاں

قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ مکتوب کسی مجاہد نے ہندوستان کے کسی شخص کو بھیجا تھا اس میں بہت سی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو کسی کتاب میں درج نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سرگزشت مجاہدین" میں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے واقعات و حالات کے ضمن میں اس مکتوب کے متعدد حوالے دیے ہیں۔ مکتوب میں بیان کیا گیا ہے :

صوبہ دار کشمیر شیخ امام الدین بہ کمال تمنا راہ موافقت پیمودہ برائے ارسال خطوط جوڑی ہر کارہ مقرر نمودہ۔ چنانچہ در سہ ماہ دو سہ خط شیخ موصوف متضمن کلام محبت و دوستی می رسد۔

یعنی کشمیر کے صوبے دار شیخ امام الدین نے اپنی ولی خواہش سے موافقت کا راستہ پیدا کیا اور ارسال خطوط کے لیے ہر کدوں کی جوڑی مقرر کر دی۔ چنانچہ ہر مہینے اس کی طرف سے دوستی اور محبت کے دو تین خطوط آجاتے ہیں۔

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ نواب امام الدین جو کشمیر کا گورنر تھا، مولانا عنایت علی عظیم آبادی سے انتہائی عقیدت و احترام کا تعلق رکھتا تھا اور اس کا ان سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ بھی مرقوم ہے کہ مجاہدین نے نواب شہر کا قلعہ فتح کیا تو اس پر توپیں سر کی گئیں۔ شیخ نواب امام الدین کے پاس قاصد یہ خبر لے کر گیا تو اس نے قاصد کو بہت سا انعام دیا۔

فرماں روانے کابل امیر دوست محمد خاں اور اس کے بیٹے محمد اکبر خاں غازی سے بھی مولانا عنایت علی اور مجاہدین نے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ بلکہ مذکورہ غیر مطبوعہ مکتوب میں یہاں تک بتایا گیا ہے کہ کابل کے حکمران نے امداد و رفاقت کے عہد نامے لکھ بھیجے تھے۔

مولانا ولایت علی کی آمد

ان سازگار اور معاون حالات میں ۱۷ شوال ۱۲۶۲ھ (۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء)

نئے بچہ سرگزشت مجاہدین، ص ۲۵۰

کو مولانا ولایت علی اچانک علاقہ مجاہدین میں تشریف لائے۔ اس غیر مطبوعہ مکتوب میں جس کا حوالہ گزشتہ سطور میں دیا گیا ہے، مولانا ولایت علی کی آمد کے بارے میں لکھا ہے :

مرشدنا و امیرنا مولوی ولایت علی صاحب ادام اللہ برکاتہ، والوارہ مع تمام اہل قافلہ و آلات و اسباب و خیل و دواب محض از فضل رب الارباب از میان ہجوم اعدایہ عاقبت تمام بہ حکومت اہل اسلام جلوہ افروز شدہ، موجب حیرت خویش و بیگانہ و ظور آئیہ حافظ یگانہ گشتند۔

یعنی ہمارے مرشد اور امیر مولوی ولایت علی صاحب (خدا ان کے برکت و الوارہ کو دوام بخشے) اہل قافلہ، ہتھیاروں، اسباب، گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ اہل اسلام کے دائرہ حکومت میں جلوہ افروز ہوئے۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ وہ دشمنوں کے ہجوم سے سلامت گزر آئے۔ اس پر اپنے اور بیگانے ہر ایک کو حیرت ہوئی اور اس واقعے کو حافظ حقیقی کے نشان کا ظہور سمجھا گیا۔

مولانا ولایت علی کا شاہانہ استقبال کیا گیا اور جہاں گئے ان کے اعزاز میں توپیں اور بندوقیں چلائی گئیں۔ مانسہرہ سے چند میل کے فاصلے پر مقام اتر شیشہ میں دونوں بھائیوں — مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی — کی ملاقات ہوئی، اس وقت ہزاروں سپاہی اور مجاہد موجود تھے جو خوشی سے بندوقیں اور قراہینیں چلا رہے تھے۔ یہ ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ دونوں بھائیوں کی ملاقات مشکل ہو گئی آخر بڑی کوشش سے لوگوں کو دور مٹایا گیا تو بھائیوں کی ملاقات کی صورت پیدا ہوئی۔ ملاقات کے موقعے پر دونوں بھائیوں اور لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوئی۔ اس کا ذکر غیر مطبوعہ مکتوب میں اس طرح کیا گیا ہے :

ہردو برادر از فراغ معالقتہ و مصافحتہ با خود در میان ہمیں میدان سر بزین

نہادہ تا دیر و طیفہ شکر و سپاس رب العالمین بجا آوردند و تمامی لشکر بہ سجود رفت
و حمد و ثنائے آن و اسب العطیات بسیار از بسیار گفتند^۲

مصافحے اور معانقتے کے بعد دونوں بھائی اسی میدان میں زمین پر پیشانی رکھ کر
دیر تک جہانوں کے پروردگار کا فریضہ شکر ادا کرتے رہے۔ تمام لشکر بھی سجدے میں گر
گیا اور سب دیر تک خدا کی حمد و ثنا کرتے رہے۔

اتریشیشہ میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد دونوں بھائی اسلامی حکومت
کے مرکز اسلام گڑھ پہنچے۔ یہ شام کا وقت اور اتوار کا دن تھا۔ تاریخ ۱۹ شوال
۱۲۶۲ھ (۱۱ اکتوبر ۱۸۴۶ء) تھی۔ یہاں بھی ان کا خوب استقبال ہوا۔

۲۴۔ شوال ۱۲۶۲ھ (۱۶ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو جمعے کا دن تھا کہ
مولانا عنایت علی نے مجاہدین اور اسلامی حکومت کی امارت و سیادت کا تمام
کار و بار مولانا ولایت علی کے سپرد کر دیا۔ مولانا ولایت علی کو اپنے چھوٹے
بھائی مولانا عنایت علی کی محنت و مستعدی اور انتظام و انصرام کا پورا اندازہ
ہو چکا تھا۔ اس پر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس ضمن میں فارسی مکتوب کے
الفاظ ملاحظہ ہوں:-

در مجلس جمعہ بعد از گرفتن بیعت امارت بہ آواز بلند فرمودند کہ برادر خرد
را از طرف خود رئیس جملہ مجاہدین نمودم و انتظام کار و بار بہ دستور قدیم سپرد۔ برادر
خرد ساختم۔

یعنی جمعے کی مجلس میں بیعت کے بعد مولانا ولایت علی نے بلند آواز سے فرمایا کہ میں
اپنی طرف سے چھوٹے بھائی کو مجاہدین کا سالار بناتا ہوں اور سب انتظامات سابقہ
دستور کے مطابق ان کے حوالے کرتا ہوں۔

بہر حال مولانا ولایت علی کے سرحد پہنچتے ہی مولانا عنایت علی نے جہاد او

مجاہدین کے جملہ انتظامات ان کے حوالے کر دیے، معاملات حکومت بھی انہی کے سپرد ہوئے اور مجاہدین نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کر لی۔ یہ حضرات بالاکوٹ بھی گئے۔

کامیابی کے بعد ناکامی

مولانا ولایت علی کی سرحد آمد پر پورے تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ ”درہ ڈوب“ کی جنگ کا واقعہ پیش آ گیا۔ مجاہدین کے لیے اس جنگ کا نتیجہ نہایت الم ناک نکلا۔ کئی سال کی بھاگ دوڑ اور جاں فشانی سے جو مرکز بنایا تھا وہ ختم ہو گیا اور قیام و سکونت کے لیے کوئی جگہ ان کے پاس باقی نہ رہی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی کامیابی کیوں اچانک ناکامی میں بدلی اور ہزارہ میں انہوں نے اسلامی حکومت کی جو تاسیس کی تھی وہ کس بنا پر آنا فنا اہندام پذیر ہوئی؟

صورتِ حال پر ایک نظر

اس کو سمجھنے کے لیے صورتِ حال پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

انگریزوں نے سکھوں سے پہلی جنگ کے بعد دو آبہ بست جالندھر لے لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سکھوں کی حکومت پر ٹوڑھ کر وڑے تھے تاوان جنگ عائد کیا تھا۔ لاہور کے خزانے میں سکھوں کے پاس چونکہ اتنی بڑی رقم نہ تھی، لہذا فیصلہ ہوا کہ دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان کشمیر اور بالائی ہزارہ سمیت جو کوہستانی علاقے ہیں، وہ ایک کروڑ روپے کے معاوضے میں انگریزوں کے حوالے کر دیے جائیں۔ اس علاقے میں جو خطے دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں واقع تھے، وہ پچھتر لاکھ روپے میں گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے۔ ان میں جموں اور کشمیر کا علاقہ بھی شامل تھا اور بالائی ہزارہ کا بھی۔ جب سکھوں کی مرکزی حکومت میں کشمکش اور خلفشار اُبھرا اور انگریزوں سے جنگ شروع ہوئی تو اس زمانے میں علاقہ ہزارہ میں سکھوں سے حصولِ آزادی کی دوزبردست تحریکیں شروع ہوئیں۔ ایک زیریں ہزارہ میں اور

ایک بالائی ہزارہ میں۔ یہ دونوں تحریکیں کامیابی سے ہم کنار ہوئیں۔ زیریں سزاؤ کا علاقہ سکھوں سے آزاد کیا گیا تو اس کا بادشاہ اکبر شاہ ستھانوی کو بتایا گیا، جس نے اس کے نظم و نسق کو بہترین طریقے سے چلانا شروع کیا۔ بالائی ہزارہ کا علاقہ سکھوں سے چھینا گیا تو اس کے قائد و امیر مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو مقرر کیا گیا۔ اس کی سرحدیں مانگی سے شروع ہو کر مشرق میں مظفر آباد اور شمال میں کاغان تک چلی گئی تھیں۔ یہ تمام علاقے مقامی خوانین اور مجاہدین کے قبضے میں تھے اور ان کا نظام حکومت نہایت کامیابی سے چل رہا تھا۔

پچیدگی

یہاں ایک عجیب و غریب پچیدگی پیدا ہوئی، جس میں تین فریق ملوث تھے اور

وہ تھے :

۱۔ انگریز۔

۲۔ سکھ اور

۳۔ گلاب سنگھ ڈوگرہ۔

اس نواح میں سکھوں کے پاس کوئی قابل ذکر علاقہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہزارے کا بالائی حصہ راجا انھوں نے ایک معاہدے کے تحت انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا اور انگریزوں نے اسے کشمیر سمیت گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ مجاہدین کے قبضے میں چلا گیا تھا اور اس کا نظم و نسق مولانا عنایت علی عظیم آبادی کے ہاتھ میں تھا۔ زیریں حصے پر مقامی خوانین قابض ہو چکے تھے اور ان کی حکومت قائم ہو گئی تھی، جس کا سربراہ سید اکبر شاہ ستھانوی کو بنا لیا گیا تھا۔

گلاب سنگھ ڈوگرہ کی پوزیشن یہ تھی کہ اس نے پچتر لاکھ روپے ادا کیے لیکن اسے نہ کشمیر کا قبضہ ملا اور نہ بالائی ہزارہ اس کے ہاتھ آیا۔ کشمیر کا قبضہ اسے شیخ نواب امام الدین دینے کو تیار نہ تھا جو سکھوں کی طرف سے کشمیر کا گورنر تھا اور ہزارے کے بالائی حصے پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا تھا۔

اس کے حامی ہوں گے۔ اس نے انگریزوں کی بات ماننے سے تو انکار کر دیا لیکن اپنے دوست ملک فتح خاں ٹوانہ کے سامنے جھک گیا۔ اگر ملک مذکورہ بیچ میں نہ پڑتا اور قبضے کے سلسلے میں کوشاں نہ ہوتا تو اغلب ہے لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی اور کشمیر کی تاریخ شاید کچھ اور ہی رخ اختیار کر لیتی۔ ملک فتح خاں ٹوانہ پنجاب کے انگریزی عہد کے آخری وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کے دادا تھے۔ ادھر ایبٹ صاحب کی کوششوں سے زیریں ہزارہ کے خواتین نے بھی اپنے مفتوحہ اور مقبوضہ علاقے سے دست کش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور کچھ جاگیریں اور مراعات لے کر یہ علاقہ سکھوں کے حوالے کر دیا اور وہاں سکھوں کی حکومت بحال ہو گئی۔

اب مجاہدین تنہا میدان میں رہ گئے تھے جو بالائی ہزارہ پر قابض تھے اور جہاں کے امیر مولانا عنایت علی عظیم آبادی تھے۔ انگریز، سکھ اور گلاب سنگھ ڈوگرہ تو پہلے سے ان کے مخالف تھے، درپیش حالات میں اس علاقے کے سرکردہ لوگ اور خواتین بھی ظاہر ہے، ان کی زیادہ حمایت کرنے کی حیثیت میں نہ رہے تھے۔ یہ تھے وہ حالات و واقعات جن کے نتیجے میں مجاہدین شکست کھا گئے۔

درہ ڈب کی جنگ

درہ ڈب ایک مشہور درہ ہے جو گڑھی حبیب اللہ خاں اور مظفر آباد کے درمیان پڑتا ہے۔ اس کی بلندی کم و بیش پانچ ہزار فٹ ہے۔ اس کے مشرق میں کچھ فاصلے پر پیر چناسی پہاڑ ہے جو ڈب سے کافی بلند ہے۔ اسی پہاڑ کے جنوب مغربی دامن میں دریائے کشن گنگا کے کنارے مظفر آباد واقع ہے جو آزاد کشمیر کا دار الحکومت ہے۔ ڈب کے شمال میں کوہ سری کوٹ ہے، جس کی اونچائی سات ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ پھر بالاکوٹ کے سامنے تک ایک پہاڑی سلسلہ چلا گیا ہے۔ موجودہ جغرافیائی لحاظ سے ڈب صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ اور آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد کی درمیانی حد پر واقع ہے۔

ان اہم معاملات کا تیسرا فریق انگریز تھا۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کے ہاتھ کشمیر فرخت کیا تھا اور انگریزوں نے ہی ہزارے کا بالائی حصہ اسے دیا تھا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کا سکھوں سے معاہدہ بھی تھا کہ سرحد میں ان کے جو باقی مقبوضات ہیں وہ انہی کے پاس رہیں گے لیکن اب معاملہ بالکل اُلٹ ہو گیا تھا۔

یہ مسئلہ نہایت پیچیدگی اختیار کر گیا تھا اور مذکورہ تینوں فرقی اس سے بہت پریشان تھے۔ بالآخر انگریز میدان میں آئے ایک طرف ایبٹ صاحب کو ہزارہ بھیجا گیا کہ وہ کسی طرح زیریں ہزارہ پر قابض خوانین اور ان کے معاونوں کو اس علاقے سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرے۔ دوسری طرف ہنری لارنس جو دربار لاہور میں ریذیڈنٹ کے عہدے پر متمکن تھا، خود فوج لے کر جموں پنچاؤں سے اس نے ہریٹ ایڈورڈز کو کشمیر کے گورنر نواب شیخ امام الدین کے پاس بھیجا تاکہ براہ راست گفتگو کر کے کشمیر کا قبضہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کو دیا جائے ہریٹ ایڈورڈز کو معلوم تھا کہ ملک فتح خاں ٹوانہ ایک ایسا شخص ہے جو امام الدین کا جگہی دوست ہے۔ چنانچہ اس نے ملک فتح خاں ٹوانہ کو ساتھ لیا اور کشمیر جا کر امام الدین سے گفتگو کی۔ امام الدین اپنے اس دوست کے سامنے جھک گیا اور اس کی کوششوں سے کشمیر کا قبضہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کو دے دیا۔ امام الدین نے یہ راز بھی فاش کر دیا کہ اس کو لاہور کے سکھ دربار نے ہدایت کی تھی کہ کشمیر کا علاقہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے حوالے نہ کیا جائے۔ اس کا ردوائی کا ذمے دار لال سنگھ وزیر تھا، جس کے خلاف لاہور میں مقدمہ چلا اور اسے وزارت سے علیحدہ کر کے جلا وطن کر دیا گیا۔ بلاشبہ کشمیر کا گورنر شیخ نواب امام الدین جرأت مند اور جسور آدمی تھا اس نے یوں ہی کشمیر کا قبضہ دینے سے انکار نہیں کیا ہوگا، کشمیر کی فوج اور عوام و خواص

جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں، اس میں انگریزوں کے ہاتھوں سکھوں کی شکست اور اس کے نتیجے میں کچھ علاقوں پر انگریزوں کے قبضے کے بعد دونوں فریقوں میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ جو علاقے سکھوں کے پاس ہیں وہ انہی کے قبضے میں رہیں گے۔ انگریز سکھوں کو فوجی تربیت دیں گے اور کسی سے لڑائی کے وقت ان کی مدد کریں گے۔ گلاب سنگھ ڈوگرہ کی امداد کا وعدہ بھی انگریزوں نے کر لیا تھا اور یہ طے پا گیا تھا کہ ہزارے کا بالائی علاقہ جو مجاہدین کے قبضے میں ہے، اسے فتح کر کے گلاب سنگھ کی تحویل میں دیا جائے گا۔

یہ ذہن میں رہے کہ اس وقت تین طاقتیں مجاہدین کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ انگریز، سکھ اور گلاب سنگھ ڈوگرہ۔ نواب شیخ امام الدین کو مجبور کرنے پر کشمیر گلاب سنگھ کے تسلط میں آ گیا تھا اور وہاں کی فوج اس کے ہاتھ میں تھی۔

ان حالات میں سکھوں کی ایک فوج جو دس رجمنٹوں پر مشتمل تھی، سری نگر سے مظفر آباد کے راستے بالائی ہزارہ پہنچی تاکہ اس علاقے کو فتح کر لیا جائے۔ اس فوج کا کمان دار دیوان کرم چند تھا۔ انگریزی فوج اور اس کے بڑے بڑے افسر بھی اس کے ساتھ تھے۔ ۶۔ جنوری ۱۸۴۷ء کو درہ دُت میں اس کا مقابلہ مجاہدین سے ہوا۔ مجاہدین کی تعداد بہت کم تھی اور ادھر گلاب سنگھ ڈوگرہ اور سکھوں اور انگریزوں کا زبردست لشکر ان کے مقابلے میں کھڑا تھا۔ نتیجتاً مجاہدین کو شکست ہوئی اور حرلیت جیت گیا۔ جھڑپوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ لیکن حالات بالکل بدل چکے تھے اور مجاہدین کی کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی۔ دشمن ہزارے کی تمام وادلوں پر قابض ہو چکا تھا۔

مولانا ولایت علی اور عنایت علی کے چھلکے

مجاہدین کے امیر مولانا عنایت علی تھے، ان کے بڑے بھائی مولانا ولایت علی بھی ان کے ساتھ تھے۔ انگریزی سرکار کی نگرانی میں دونوں بھائیوں کو اس علاقے سے

سے نکال کر ان کے وطن عظیم آباد روانہ کر دیا گیا اور دونوں سے دس دس ہزار روپے کے چمکے لیے گئے۔ دو سال کے لیے انگریزی حکومت نے انہیں عظیم آباد رٹنہ میں پابند کر دیا اور حکم جاری کیا کہ اس مدت کے اختتام سے پہلے وہ شہر سے باہر نہیں نکل سکتے۔

آزادی کے بعد مستقل ہجرت

دو سال بعد جولائی یا اگست ۱۸۴۹ء میں محکموں کی مبعاد ختم ہوئی اور انہیں آزادی ملی۔ ۱۳۔ شوال ۱۲۶۵ھ (یکم ستمبر ۱۸۴۹ء) کو مولانا ولایت علی مستقل طور پر وطن سے ہجرت کر کے سرحد روانہ ہو گئے۔ مولانا یحییٰ علی اور چند احباب ان کے ساتھ تھے۔ مولانا عنایت علی ان دنوں بنگال گئے ہوئے تھے، انہیں بھی پیغام بھیجا کہ سرحد پہنچ جائیں۔

دہلی میں قیام اور بادشاہ سے ملاقات

سرحد جاتے ہوئے مولانا ولایت علی مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے دہلی آئے تو مسجد فتح پوری کے قریب ایک مکان میں ٹھہرے۔ دہلی میں وعظ و نصیحت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مغلوں کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اس زمانے میں دہلی کا بادشاہ تھا۔ اس کی بیگم نواب زینت محل کے استاد مولوی امام علی اور معروف شاعر حکیم مومن خاں مومن ان کے وعظوں میں شریک ہوتے رہے۔ مولوی امام علی نے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی انہوں نے بیگم زینت محل اور بادشاہ سے مولانا کے تدین و تقویٰ اور وعظ کی اثر آفرینی کا ذکر کیا۔ بیگم اور بادشاہ نے دعوت نامہ بھیج کر مولانا کو قلعہ معلیٰ میں بلا دیا۔ مولانا پچھراؤ میں کے ساتھ قلعے میں پہنچے۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر لب فرش تک آپ کا استقبال کیا۔ مصافحہ و معالقات کے بعد اپنے ساتھ بٹھایا، عطر اور پان سے تواضع کی۔ مولانا نے وعظ شروع کرتے وقت یہ آیت پڑھی جو سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۰ ہے:

يَسْلَمُوا مِنَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهُمْ وِزِيَةٌ وَّلِقَاخِرُ

رسالہ ردّ شرک۔۔ فارسی

رسالہ عمل بالمحدث۔۔ فارسی

رسالہ تیسیر الصلوٰۃ۔۔ اردو

رسالہ شجرۃ باثمرہ۔۔ اردو

رسالہ تبیان الشریک۔۔ اردو

رسالہ دعوت۔۔ یہ رسالہ بھی اردو میں ہے۔ مولانا ولایت علی کا یہ عقیدہ

تھا کہ سید احمد بریلوی شہید نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں۔ اس رسالے میں یہ عقیدہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ صحیح نہ تھا۔ لیکن ہمیں ان کے محاسن ہی کو پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔ ان کی لغزشوں اور کمزوریوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔

وفات

ولایت علی نے سرحد پہنچ کر سقانیہ کو اپنا مرکز بنایا اور انتظامی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ پہلا تمام سلسلہ ختم ہو چکا تھا، دوسری مرتبہ لوگوں کو جمع کرنے اور مجاہدین کی جمعیت فراہم کرنے کا کام بہت مشکل اور صبر آزما تھا، لیکن مولانا مڈوح اس میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے۔ انھوں نے درس قرآن و حدیث کا حلقہ بھی قائم کیا۔ لوگوں کو مراقبہ و مشاہدہ کی بھی تلقین کرنے لگے اور فن سپاہ گری کی تعلیم بھی ضروری قرار دی۔

ان کو سقانیہ آتے اور اپنا کام شروع کیے بیس مہینے گزرے تھے کہ ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵۔ نومبر ۱۹۵۲ء) کو خناق کے عارضے سے وفات پا گئے اور اپنے مرکز کے قبرستان میں دفن ہوئے، کل چونسٹھ سال عمر پائی۔

تذکرہ صادق کے مطابق ان کا حلیہ یہ تھا۔۔

میانہ قامت مائل بہ طول، رنگ سالولا، جسم بلغمی اور چر گوشت، ابرو پیوستہ، ڈاڑھی اوسط درجے کی۔

مولانا عنایت علی جو بعض امور میں مولانا ولایت علی سے اختلاف کی بنا پر منگل متخانہ چلے گئے تھے، بھائی کی وفات کے بعد مجاہدین کے مرکز ستخانہ آئے تو ۴ — صفر ۱۲۶۹ھ (۱۷ — نومبر ۱۸۵۲ء) کو سب نے متفقہ طور پر

ان کو اپنا امیر بنالیا۔

کشف قبر کے ایک ماہر کا بیان

مولانا غلام رسول مہرنے مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے بارے میں کشف قبر کے ایک ماہر کا واقعہ بیان کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے مولانا مہر لکھتے ہیں :

مولانا سید عبد الجبار شاہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب صوات کی سلطنت چھن گئی اور میں ستخانہ واپس آیا تو ایک صاحب ملنے کے لیے آئے، جنہیں کشف قبر میں مہارت حاصل تھی۔ میں انہیں مجاہدین کے قبرستان میں لے گیا اور مولانا ولایت علی کی قبر کے پاس بٹھا کر کہا کہ فرمائیے یہ کون صاحب ہیں اور ان کا حلیہ کیا ہے۔؟ وہ تقریباً آدھ گھنٹہ مراقب رہے، پھر اٹھے تو مجھ سے کہا کہ آؤ چلیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ صاحب قبر تھے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ راتے میں مجھے بتایا کہ یہ بزرگ سرحد کے منہیں، ہندوستان کے ہیں اور ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ میں نے حلیہ پوچھا تو کہا کہ رنگ سالوا ہے اور ڈاڑھی کے بال رخساروں پر کم ہیں، ٹھوڑی پر زیادہ — عرض جو حلیہ بتایا، وہ مولانا کے فرزند ان گرامی مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالکریم سے خاصا مشابہ تھا، لہذا یقین ہو گیا کہ صاحب کشف کا بیان درست ہے۔“

۱۲۵ — مفتی ولی اللہ فرخ آبادی

فرخ آباد (لوپی) کے اصحاب علم میں سید مفتی ولی اللہ بن سید احمد علی حسینی

اپنے گرو و پیش میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے شیخ و عالم اور
فقہ تھے۔ اعمال فرخ آباد میں ایک گاؤں کا نام "سانڈی" ہے، وہاں جمعے کے
دن ۱۰۔ شوال ۱۱۶۵ھ کو پیدا ہوئے۔ صغیر سنی ہی میں اپنے والد مکرم سید احمد علی
کے ساتھ فرخ آباد چلے گئے تھے، اور وہاں کے علما سے کسبِ علم کا آغاز کیا۔ اس کے
بعد قنوج گئے۔ قنوج میں مولانا عبدالباسط قنوجی کا سلسلہ درس جاری تھا، اس
میں شامل ہوئے اور تمام کتبِ درسیہ کی تکمیل انہی سے کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے ۱۱۸۹ھ کو حرمین
شریفین کا عزم کیا اور حج و زیات سے بہرہ یاب ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں شیخ احمد بن
محمد سعید، ان کے والد شیخ محمد سعید صقر، مفتی تکر شیخ عبدالملک اور شیخ ابراہیم شامی
ذہیری سے حدیث کا درس لیا اور قرأت و تجوید سیکھی۔ سات سال ارضِ حجاز میں
رہے۔ ۱۱۹۶ھ کو ہندوستان تشریف لائے اور فرخ آباد میں سکونت اختیار کی۔
۱۲۲۲ھ کو فرخ آباد میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، جس کا نام "فخر المیران و
ربع المفاخر" رکھا۔ اس میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بے شمار علما و طلبا
کو مستفید فرمایا۔ ۲۹۔ اگست ۱۸۰۵ء کو مفتی مقرر ہوئے۔ ۱۳۔ اکتوبر
۱۸۲۸ء تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

مفتی ولی اللہ فرخ آبادی بہت بڑے مفتی اور فقیہ ہونے کے علاوہ ممتاز
مصنف تھے۔ انہوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:-

- ۱۔ شرح ورد التقرب۔
- ۲۔ حزب التوسل الی مستی الانیاء والرسول۔
- ۳۔ نظم الجواہر۔
- ۴۔ نضد الفرائد۔
- ۵۔ قرآن مجید کی تفسیر جو فارسی زبان میں ہے اور تین ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔ یہ
تفسیر انہوں نے ۱۲۳۶ھ میں لکھی۔

- ۶۔ تاریخ فرخ آباد :- یہ ایک جلد میں ہے اور فارسی زبان میں ہے۔
 ۷۔ المطر الشجاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج صحیح مسلم کی شرح۔
 سید مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے ۵۔ رجب ۱۲۳۹ھ (۱۸۱۸)۔ نمبر
 ۱۸۳۲ع) کو وفات پائی۔ سوموار کا دن تھا۔^{۱۹}

۱۲۶۔ مولانا ولی اللہ فرنگی محلی

مولانا ولی اللہ بن حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی، ممتاز و مشہور
 اساتذہ میں سے تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ گھر میں علم و عرفان
 کا دریا رواں تھا۔ اپنے والد ملا حبیب اللہ انصاری اور عم محترم ملا محمد حسین انصاری
 سے تحصیل کی اور طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر خود غلغلہ درس
 بلند کیا اور نہایت محنت و مستعدی سے پڑھانے لگے۔ اپنے زمانے میں لکھنؤ کی
 ریاست علمیہ کے مالک تھے۔

تصنیف و تالیف اور تشریح و تعلیقات کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان
 کی تصنیفات اور شروح و حواشی میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :

- ۱۔ معدن الجواہر : قرآن مجید کی تفسیر۔
- ۲۔ نفائس الملکوت شرح مسلم الثبوت : اصول فقہ سے متعلق۔
- ۳۔ حاشیہ علی ہدایۃ الفقہ :
- ۴۔ حاشیہ بر عروۃ الوثقی : علم کلام کے بارے میں (از علامہ کمال الدین)
- ۵۔ حاشیہ بر شرح ہدایۃ الحکمت : از شیرازی، حکمت و فلسفہ کے متعلق۔
- ۶۔ تکملہ شرح سلم : از ملا حسن
- ۷۔ غایۃ العلوم و معارج الفہوم : اس کتاب کی بسیط شرح قلم بند کی۔

^{۱۹} تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۶، ۵۲۷۔

طریق الحنفیہ، ص ۲۷۱ !

- ۸ - حاشیہ بر تذکرۃ المیزان -
- ۹ - حاشیہ بر میرزا اہد سلال جلال -
- ۱۰ - حاشیہ بر میرزا اہد شرح المواقف -
- ۱۱ - رسالہ فی بحث التثکبک -
- ۱۲ - کشف الاسرار فی خصائص سید الامرار -
- ۱۳ - مرآة المؤمنین -
- ۱۴ - تنبیہ الغافلین فی مناقب آل سید المرسلین -
- ۱۵ - آداب السلاطین -
- ۱۶ - عمدۃ الوسائل -
- ۱۷ - الاغصان الاربعہ -

فرنگی محل لکھنؤ کے اس عالم و فقیہ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں اور کئی
اہم کتب درسیہ پر حواشی و تعلیقات قلم بند کیں۔
مولانا ولی اللہ انصاری فرنگی محلی نے ۱۰ صفر ۱۲۷۰ھ کو اٹھاسی سال
کی عمر میں وفات پائی۔

۱۲۷ — مولانا ولی اللہ سورتی

ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ایک شہر سورت ہے، جس کے علما و صلحا
اور فقہا و متکلمین کا تذکرہ فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں متعدد مقامات پر
کیا جا چکا ہے۔ ان میں تیرھویں صدی ہجری کے ایک عالم و فقیہ مولانا ولی اللہ
سورتی تھے، جو غلام محمد سورتی کے فرزند نام دار تھے اور جن کا شمار اپنے دور کے

۱۲۷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۲، ۲۵۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۲۸، ۵۲۷۔
تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۹۷ تا ۲۰۰، ۷

مشاہیر فضلاء میں ہوتا تھا۔

ولی اللہ کی ولادت و تربیت گجرات میں ہوئی۔ پھر جب ان کے والد مولانا غلام محمد گجرات سے برہان پور گئے اور وہاں کی مسند تدریس پر فائز ہوئے تو بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے۔ لائق بیٹیاں تک برس تک باپ سے علم حاصل کرتا رہا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سوائے حرم مقدس روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مدینہ منورہ میں شیخ ابوالحسن سندھی درس حدیث دیتے تھے اور عرب و عجم کے بے شمار علما و طلباء ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ ولی اللہ سورتی بھی ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے، ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور کبار علما اور نامور مشائخ میں گروانے گئے۔ ان کے والد مولانا غلام محمد نے ۱۱۴۹ھ میں وفات پائی تو بیٹے نے قصد وطن کیا اور سورت میں سکونت اختیار کی۔ پھر تمام عمر سورت ہی میں رہے اور درس و افتادہ کو اپنا مشغلہ قرار دیا رکھا۔ خلق کثیر تھے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا ولی اللہ سورتی کے شب و روز تدریس میں گزرتے تھے، تصنیف کے لیے وقت نہ ملتا تھا۔ انھوں نے ایک ہی کتاب تصنیف کی جس کا نام التنبیہات النبویہ فی سلوک الطریقیۃ النبویہ ہے۔ اس کتاب میں زہد و آداب اور اس سے ملتے جلتے ابواب جمع کر دیے ہیں، جن میں مشکوٰۃ، قاضی عیاض کی الشفا اور امام ابن حجر قسطلانی کی المواہب اللدنیہ کا ملخص پیش کیا گیا ہے۔ سورت کے اس عالم و فقیہ اور نامور مدرس نے ۱۱۷۰ھ جمادی الاولیٰ، ۱۲۰ھ کو اس دنیائے فانی سے منہ موڑا۔ اور عالم جادو دانی کی راہ لی۔ انھوں نے سورت میں وفات پائی اور وہیں محلہ سید پور میں دفن کیے گئے۔

۲۱ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۵۲ — نزہۃ الخواطر،

ج ۱، ص ۵۲۸

۱۲۸ — حافظ ولی اللہ لاہوری

پاکستان کا شہر لاہور ہر عہد میں علم و علما کا مرکز اور فقہاء و صلحا کا مسکن رہا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں یہاں جو اصحاب فضل اور ارباب کمال پیدا ہوئے، ان میں ایک بزرگ حافظ ولی اللہ لاہوری تھے۔ آپ شیخ و فاضل اور بہت بڑے فقیہ تھے۔ ان کے اساتذہ میں جو جلیل القدر عالم شامل ہیں، ان میں مولانا غلام رسول (قلم مہیا سنگھ) مولانا نور احمد کوٹلوی اور مولانا نور احمد بگڑی کے سہائے گرامی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔

حافظ ولی اللہ لاہوری نہایت ذہین و فطین، قوی الحافظہ اور سریح الادراک عالم تھے۔ مخالفین اسلام سے مناظرہ و مباحثہ میں انتہائی تیز تھے۔ بہت موثر و عظیم کہتے تھے، تقریر کرتے تو ان کی باتیں سامعین کے دل میں اُترتی جاتیں۔ عیسائی پادریوں کو اڑے ہاتھوں لیتے، بہ درجہ غایت شدت سے اسلام کی حمایت کرتے اور مضبوط دلائل سے پادریوں کے جملوں کا جواب دیتے۔ اس سلسلے میں بے حد جبری اور غیور تھے۔

متحدہ کتابیں تصنیف کیں، جن میں چند کتابوں کے نام یہ ہیں :-

۱۔ صیانة الاسلام عن وسوسة الشيطان۔

۲۔ الابحاث الضرورية۔

۳۔ المباحثۃ الدینیہ۔

لاہور اور قریب و جوار کے لوگ مسائل دینیہ میں ان سے رجوع کرتے اور ان کے فتوے کو لائق اعتنا ٹھہراتے۔

لاہور کے اس جید عالم و واعظ اور نامور فقیہ و مفتی نے ۲۴ جمادی الاولیٰ

۱۲۹۶ھ کو جمعۃ المبارک کے دن بہ عارضہ اسہال و فاق پائی ۹۲

۹۲ حدائق الحنفیہ ص ۴۹۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۵۲۹

ی

۱۲۹۔ مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی

عظیم آباد (پٹنہ) کے متعدد علماء و فقہاء کے حالات و سوانح ”فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری“ کی جلد دوم کے مقدمے میں بیان ہو چکے ہیں۔ زیر تصنیف کتاب کے بھی گزشتہ صفحات میں بعض بزرگوں کے احوال و کوائف معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

ان حضراتِ عالی مقام میں ایک عالم دین مولانا یحییٰ علی تھے، جن کے والد کا نام الہی بخش اور دادا کا ہدایت علی جوہری تھا۔ یہ حضرات عظیم آباد کے محلہ صاویق پور میں سکونت پذیر تھے، اس لیے ”صاویق پوری“ کی نسبت سے مشہور تھے۔ یہ محلہ کئی علمی خاندانوں کا مرکز اور اصحابِ فضل کا مسکن تھا۔

مولانا یحییٰ علی اسی محلے میں ۱۲۳۷ھ کو پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ عظیم آبادی اور مولانا ولایت علی سے اکتسابِ علم کیا۔ تصوف و سلوک سے گہرا لگاؤ تھا، بیہیض بھی۔ مولانا ولایت علی سے حاصل کیا اور انہی سے سندِ حدیث لی۔ پھر بہت بڑے عالم، محدث و فقیہ اور شیخ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ درس و تدریس اور ذکر و تذکیر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ حدیث و فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں یدِ طولی رکھتے تھے، مسائلِ دینیہ کے استخراج و استنباط میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا، معاملات و وراثت کے تمام گوشوں میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔

ان کے اُستاد و شیخ مولانا ولایت علی عظیم آبادی جہاد کے لیے سرحد گئے تو یہ عظیم المرتبت عالم ان کے ہم رکاب تھے اور سلسلہ جہاد میں استاد کے معاون و مددگار تھے۔ اس کے بعد جب سرحد سے وطن واپس آئے تو پھر تدریس و تبحر

میں مشغول ہو گئے اور ایک عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں شوال ۱۲۶۵ھ (ستمبر ۱۸۴۹ء) کو مولانا ولایت علی جب آخری مرتبہ مستقل طور پر وطن سے ہجرت کر کے سرحد کو روانہ ہوئے تو بھی مولانا سچھی علی ان کے ہم عنان تھے۔ جب ۲۲۔ محرم ۱۲۶۹ھ (۵۔ نومبر ۱۸۵۲ء) کو مولانا ولایت علی مرکز مجاہدین ستھانہ میں وفات پا گئے تو مولانا سچھی علی واپس وطن تشریف لے آئے اور حسب معمول سابق اپنے شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں درس و تدریس اور ذکر و تذکیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ طویل عرصے تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اس کے بعد برصغیر کے سیاسی حالات نے ایسی کر دٹی کہ انگریزی حکومت نے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۲ء) میں ملک کے مختلف مقامات سے گیارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا اور ان سب کو انبالہ جیل میں بھیج دیا۔ اسے ”وہابیوں کا پہلا مقدمہ بغاوت“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کی تمام کارروائی انبالہ جیل میں ہوئی۔ اس مقدمے کی ضروری تفصیلات ”فقہائے پاک و ہند تیرھویں صدی ہجری“ کی دوسری جلد میں بیان کی جا چکی ہیں۔

انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے ان مجرموں میں مولانا سچھی علی عظیم آبادی بھی شامل تھے، جنہیں ۲۶۔ رمضان ۱۲۸۰ھ (۵۔ مارچ ۱۸۶۶ء) کو گرفتار کر کے بذریعہ ریل گاڑی انبالہ بھیجا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر بائیس برس کی تھی اور مجاہدین سرحد کے خادموں اور معاونوں کی فہرست میں ان کا نام ”حی الدین“ تھا۔

جن لوگوں پر مقدمہ بغاوت قائم کیا گیا تھا، وہ سب اپنی اپنی جگہ معزز اور خوش حال لوگ تھے، لیکن انہیں انتہائی اذیت ناک صورت حال سے دوچار کیا گیا۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر کے انہیں جھکڑیاں اور لوہے کے طوق پہنائے گئے، کھانے کو ایسی روٹیاں دی گئیں جن میں چوتھا حصہ ریت اور مٹی شامل تھی، ان

میں سے بعض کو علیحدہ علیحدہ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں رکھا گیا۔
مقدمے کی ابتدائی کارروائی انبار کے ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی کی عدالت میں
ہوئی جو ایک ہفتہ جاری رہی۔ اس اثنا میں الزامات کی نوعیت، گواہوں
کی ترتیب اور شہادتوں کی تفصیل مرتب کی گئی۔ پھر تمام ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا
گیا اور سیشن عدالت میں باقاعدہ مقدمے کا آغاز ہوا۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملزم پہلے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں
پیش ہوئے تو دوران مقدمہ میں نماز کا وقت ہو گیا، نماز کے لیے اجازت طلب
کی گئی تو نہ ملی۔ پھر معمول پر رہا کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو ملزم تیمم کر کے اور
بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لیتے۔ مقدمے کی سماعت جتنے دن ڈپٹی کمشنر
کی عدالت میں جاری رہی، تمام ملزم الگ الگ پھانسیوں کی کوٹھڑیوں میں بند رہے۔
جب مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو سب کو محالات میں یک جا کر دیا گیا۔ یہ ماحول
بہت حد تک سازگار تھا اور تمام دوست اکٹھے رہتے تھے۔ اس لیے تکلیفوں اور
اذیتوں کا احساس تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

مولانا یحییٰ علی انتہائی صابر و صائب شخص تھے۔ ابتلا و آزمائش کے دہانے میں
وہ عام طور پر عربی کی یہ رباعی پڑھتے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس
کی رضا پر راضی رہتے۔

لَسْتُ أَبَالِي حِينُ أُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلَيَّ شِقِّ حَيَّانٍ لِلَّهِ مَصْرُوعِي
وَذَلِكَ فِي ذَاتِ الْإِلَهِ وَإِنْ لَيْشَأُ مِبَارِكٌ عَلَيَّ أَوْ صَالٍ شَوْحَسْرُوعِ

یعنی جب میں مسلمان مارا جاؤں تو مجھے کچھ پروا نہیں کہ اللہ کی طرف میرا
لوٹنا اگرچہ کسی بھی طرح سے ہو۔

یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، وہ چاہے تو بوسیدہ ہڈیوں اور تمام اعضائے جسم
میں برکت اور بالیدگی پیدا کر دے۔

عدالت نے ۲۔ مئی ۱۸۶۴ء کو مقدمے کا فیصلہ سنایا مولانا یحییٰ علی کھیے

سزائے موت اور لاش جیل کے قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ ہوا نیز حکم دیا گیا کہ ان کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔ بعد میں سزائے موت کو جس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ یہ فیصلہ ۲۲ اگست ۱۸۶۳ء کو صادر ہوا جس کی طالع اٹھیں ۱۶ ستمبر ۱۸۶۳ء کو ملی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ موت کی سزائیں ملازموں کو سنائی گئی تھی اور وہ تھے: (۱) مولانا بیچلی علی (۲) مولانا محمد جعفر تھانوی اور (۳) شیخ محمد شفیع۔! سزائیں کر شیخ محمد شفیع تو بہت معنوم ہوئے، البتہ دوسرے دونوں بزرگ انتہائی خوش تھے۔ انگریز پولیس کپتان نے مولانا محمد جعفر سے خوشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ شہادت کی امید پر خوش ہیں، جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، تم اس کو کیا جانو!

اس کے بعد ان کی سزائے موت ختم کر دی گئی کہ ملازم اس سے خوشی محسوس کرتے تھے اور ان کو خوش کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اس کے بجائے جس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی کہ موت کے مقابلے میں یہ سزا زیادہ تلخ اور اذیت ناک ہوگی۔

جن لوگوں کو پھانسی کی سزا ختم کر کے جس دوام کی سزا دی گئی تھی، ان کے سرور ڈاڑھی مونچھ مونڈ دیے گئے تھے۔ مولانا بیچلی علی ڈاڑھی کے کٹے ہوئے بال ہاتھ میں اٹھاتے پھرتے اور کہتے:

”افسوس نہ کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی خاطر کاٹی گئی ہے“

بغادت کے گیارہ ملازموں میں سے چار کو، جن میں مولانا بیچلی علی شامل تھے، کالا پانی بھیجا گیا۔ مولانا کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر انبالہ سے پیدل لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرت سر کے راستے لاہور لایا گیا اور کچھ عرصہ لاہور سنٹرل جیل میں

رکھا گیا۔ اس کے بعد ریل گاڑی کے ذریعے ملتان اور وہاں سے کشتی میں سوار کر کے کوٹری پہنچا یا گیا۔ کوٹری سے کراچی اور کراچی سے یادبانی جہاز سے بمبئی پہنچے۔ ۸۔ دسمبر ۱۸۶۵ء کو بمبئی سے جمنا جہاز میں سوار ہوئے اور چونتیس دن کے بعد ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو پورٹ بلیر (جزائر انڈمان) میں اترے۔

مولانا یحییٰ علی کی جائداد نیلام کر دی گئی تھی۔ یہ لاکھوں کی جائداد تھی جو انگریزی حکومت نے کوٹریوں میں فروخت کی۔ غیر منقولہ جائداد صرف دو ہزار ساٹھ روپے چار آنے میں اور منقولہ جائداد چھ سو پینتالیس روپے میں نیلام ہوئی۔ انبالہ وہابی سازش کیس سے تقریباً ایک سال بعد عظیم آباد کا پہلا مقدمہ بغاوت شروع ہوا۔ اس میں جو حضرات گرفتار ہوئے ان میں مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ بھی شامل تھے۔ ان کا فیصلہ ۲۹۔ رمضان ۱۲۸۱ھ (۲۷۔ فروری ۱۸۶۵ء) کو ہوا۔ پہلے ضبطی جائداد اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھر اسے جس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ ان کو مولانا یحییٰ علی سے پہلے ۱۵۔ جون ۱۸۶۵ء کو پورٹ بلیر (جزائر انڈمان) پہنچا دیا گیا تھا۔ جو لوگ اعانت مجاہدین کے جرم میں ماخوذ تھے، ان میں کالا پانی پہنچنے والے مولانا احمد اللہ اولین بزرگ تھے۔

اس زمانے میں انڈمان (کالا پانی) میں ایک شخص سید اکبر زمان اکبر آبادی چیف کمشنر انڈمان کے میرمنشی تھے، جنہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی بنا پر بیس سال قید کی سزا ہوئی تھی اور انڈمان بھیج دیے گئے تھے۔ یہ نہایت شریف آدمی تھے اور وہابی مقدمات کے تمام لوگوں کی انتہائی عزت کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے یہ ہندوستان میں قلعہ آگرہ کے محکمہ فوج میں میرمنشی تھے۔ کالا پانی پہنچنے کے بعد بھی انہیں میرمنشی مقرر کیا گیا۔ قید کی مدت پوری ہونے کے بعد ۱۹۰۴ء میں آگرہ آئے اور وہیں وفات پائی۔

مولانا احمد اللہ جب کالے پانی پہنچے تو سید اکبر زمان نے چیف کمشنر سے

بات کی اور اس کی اجازت سے انہیں اپنے گھر لے گئے جو وہاں کے ایک جزیرے
 ”روس آئی لینڈ“ میں تھا۔ پھر اپنے قریب ہی ان کے لیے ایک الگ مکان کا
 انتظام کر دیا اور چیت کشن کی کچری میں اپنے ماتحت لکھنے پڑھنے کا کام ان کو دلا
 دیا۔ مولانا احمد اللہ کے بعد ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا سیدی علی اٹمان پنیچے
 توسید اکبر زمان نے انہیں بھی اپنے پاس ہی جزیرہ روس آئی لینڈ میں ٹھہرایا اس
 طرح مولانا احمد اللہ اور مولانا سیدی علی دونوں بھائی ایک ہی جگہ رہنے لگے۔
 تبلیغ دین، اشاعت اسلام اور اصلاح عوام میں دونوں بھائی کوشاں رہتے۔
 فرصت کے اوقات میں لوگوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے اور
 اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے۔ دونوں نہایت صابر و شاکر
 بزرگ تھے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، سزا کے بعد عظیم آباد میں ان کی تمام جائیداد ضبط
 کر دی گئی تھی، مکانات خالی کر لیے گئے تھے، عورتوں اور بچوں کو گھروں سے نکال
 دیا گیا تھا۔ سب مال و اسباب، کتابیں اور مستودے ضبط کر لیے گئے تھے جن مکانوں
 میں یہ لوگ کئی پشتوں سے سکونت پذیر تھے، انہیں مسمار کر دیا گیا تھا خاندانی قبرستان
 بھی کھدوا دیا گیا تھا اور مردوں کی ہڈیاں قبروں سے نکلوا کر باہر پھینک دی
 گئی تھیں۔

یہ انتہائی وحشت ناک اذیتیں اور مصیبتیں تھیں جو ان پاک باز حضرات کو
 پہنچانی گئیں۔ یہ عظیم قربانیاں محض سیاست کے لیے نہ تھیں، یہ تقاضائے فرض
 تھا اور اس کا مقصد فقط اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رضامندی
 اور خوشنودی تھا۔ کوئی دنیوی مفاد اس میں ہرگز نہ تھا، بلکہ دنیوی نقطہ نظر سے
 یہ سراسر نقصان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مصائب و آلام کو انہوں نے نہایت
 تحمل سے برداشت کیا کیونکہ حروف شکایت زبان پر نہیں لائے۔

مولانا سیدی علی کو گھر میں پیش آنے والے حوادث کا علم ہوا تو کالے پانی سے

اہلبیہ محترمہ کو ایک خط تحریر فرمایا جو لائق مطالعہ ہے لکھتے ہیں :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بچی علی کی طرف سے بخدمت ام حبیبہ، ام محمد یوسف سلمہا اللہ تعالیٰ -

ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نور چشم محمد حسن مد عمرہ کے، حال انہدام دونوں مکاؤں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا، اور صدمہ بہت گزرا۔ کیونکہ سکونتِ قدیم سے، خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو، اور کاروبارِ فریضہ بہت انجام پائے ہوں، مومنین کو، انس و محبت بطور اہل و عیال کے ہوتی ہے۔

اسی روز شب کو روح النور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تبسم کناں فرمانے لگے کہ البتہ انہدام سے مکاؤں کے، مالکان کو، خصوصاً نسواں کو رنج و الم بہت ہوا ہے، اور ہونے کی جگہ ہے اور ان آیات کریمہ کو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا :

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۙ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمْ مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ط اُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۙ وَهُمُ الْمُهْتَدُونَ ۙ

۳۔ یہ سورہ بقرہ کی آیات نمبر ۱۵۵ تا ۱۵۷ ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے : اور جو لوگ صبر کرنے والے ہیں، انہیں کامیابی کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی ان پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو ان کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے : اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۙ (کہ ہم تو مال و اولاد سمیت اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب دنیا سے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جانے والے ہیں، سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں، جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم کی بارش ہوتی رہتی ہے، اور وہی انس کی رحمت کے حق دار ہیں اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں۔

رَبَّنَا أفرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَقَّنَا مُسْلِمِينَ ۝
 عَسَى رَبُّنَا أَنْ يُبَدِّلَنَا خَيْرًا مِنْهَا إِنَّا إِلَى رَبِّنَا
 رَاغِبُونَ ۝

اور فرمایا ان آیات کو دروزین رکھو۔ عبادت خانے اور مسجدِ اقصیٰ اور مکاناتِ
 انبیا علیہم السلام بخت اور جلوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم
 کرنے والے نیا بنیا ہو گئے اور یہ اماکن متبرکہ از سر نو بنا ہوئے اور پہلے سے
 زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسی ہی امید رکھو۔ اللہ تعالیٰ
 کا شکر ادا کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔
 بعد اس مکاشفہ کے میں نے بہت الشرح و تفسیر پایا اور اپنے بڑے بھائی
 (مولانا احمد اللہ صاحب) کو آگاہ کیا۔

دربائے عشقِ خالق ہر دو جہاں میں ہم
 نام و نشان دارِ فنا کے ڈبا چکے

کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ
 جوگی ہوئے ہیں محرمِ اسرار کے لیے

اے فدائے من فدایت جانِ من
 جملہ فرزندانِ و خاندانِ من

۱۱۶۔ یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۱۶ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ہمارے پروردگار۔ ابھی صبر کی نعمت سے شاد کام
 ڈھا، اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دنیا سے اٹھا۔

۱۱۷۔ یہ سورہ نمل کی آیت نمبر ۳۲ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ
 دے۔ ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

۱۱۸۔ اقباس از مکتوب مولانا یحییٰ علی جوہر ۲۱۔ مجاہدی الاولیٰ ۲۸۳ کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

کالے پانی پہنچنے کے تقریباً دو سال بعد مولانا یحییٰ علی بیمار ہوئے اور قانون کے مطابق ہسپتال میں ڈاکٹری علاج ہونے لگا۔ مولانا عبدالرحیم (جو ان کے بھانجے تھے اور انڈمان میں قید تھے) حکام بالا کی اجازت سے کچھ دیر اپنا کام کرتے اور کچھ دیر مولانا کی خدمت میں رہتے۔

بیماری کے دنوں میں مولانا یحییٰ علی کا یہ معمول رہا کہ جو لوگ عیادت کے لیے آتے، انہیں نیک نصیحت فرماتے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ زندگی کے آخری لمحے تک انجام دیتے رہتے۔

مرض اگرچہ زیادہ شدید نہ تھا تاہم تکلیف ضرور تھی۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ دن میں دو مرتبہ مزاج پرسی کے لیے ہسپتال تشریف لاتے۔ ۲۶ شوال ۱۲۸۲ھ کو طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی تو مولانا احمد اللہ کو بھی بلا لیا گیا اور مولانا عبدالرحیم بھی آگے۔ زبان پر اللہ کا ذکر جاری تھا اور ہوش بجاتے کہ اسی دن یعنی ۲۶ شوال ۱۲۸۲ھ (۲۰ فروری ۱۸۶۸ء) کو روحِ قفسِ عنبری سے پرواز کر گئی، اوّل قیدِ فرنگ اور قیدِ حیات دونوں سے نجات پائی۔ کالا پانی پہنچنے کے بعد دو سال ایک مہینہ اور نو دن زندہ رہے۔

وفات ہسپتال میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد میت کو گھر لے جایا گیا۔ سید اکبر زمان نے چیف کشر سے اجازت لے کر تمام جزیروں میں اعلان کرا دیا تھا کہ جو لوگ تکفین و تدفین اور نمازِ جنازہ میں شامل ہونا چاہیں، ان کے مکان پر پہنچ جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی مقررہ مقام اور متعین وقت پر پہنچ گئے۔ پانچ ہزار کے قریب لوگ اس مردِ مجاہد اور عالمِ جلیل کی خبر وفات سُن کر ان کے گھر پہنچے۔ نمازِ جنازہ کئی مرتبہ پڑھی گئی اور اس پیکرِ عزیزیت و استقلال کو انڈمان کے جزیرہ روس آئی لینڈ میں دفن کر دیا گیا۔

دبقیہ ماشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) یک شنبہ کے روز انڈمان سے اپنی اہلیہ محترمہ کے نام ارسال فرمایا۔ بحوالہ علمائے ہندکاشان دارماضی، ج ۳، ص ۱۵۶ تا ۱۵۸۔

مولوی کبیر احمد پھلواری نے مندرجہ ذیل اشعار میں تاریخ وفات کہی -
 چونکہ یحییٰ علی ستودہ خصال
 عالم و زاہد و محدث بود
 روح پاکش گزاشت مجلس تن
 راہ ملک وصال حق پیود
 گشت راضی خدائے پاک ازو
 عزتیش پیش قدسیاں افزود
 ہائے سال او ز روئے الم
 رضی اللہ ربہ فرمود

۱۲۸۴ھ

۱۳۰۔ مفتی یعقوب علی سندیلوی

صوبہ یوپی کے شہر سندیلہ کی سرزمین سے متعدد اہل کمال نے جنم لیا، جن میں ایک لائق احترام شخصیت مولانا یعقوب علی عثمانی گویا موی کی ہے۔ ان کے والد فضل علی اور دادا رحم علی تھے۔ عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، لہذا یعقوب علی عثمانی کہلائے۔ مفتی اور عابد و زاہد علماء میں گردانے جاتے تھے۔

مفتی یعقوب علی عثمانی ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو اپنے علاقے کے اہل علم سے حصول علم کا آغاز کیا۔ پھر مدراس گئے، وہاں مولانا تراب علی خیر آبادی، شیخ حسن علی باہلی اور قاضی ارتضیٰ علی گویا موی سے تحصیل کی۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو جنوبی ہند میں مالا بار کے مفتی مقرر کیے گئے۔ فقہ و کلام پر عبور حاصل تھا، اس لیے کچھ مدت بعد مچھلی بندر کے منصب تضا پر فائز ہوئے۔ پھر راجمندی کی صدارت کا عہدہ پایا۔ یہ تمام خدمات انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے انجام دیں اور طویل عرصے تک ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے منصب پر متمکن رہے۔

پھر حرمین شریفین کا عزم کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ واپس وطن تشریف لائے تو تمام علاقے سے منقطع ہو کر راجمندی میں سکونت اختیار کر لی۔ اب لوگوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور بالکل گوشہ گیر تھے۔ راجمندی

ہی میں ۲۰ — رمضان ۱۲۸۳ھ کو انتقال ہوا، تہتر سال کی عمر پائی ہے۔

۱۳۱ — مولانا یعقوب دسنوی

سندوستان کے صوبہ بہار میں ایک مقام ”دسنہ“ ہے جس کی خاک سے بہت ارباب فضل اور اصحاب کمال ابھرے اور آسمان شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ یہ وہ مقام ہے جسے چودھویں صدی ہجری کی نامور و ممتاز شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سید صاحب اپنے اوصاف گوناگوں کی بنا پر نہ صرف برصغیر میں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں مشہور ہوئے اور اپنی بوقلموں خدمات علمی کی وجہ سے ہر حلقے میں لائق اعزاز و اکرام قرار پائے۔

تیرھویں صدی ہجری میں دسنہ کے چھوٹے سے گاؤں میں ایک عالم مولانا یعقوب کی ولادت ہوئی جن کو اپنے عہد کے فحول علما میں شمار کیا گیا اور فقہ و اصول اور علوم ریاضیہ میں جن کی مہارت گالوہا مانا گیا۔

مولانا یعقوب دسنوی نے مختصرات کی تکمیل اپنے گروپیش کے اساتذہ سے کی۔ پھر مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری کی خدمت میں گئے اور ان سے علوم و رسبہ کی کتابیں پڑھیں۔

سند فراغ کے بعد صوبہ بہار ہی کے ایک مشہور شہر مونگیر کا قصد کیا اور وہاں درس و افادہ کی مسند بچھائی۔ ایک مدت تک مونگیر میں رہے اور بہت سے علماء طلبا کو زیور علم سے آراستہ کیا۔ پھر ان کی خدمات شہر بہار کے انگریزی مدرسے کے لیے حاصل کر لی گئیں۔

اس عالم و فقیہ نے ۱۲۸۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۵۳۳۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۵، ۲۵۶۔

۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۵۳۴۔

۱۳۲ — قاضی یوسف شاہ جہان پوری

قاضی یوسف بن ابوالوسف افغانی شاہ جہان پوری، اپنے عصر کے مشاہیر علمائے سے تھے۔ بہت بڑے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ شاہ جہان پور (پٹی) میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اس زمانے میں بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلّی شاہ جہان پور میں قیام پذیر تھے اور وہاں ان کا سلسلہ تدریس جاری تھا، قاضی یوسف نے ان کے مدرسے میں داخلہ لیا اور ان سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر ایک شہر بہار کا رخ کیا اور وہاں کے اساتذہ سے تکمیل علم کی شادی بھی اسی علاقے میں ہوئی۔

فراغت کے بعد مدرس گئے، وہاں کچھ عرصہ والی مدرّس والا جاہ کے دربار میں رہے۔

پھر حیدرآباد (دکن) کا رخ کیا اور ۱۲۰۸ھ میں حیدرآباد کے عہدہ تضا پر متمکن ہوئے۔ حیدرآباد میں یہ نظام الملک نظام علی خاں کا دور حکومت تھا۔ وہ ان کے علوم و فضل سے بہت متاثر ہوا، اور انھیں ”شرعیات اللہ خان بہادر“ کے لقب سے منفق کیا۔ قاضی یوسف شاہ جہان پوری کا زیادہ تر وقت درس و افادہ طلباء میں صرف ہوتا تھا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔

اس جید عالم اور فقیہ نام دار کی وفات ۱۲۲۰ھ میں ہوئی۔

۱۳۳ — سید یوسف بیجا پوری

سید یوسف بن عبداللہ بن محمد درویش حسینی بیجا پوری، علمائے صالحین میں سے تھے۔ نامور شیخ اور فقیہ تھے۔ مفتی عبدالقوی حیدرآبادی کے شاگرد تھے۔ علوم سے

فراغت کے بعد سوتے حرم روانہ ہوتے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔
طویل عرصے تک ارضِ حجاز میں سکونت اختیار کیے رکھی۔ ہندوستان واپس آئے
تو حیدرآباد (دکن) میں اقامت گزری ہوتے اور وہاں حدیث و فقہ کے درس کا
سلسلہ شروع کیا جو عمر بھر جاری رہا۔

اس عالم و فقیہ نے ۳ صفر ۱۲۱۹ھ کو حیدرآباد میں انتقال کیا اور وہیں
دفن کیے گئے۔

صاوق علی خوش زوئیس۔ لاہور

مراجع و مصادر

- اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔
- ۱۔ آثار الاول من علمائے فرنگی محل، عبدالباری فرنگی محل۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔
 - ۲۔ آثار الصنادید، سر سید احمد خاں۔ ترتیب و حاشی، ڈاکٹر معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی ۱۹۶۶ء
 - ۳۔ ابجد العلوم، نواب محمد صدیق حسن خاں۔ مکتبہ قدوسیہ۔ لاہور ۱۹۸۳ء
 - ۴۔ اتحاف النبلا، نواب محمد صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور۔ ۱۲۸۸ھ
 - ۵۔ احوال علمائے فرنگی محل، شیخ الطاف الرحمن۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔
 - ۶۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، انتظام اللہ شہبانی۔ طبع دہلی ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء
 - ۷۔ بوستانِ اختیار، سعید احمد مارہروی۔ طبع آگرہ۔ ۱۳۳۱ھ
 - ۸۔ پنجابی ادب دی کہانی، عبد الغفور قریشی۔ طبع لاہور
 - ۹۔ پنجابی شاعراں دا تذکرہ، مولانا بخش کشتہ۔ پاکستان پرنٹنگ پریس، لاہور۔ ۱۹۶۰ء
 - ۱۰۔ تاریخ اہل حدیث، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی۔ اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور۔ ۱۹۵۳ء
 - ۱۱۔ تاریخ اولیائے دہلی، احمد سعید دہلوی۔ محبوب المطالع برقی پریس، دہلی۔ ۱۹۵۴ء
 - ۱۲۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول، سید محبوب رضوی۔ ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند۔ ۱۹۷۷ء/۱۳۹۷ھ
 - ۱۳۔ تاریخ نظیر ازہند جون پور، سید اقبال احمد۔ شیرازہ ہند پبلشنگ ہاؤس۔ جون پور۔ ۱۹۶۳ء
 - ۱۴۔ تاریخ لاہور، کنھیالال۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۷۶ء
 - ۱۵۔ تاریخ مشائخِ چشت۔ خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۳ء
 - ۱۶۔ تاریخ التوائط، نواب عزیز جنگ بہادر۔ عزیز المطالع، حیدرآباد (دکن) ۱۹۵۳ء
 - ۱۷۔ تحقیقاتِ چشتی، نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی۔ لاہور۔ ۱۹۶۴ء

- ۱۸ - تذکرہ ، مولانا ابوالکلام آزاد - مکتبہ اجاب - لاہور
- ۱۹ - تذکرہ علمائے پنجاب ، اختر راہی - مکتبہ رحمانیہ ، لاہور - ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۱ء
- ۲۰ - تذکرۃ العلماء والمشاہد : محمد الدین فوق - گلزار اسٹیم پریس ، لاہور - ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء
- ۲۱ - تذکرہ علمائے فرنگی محل : محمد عنایت اللہ - طبع لکھنؤ - ۱۹۳۰ء
- ۲۲ - تذکرہ علمائے ہند : رحمان علی مطبع نول کشور - لکھنؤ - ۱۹۱۷ء
- ۲۳ - تذکرہ مشاہیر کاکوری ! محمد علی حیدر - مطبع اصح المطابع ، لکھنؤ - ۱۹۲۷ء
- ۲۴ - تراجم علمائے حدیث ہند : ابویحییٰ امام خان نوشہروی - جیڈ برقی پریس ، دہلی
۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۸ء
- ۲۵ - جماعت مجاہدین ، غلام رسول مہر - کتاب منزل - لاہور - ۱۹۵۵ء
- ۲۶ - حدائق الحنفیہ : مولوی فقیر محمد جلمی - مطبع نول کشور ، لکھنؤ - ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۶ء
- ۲۷ - حدیقتہ الاولیاء : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نول کشور ، لکھنؤ - ۱۸۷۷ء
- ۲۸ - الحیات بعد الممات : مولانا فضل حسین بہاری - مکتبہ سعودیہ - حدیث منزل ،
کراچی - ۱۹۵۹ء
- ۲۹ - حیات جاوید : مولانا الطاف حسین حالی - اکادمی پنجاب ، لاہور - ۱۹۵۷ء
- ۳۰ - حیات العلماء : سید عبدالباقی سہسوانی - مطبع نول کشور ، لکھنؤ -
۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۲ء
- ۳۱ - حیات ولی : مولانا رحیم بخش دہلوی - مکتبہ سلفیہ ، لاہور - ۱۹۵۵ء
- ۳۲ - خزینۃ الاصفیاء : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نامی گرامی موسوم بہ ٹرہند ،
لکھنؤ - ۱۲۹۰ھ
- ۳۳ - روضۃ الابرار : محمد الدین ، سراج المطابع ، جہلم - ۱۳۰۲ھ
- ۳۴ - سرگزشت مجاہدین : غلام رسول مہر ، کتاب منزل - لاہور - ۱۹۵۷ء
- ۳۵ - سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی ، از مولانا عبدالجبار غزنوی و مولانا غلام رسول
طبع - لاہور

- ۳۶ - سوانح مولوی غلام رسول : مولوی عبدالقادر، طبع لاہور۔
- ۳۷ - سوانح قاسمی : مولانا مناظر احسن گیلانی جلد اول - دہلی پرنٹنگ ورکنس دہلی۔
۱۳۵۴ھ
- ۳۸ - سوانح قاسمی : مولانا مناظر احسن گیلانی جلد دوم - الجمعیتہ برقی پریس، دہلی۔
۱۳۷۳ھ
- ۳۹ - سوانح قاسمی : مولانا مناظر احسن گیلانی جلد سوم - الجمعیتہ برقی پریس، دہلی۔
۱۳۷۳ھ
- ۴۰ - طرب الامثال بترجم الافاضل : مولانا عبدالرحمن لکھنوی - مطبع یوسفی، لکھنؤ۔
۶۱۹۲۱
- ۴۱ - علمائے ہند کا شان دار ماضی، مولانا محمد میاں، مکتبہ محمودیہ، لاہور۔
۱۳۹۷ھ / ۶۱۹۷۷
- ۴۲ - فقہائے پاک و ہند تیرہویں صدی ہجری، جلد اول - محمد اسحاق بھٹی - ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور - ۶۱۹۸۲
- ۴۳ - فقہائے پاک و ہند تیرہویں صدی ہجری، جلد دوم - محمد اسحاق بھٹی - ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور - ۶۱۹۸۲
- ۴۴ - قضاۃ الارب من ذکر علماء النحو والادب : ذوالفقار احمد - فیض طبع مفید عام -
آگرہ - ۱۳۱۶ھ
- ۴۵ - کمپنی کی حکومت : باری - نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور - طبع چہارم - ۶۱۹۶۹
- ۴۶ - مسلمانوں کا روشن مستقبل : سید طفیل احمد منگلوری علیگ - حماد الکتبی، شیش محل روڈ، لاہور۔
- ۴۷ - مکتوبات سرسید : مجلس ترقی ادب، لاہور - ۶۱۹۵۹
- ۴۸ - موج کوثر : شیخ محمد اکرام : ادارہ ثقافت اسلامیہ - طبع دہم -
۶۱۹۷۹

۴۹ - مولانا محمد احسن نانوتوی! محمد ایوب قادری - مکتبہ عثمانیہ پیر الہی بخش کالونی - کراچی

۶۱۹۶۶

۵۰ - نزہتہ الخواطر، جلد ۷ - سید عبدالحی حسنی - دائرۃ المعارف العثمانیہ -

حیدرآباد (دکن) ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۹ء

۵۱ - واقعات دارالحکومت دہلی: جلد دوم - بشیر الدین احمد دہلوی - شمسی مشین پریس

آگرہ - ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء

۵۲ - ایانہ الجنتی: محمد بن یحییٰ ترمذی - مطبع صدیقی پریس بریلی - ۱۲۸۷ھ

۵۳ - التاج المکمل: نواب سید صدیق حسن خان - طبع ثانی - ناشر، شرف الدین و اولادہ، بمبئی

۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء

۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء

۵۴ - تقویۃ الایمان از مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی (مقدمہ غلام رسول مہر) ناشر: اہل حدیث

اکادمی - لاہور -

۵۵ - ارواح ثلاثہ: مولانا اشرف علی تھانوی - اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور - ۱۹۷۶ء

۵۶ - تذکرہ شہید: محمد خالد سیف - مکتبہ غفر - نویہ - شیش محل روڈ - لاہور - ۱۹۸۳ء

۵۷ - حیات اسماعیل شہید: پیام شاہ جہان پوری - ادارہ تاریخ و تحقیق، چاہ میراں - لاہور ۱۹۷۳ء

۵۸ - کلام شاہ اسماعیل شہید: مرتب محمد خالد سیف - طارق اکیڈمی - فیصل آباد -

۵۹ - جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ڈاکٹر محمد ایوب قادری - پاک اکیڈمی، کراچی

۱۹۷۶ء

۶۰ - ہمارے ہندوستانی مسلمان: ڈاکٹر ہنر - اردو ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین - اقبال اکیڈمی،

لاہور - ۱۹۷۶ء

